بیسویں صدی میں
خواتین کا
اردو ادب
مرتبہ
ترنم ریاض

ترنم ریاض (ایم اے، ایم ایڈ) معروف افسانہ نگار اور شاعرہ ہیں۔ ان کے کئی افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے مجموعے 'یہ تنگ زمین' پر یوپی اردو اکادمی نے انھیں انعام سے نوازا ہے۔ انھوں نے بچوں کے لئے دوسری زبانوں میں لکھی گئی کتابوں کا ترجمہ بھی اردو میں کیا ہے۔

ترنم ریاض درس و تدریس اور الیکٹرونک میڈیا سے وابستہ ہیں۔

سرورق: اسلم بیگ

بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب

بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب

مرتبہ

ترنّم ریاض

ساہتیہ اکادمی

پہلا ایڈیشن 2004

ساہتیہ اکادمی

ہیڈ آفس :
رویندر بھون-35 فیروز شاہ روڈ، نئی دہلی 110001
سیلز آفس :
'سواتی'، مندر مارگ، نئی دہلی 110001
علاقائی دفاتر :
جیون تارا بھون، 23اے/44 ایکس، ڈائمنڈ ہاربر روڈ، کولکاتا 700053
172، ممبئی مراٹھی گرنتھ سنگھر الے مارگ، دادر، ممبئی 400014
سینٹرل کالج کیمپس، ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر ویدھی، بنگلور 560001
سی۔ آئی۔ ٹی۔ کیمپس، ٹی۔ ٹی۔ ٹی۔ آئی۔ پوسٹ، تارامنی، چینئی 600013

قیمت : 250 روپے

ISBN 81-260-1620-5

Website : http://www.sahitya-akademi.org

کمپیوٹر کمپوزنگ : محمد سالم 27/316 ترلوک پوری، دتی 110091

طباعت : آر۔ کے۔ آفسیٹ، نوین شاہدرہ دتی

فہرست

ابتدائیہ	ترنم ریاض	7

حصہ اوّل : نثر

نجمہ	نذر سجاد حیدر	47
فورسڈ لینڈنگ	حجاب امتیاز علی	71
دلّی کی سیر	رشید جہاں	97
گزاری ہیں خوشی کی چند گھڑیاں	صالحہ عابد حسین	102
زرد گلاب	رضیہ سجاد ظہیر	.117
چابڑے	عصمت چغتائی	126
ہاؤسنگ سوسائٹی	قرۃ العین حیدر	138
چاند بجھ گیا	سرلا دیوی	241
اُدو	جیلانی بانو	251
کاش	آمنہ ابوالحسن	258
سمجھوتہ	صغریٰ مہدی	287
اُترن	واجدہ تبسم	293
چُرایا ہوا سُکھ	ذکیہ مشہدی	304
ایکوریم	آشا پربھات	314
سنگین جرم	نگار عظیم	326
سوریہ ونشی چندرونشی	غزال ضیغم	331
شہر	ترنم ریاض	341

حصہ دوم : شاعرات

عنوان	شاعرہ	صفحہ
بیزاری	ادا جعفری	356
غزل		358
افتادگاہیں نجوم کی	شفیق فاطمہ شعریٰ	360
یہ زماں۔ یہ زماں	ساجدہ زیدی	370
غزل		373
تخریب کے بعد	زاہدہ زیدی	377
معمول	رفیعہ شبنم عابدی	381
غزل		383
یٹر لی اُمری	بلقیس ظفیر الحسن	385
غزل	رخسانہ جبیں	388
غزل		389
شعر شورانگیز	شہناز نبی	392
معصوم بھیڑیں		394
خسارہ	عذرا پروین	396
شرعی سرکس		398
نظمیں	شبنم عشائی	401
یا سمیع الدعا	ترنم ریاض	404

ترنم ریاض

ابتدائیہ

خواتین فطرتاً قصہ گو اور شاعرات ہوتی ہیں۔ اپنے بچوں کو اصلی یا فرضی قصے کہانیاں سنانا، شعروں کو لوریوں کی مدھم دھنوں میں سمو کر ڈھیرے ڈھیرے بچوں کو سنا کر سلانا، دنیا کی ہر عورت کا، خواہ وہ کسی بھی خطے سے تعلق رکھتی ہو، محبوب مشغلہ ہے۔ اس لحاظ سے ہر عورت کو ایک فطری کہانی کار یا شاعرہ تسلیم کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی لیے غالباً عورت کو 'ام القصص' بتایا گیا ہے۔

ہندوستان ایک کثیر اللسان اور متنوع ثقافتوں کا ملک ہے۔ ہر لسانی اور ثقافتی گروہ میں ایسی شاعرات پیدا ہوئی ہیں، جن کا کلام دیومالائی اور اساطیری شکل اختیار کر کے اس مخصوص ثقافت کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ میرا بائی کے بھجن اور گیت جو کرشن مراری کے تئیں ان کے والہانہ عشق کا نذرانہ ہیں نہ صرف شمال میں، بلکہ تقریباً پورے برصغیر کی ثقافت کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔ یہ بھجن اور گیت آج بھی بڑے ذوق و شوق کے ساتھ گائے جاتے ہیں۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ایسی شاعرات گزری ہیں جن کا کلام سماج کے مختلف طبقوں میں مقبول عام ہو کر، اس مخصوص تہذیبی اور ثقافتی ماحول کا ایک اہم حصہ بن چکا ہے۔ اس سلسلے میں کشمیری

زبان کی مقبول اور مشہور صوفی (کشمیری اصطلاح میں ریشی) شاعرہ لل ایشوری (جو لل دید یا لل عارفہ کے نام سے بھی مشہور ہیں) کا کلام آج بھی مقبول ہے۔ اسی طرح حبہ خاتون کی رومانی شاعری بھی کشمیری ادب اور ثقافت کا ایک اہم حصہ ہے۔

اردو زبان و ادب میں ادیباؤں کے کارنامے ایک پوری صدی پر محیط ہیں۔ اردو ادب کے اس سارے منظر نامے پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ادیباؤں نے اس منظر نامے کو اور بھی دلکش اور جاندار بنانے میں خاصہ رول ادا کیا ہے۔ گزشتہ ایک صدی میں خاتون ناول و افسانہ نگار، شاعرات، انشائیہ نگار، مزاح نگار حتیٰ کہ خاتون تنقید نگاروں نے اردو ادب کی بقا میں ایک اہم حصہ ادا کیا ہے۔ خاتون اردو ادیباؤں کی خدمات کے پیشِ نظر اور ان تحریروں کے موضوعات، زبان و بیان، مزاج اور ایک منفرد حسیّت (sensibility) کی بنا پر یہ تسلیم کرنے میں اعتراض نہیں ہونا چاہیے کہ یہ ادب ایک جداگانہ صورت اختیار کر چکا ہے۔ اس سارے سرمائے کو معقول دلائل کی بنا پر خواتین اردو ادب یا تانیثی اردو ادب کے زمرے میں بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔ اردو زبان کی مختلف اصناف میں اردو ادیباؤں کی گراں قدر خدمات کا جائزہ گو کہ وقت کی اہم ضرورت ہے، تاہم اس مطالعے میں صرف فکشن نگار خواتین اور شاعرات ہی کو شامل کیا گیا ہے۔

یوں تو ادیبائیں اردو ادب کے افق پر انیسویں صدی کے آخری ایام میں ہی نظر آنے لگی تھیں، تاہم باقاعدہ طور پر وہ بیسویں صدی کے آغاز سے ہی سرگرم ہوئیں۔ یہ دور خواتین اردو ادب کا پہلا دور گردانا جا سکتا ہے۔ اس دور کی شروعات میں خواتین اردو ادب کے دو دلچسپ پہلو سامنے آتے ہیں۔ اول یہ کہ مخصوص سماجی اور ثقافتی صورتِ حال کے پیشِ نظر کچھ ادیبائیں اپنی اصلی ناموں کے تحت شایع ہونے سے کتراتی تھیں۔ ان کی تخلیقات فرضی ناموں سے شایع ہوتی تھیں۔ اس لیے اس دور میں بیگم شاہنواز، مسز عبدالقادر، ز۔خ۔ش (زہرا خاتون شیروانی) والدہ افضل علی، مسز الف ظ حسن وغیرہ کے نام نظر آتے ہیں۔ بیگم صالحہ عابد حسین تو ہمشیرہ غلام السیدین کے نام سے اپنے مضامین کافی عرصے تک شایع کراتی رہیں۔

اس دور کے خواتین اردو ادب کا دوسرا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ بیشتر ادیبائیں، ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی تحریروں سے نہ صرف متاثر نظر آتی ہیں، بلکہ ان سے تحریک (inspiration) بھی حاصل کرتی ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کی دو تصنیفات 'مراۃالعروس' اور 'بنات النعش' بالترتیب ۱۸۶۹ء اور ۱۸۸۸ء میں شایع ہو کر متوسط اردو داں مسلم خواتین میں خاصی مقبول ہو گئی تھیں، مصنف نے 'مراۃ العروس' جس کا مدعا بقول مصنف عورتوں کی "تعلیم، اخلاق و خانہ داری مقصود تھی" کا مسودہ پہلے "گورنمنٹ ممالک مغربی و مشرقی کو ۱۸۶۸ء میں پیش کر کے پانچسو روپے انعام" بھی پائے تھے۔ 'بنات النعش' جس کو مصنف مراۃالعروس کا دوسرا حصہ قرار دیتے ہیں، کی تصنیف بقول مصنف "عورتوں کی اصلاحِ حالت اور تمدن میں ان کو زیادہ کار آمد بنانا مقصود ہے۔" ڈپٹی نذیر احمد نے 'مراۃالعروس' میں اصغری کے کردار کو ایک رول ماڈل (role model) کے طور پر پیش کی تھی، جو تعلیم کے زیور سے آراستہ تو تھیں ہی، امورِ خانہ داری میں بھی ماہر تھیں۔ یہ کردار اس دور کی بیشتر ادیباؤں کے لیے اہم موضوع بن گیا تھا۔ ڈپٹی صاحب نے اصغری کی ضد (opposite) کو اکبری کے کردار کے ذریعہ پیش کیا تھا تاکہ رول سمجھنے اور موازنہ کرنے میں آسانی ہو۔

اردو ادب کے اس دور کی ادیباؤں میں رشیدۃالنساء، اکبری بیگم، مسز عباس طیب جی، صغریٰ ہمایوں مرزا، بیگم شاہنواز، مسز عبدالقادر، نذر سجّاد حیدر اور حجاب امتیاز علی چند اہم نام ہیں۔ ان ادیباؤں کی بیشتر تحریریں اب تقریباً نایاب ہیں، لیکن جتنا کچھ بھی دستیاب ہے، ان سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے موضوعات اکثر و بیشتر تعلیمِ نسواں، لڑکیوں کی کم سنی میں شادی کے مضر اثرات اور مشرقی عورت کی روایتی وفاداری پر مبنی ہیں۔ یہ ادیبائیں اصغری کے کردار کی طرز (pattern) پر اپنی تحریرون کو ایک مثالی عورت (ideal woman) کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ یہ عورت ایک فرماں بردار بیٹی، وفادار بیوی اور مثالی ماں کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ ان تحریروں میں خواتین کو تعلیم حاصل کرنے اور بچوں کی اچھی طرح نگہداشت و پرورش کرنے کی بھی ترغیب دی جاتی ہے۔ یہ تحریریں دراصل ڈپٹی نذیر احمد کے

اصلاحِ نساء (women's reformation) ایجنڈہ کی ایک توسیع (expansion) ہیں۔ رشیدۃ النساء کا ناول 'اصلاحِ نساء' جو انیسویں صدی کے اختتام پر شایع ہوا تھا، (تازہ ایڈیشن ۱۹۶۸ء میں پاکستان میں شایع ہوا ہے) اس موضوع پر یہ پہلی کوشش قرار دی جا سکتی ہے۔

صغرا ہمایوں مرزا کی بیشتر تحریریں اب تقریباً نایاب ہیں۔ ان کے کچھ افسانوں کا انگریزی میں ترجمہ ہوا ہے۔ حال ہی میں 'آج کل' نئی دہلی (ستمبر ۱۹۹۸ء) میں ڈاکٹر ناز قادری کا ایک تحقیقی مقالہ صغریٰ ہمایوں مرزا سے متعلق شایع ہوا ہے۔ اس مضمون کے مطابق (صغریٰ ہمایوں مرزا کا پہلا ناول 'مشیر نسواں' ۱۹۰۶ء میں شایع ہوا اور اس کے دوسرے ایڈیشن ۱۹۱۱ء اور ۱۹۳۱ء میں شایع ہوئے۔ بقول ناز قادری 'مشیر نسواں' کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں طبقہ نسواں کے لیے مفید و کار آمد پند و نصائح کا ذخیرہ ہے جو خواتین کی معاشرتی زندگی میں مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ صغریٰ ہمایوں مرزا نے کئی سفر نامے اور پانچ ناول تحریر کیے۔ ان کے افسانے 'بی بی طوریٰ کا خواب' کا ترجمہ دوسری زبانوں میں بھی ہوا ہے۔

نذر سجاد حیدر نے جو سماجی اور اصلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں اپنے ناول 'آہِ مظلوماں' میں کثیر الازواجی (polygamy) سے پیدا شدہ مسائل کو نہایت بے باکی سے ابھارا ہے۔

اس دور کے خواتین ادب میں مشرقی اور مغربی اقدار کی کشمکش کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ دراصل مسلمانوں کے اعلیٰ متوسط طبقوں کے وہ خاندان جو نوکریوں کی وساطت سے انگریز حکمراں طبقے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے، اس کشمکش کے بنیادی شکار تھے۔ ایک طرف وہ انگریزی اقدار (values) اور طریقۂ کار (behaviour) کی نقالی کرنا چاہتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ذہنی طور پر، بالخصوص خواتین کے حوالے سے، اپنی مشرقی روایات کے ساتھ بھی جڑے رہنا چاہتے تھے۔ کچھ ادیبائیں مغرب کے سنسنی خیز ادب (sensational literature) سے بھی خاصی متاثر نظر آتی ہیں۔ ان کے پلاٹ، موضوعات حتیٰ کہ زبان بھی کسی دوسری سرزمین کی نظر

آتی ہے۔اس سلسلے میں حجاب امتیاز علی کے افسانے سر فہرست ہیں۔ مثلاً :

"کیا بات ہے بوڑھی گائے" میں حیران ہو کر کہنے لگی۔ "تم چاء کیوں نہیں لے آتیں؟ سہمی ہوئی کیوں ہو؟"

"ہم دونوں باورچی خانے کے زینے پر سے بھاگتے ہوئے ڈاکٹر گار کے کمرۂ خواب میں پہنچے۔ ڈاکٹر گار اپنی شب خوابی کے دھاری دار نیلے لباس میں بیٹھا اپنی بستر کی چاء پی رہا تھا......"

(افسانہ کونٹ الیاس کی موت)

حجاب امتیاز علی کا افسانہ 'صنوبر کے سائے' جس میں ایک جذباتی عاشق خاوند اپنی محبوبہ بیوی کو محض شک کی بنیاد پر قتل کر ڈالتا ہے، شیکسپیئر کے او تھیلو (Othello) کی یاد دلاتا ہے۔ مغربی ڈرامائیت اور سنسنی سے بھرپور حجاب امتیاز علی کے افسانے خاصے دلچسپ ہیں۔ کہیں کہیں وہ عورت اور مرد کے جدا جدا نفسیاتی ردِ عمل کو بھی نہایت خوبی سے ابھارتی ہیں۔اپنے افسانے 'مرد اور عورت' میں ایک مرد اور عورت بچھڑنے کے چھ سال بعد ملتے ہیں۔اس دوران مرد بیسیوں بار بے وفائی کر چکا ہوتا ہے اور عورت صرف ایک بار ایک مرد کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتی ہے، کیونکہ اس میں اسے اپنے محبوب کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ صرف اس ایک بات پر مرد اس عورت کو اپنے لیے ناقابل قرار دیتا ہے۔ حجاب امتیاز علی کی کہانی 'کونٹ الیاس کی موت' کا یہ مختصر اقتباس بھی نہایت ہی معنی خیز ہے :

"ہم مشرقی سیاہ چشم اور صندلی رنگت والی لڑکیاں بچپن سے ہی جادو اور گرم ملکوں کے سحر کے قصے سن سن کر پلتی ہیں۔ ہماری زندگی مشرقی ملکوں میں بجائے خود ایک افسانہ ہوتی ہے۔"

خواتین اردو ادب کا یہ پہلا دور بیسویں صدی کے آغاز سے تقریباً بیسویں صدی کی تیسری دہائی پر محیط ہے۔ اس دور میں خواتین اردو ادب کی خصوصیات بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ان کی تخلیقات میں نسوانی شعور کی اولین بیداری اور ان کے خانگی، سماجی اور سیاسی مسائل سے ان کی آگہی کے نقوش نظر آتے ہیں۔اس زمانے

میں کچھ اردو ادیبائیں ملک کی سیاسی اور سماجی تحریکوں کے ساتھ بھی وابستہ ہو گئی تھیں۔ان میں نذر سجاد حیدر پیش پیش تھیں۔

خواتین اردو ادب کا دوسرا اور اہم دور تقریباً بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے شروع ہوتا ہے۔ڈاکٹر رشید جہاں اس دور کا ایک اہم نام ہے۔انھوں نے ۱۹۳۰ء کے آس پاس لکھنا شروع کیا تھا۔ لکھنؤ سے ۱۹۳۲ء میں شایع ہونے والی انتھالوجی 'انگارے' میں شامل ان کی دو کہانیوں 'دلی کی سیر' اور 'پردے کے پیچھے' کو لے کر کافی گرماگرمی ہوئی تھی۔ بقول رشید جہاں ان کو گمنام اور دھمکی آمیز خطوط بھی ملے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ 'دلی کی سیر' میں یہ تفصیل کسی مرد کو اگر کو ایک چیلنج سا لگی ہو گی۔ ملاحظہ ہو:

> "مجھے اسباب پاس چھوڑ یہ رفوچکر ہوئے اور میں اسباب پہ چڑھی برقعہ میں لپٹی بیٹھی رہی۔ایک تو کم بخت برقع، دوسرے مردوے۔ مرد تو ویسے ہی خراب ہوتے ہیں۔اور اگر کسی عورت کو اس طرح بیٹھے دیکھ لیں تو اور چکر پہ چکر لگاتے ہیں۔پان کھانے تک کی نوبت نہ آئی۔ کوئی کمبخت کھانسے، کوئی آوازیں کسے اور میرا ڈر کے مارے دم نکلا جائے......"

(افسانہ 'دلّی کی سیر')

رشید جہاں اشتراکی تھیں اور کمیونسٹ تحریک سے باقاعدہ وابستہ تھیں۔ لیکن ان کی کہانیوں میں سماجی، بالخصوص مسلم خواتین کے مسائل اور انگریز حکمرانوں کے الگ الگ معیاروں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ان کی کہانی 'مجرم کون؟' (۱۹۴۱) میں ایک انگریز جج مسٹر رابنسن، ایک گڈریے کو کسی دوسرے مزدور کی بیوی کو بھگانے (جو اپنی مرضی سے خود اس کے ساتھ بھاگی ہوتی ہے) کے جرم میں تین سال کی قید کی سزا دیتا ہے۔ لیکن خود ایک کرنل کی بیوی کو پہلے بھگا کر، پھر اس کے شوہر سے زبردستی طلاق دلوا کر اس سے خود شادی کر لیتا ہے۔ سماج میں مروّجہ دوہرے قانونی معیاروں پر یہ کہانی ایک بھرپور طنز ہے۔ رشید جہاں کا اندازِ بیان ٹکسالی ہے، جس کی چھاپ بعد میں

عصمت چغتائی کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔

صالحہ عابد حسین بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے اختتامیہ پر تقریباً ۱۹۳۹ء میں اردو کے ادبی افق پر ظاہر ہوئیں۔ وہ پہلے صالحہ مصداق فاطمہ اور کبھی صالحہ خاتون یا ہمشیرہ غلام السیدین کے نام سے لکھتی تھیں۔ انھوں نے لگ بھگ بیالیس کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان میں افسانوں کے مجموعے، مولانا الطاف حسین حالی کی سوانح حیات اور بچوں کے لیے کئی کتب شامل ہیں۔ صالحہ عابد حسین کی تحریریں عموماً اصلاحی ہیں۔ لیکن انھوں نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی، تقسیمِ ملک سے پیدا شدہ سماجی صورتِ حال اور فرقہ وارانہ فسادات سے نڈھال اور زخمی انسانیت کے موضوعات کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ انھوں نے مسلم سماج کے مسائل پر بے باکی سے قلم اٹھایا ہے۔ ان کی تحریروں میں مسلم سماج میں مروجہ سماجی اور ثقافتی اقدار کے نقوش نظر آتے ہیں۔ ان نقوش کی دلچسپ جھلکیاں، ان کی خودنوشت سوانح 'سلسلۂ روز و شب' میں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ اپنی باجی کی شادی کے سلسلے میں لکھتی ہیں:

> "ان کی شادی کی بات دو جگہ چل رہی تھی۔ بالآخر استخارہ کے ذریعہ رقعہ ڈال کر شادی طے گئی۔ ۱۹۱۹ء کا زمانہ تھا۔ پڑھے لکھے عالم فاضل گھروں میں یہ سب ہوتا تھا۔"

اسی طرح شیری جس کو وہ منہ بولی بہن کہتی تھیں، جو "نیچ ذات" کی تھیں اور جنھیں بقول ان کے پانی پت کی زبان میں "کمینی" کہا جاتا تھا، کے بارے میں لکھتی ہیں: "ان کی صفات ایسی تھیں جن پر اعلیٰ سے اعلیٰ گھرانے کی عورتیں اور اونچی سے اونچی تعلیم یافتہ خواتین رشک کر سکتی تھیں...... ان کی شادی میں ہم بچے ہی جا سکے۔ یہ بھی طبقاتی بندش تھی کہ اماں بھی اپنی اس پروردہ بیٹی کی شادی میں شرکت نہ کر سکیں۔" واضح رہے کہ مسلم سماج میں یہ طبقاتی تضاد آج بھی موجود ہے۔ 'اشراف' اور 'اجلاف' کی تمیز آج بھی برقرار ہے، گو کہ بدلتے وقت نے اس تضاد کی دھار کو کند کر دیا ہے، لیکن یہ صورتِ حال آج بھی مسلم سماج کی ایک حقیقت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ صورتِ حال اسلامی اصولوں کے منافی ہے۔

صالحہ عابد حسین نے مسلم مصلحین (reformists) کے رول کو بھی بڑی غیر جانبداری سے جانچا ہے اور اس پر بڑے بے لاگ تبصرے بھی کیے ہیں۔ مثال کے طور پر، سید احمد خاں کے بارے میں مضمون 'چُپ کا دادرس' جو ان کے مجموعہ ادبی جھلکیاں، (۱۹۵۹) میں شایع ہوا ہے، اپنا تجزیہ یوں پیش کرتی ہیں :

"یہ تو صحیح نہیں کہ سرسید عورتوں کی تعلیم کے خلاف تھے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ جہاں تک عمل کا تعلق ہے، انھوں نے عورتوں کی تعلیم یا حقوق کے لیے کچھ نہیں کیا اور قوم کے آدھے حصے کو مفلوج رہنے دینا گوارا کیا۔"

صالحہ عابد حسین نے اپنی تحریروں میں دلچسپ انکشافات بھی کیے ہیں جو بڑے معنی خیز ہیں۔ 'سلسلۂ روز و شب' میں رضیہ سجاد ظہیر کے بارے میں اپنے تاثرات یوں بیان کرتی ہیں :

"رضیہ کمیونسٹ خیالات رکھنے کے باوجود اپنی تہذیبی وراثت پر فخر کرتی تھی اور مذہبی جذبہ بھی اس میں موجود تھا، مثلاً شیعہ مذہب پر عقیدہ، مجالس سے دلچسپی وغیرہ۔"

معلوم نہیں رضیہ سجاد ظہیر نے اس پر کوئی ردِ عمل ظاہر کیا ہے یا نہیں۔ اسی طرح صالحہ عابد حسین مسز الف، ظ، حسن کے ناول 'روشنک بیگم' جو ۱۹۲۲ء کے آس پاس کہیں چھپا تھا، کے بارے میں لکھتی ہیں کہ یہ ناول 'فسانۂ آزاد' سے چوری کیا گیا ہے۔

رضیہ سجاد ظہیر نے بھی لگ بھگ صالحہ عابد حسین کے ساتھ ساتھ ہی لکھنا شروع کیا۔ ان کے چار ناول 'سرِ شام'، 'کانٹے'، 'سمن'، 'اللہ میگھ دے' اور ایک افسانوی مجموعہ 'زرد گلاب' شایع ہوئے ہیں۔ وہ ترقی پسند تھیں اور ان کی اشتراکی سوچ کا عکس ان کی تحریروں میں صاف دکھائی دیتا ہے۔ ان کی تحریروں میں ایک اشتراکی خواب، یعنی ایک غیر طبقاتی اور سماجی انصاف پر مبنی معاشرہ کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ رضیہ سجاد ظہیر کا اندازِ بیان اور استعارات دلچسپ ہیں۔ اپنے افسانے 'زرد گلاب' میں

پھولوں کے استعارے کا استعمال نہایت خوبی سے کیا گیا ہے۔ ایک بڑی سی پینٹنگ (painting) میں کچھ پژمردہ گلاب کے پھول، جو کہ پوری پھولوں والی پینٹنگ کا حصہ ہوتے ہیں، ایک خاتون کو بے حد پریشان کرتے ہیں۔ وہ انھیں یا تو باقی پھولوں کے ساتھ ملا کر زندہ جاوید دیکھنا چاہتی ہیں یا پھر پینٹنگ سے قطعی الگ کرنا چاہتی ہیں۔ افسانے کا اختتامی اقتباس یوں ہے :

"زرینہ بیٹی۔ تم نے ایک دفعہ مجھ سے پوچھا تھا کہ یہ زرد گلاب گچھے سے الگ کیسے ہو گیا۔ اس وقت تم بہت ننھی سی تھیں، میں تم سے کیا بتاتی۔ اور پھر بہت سی باتیں انسان کبھی اپنی زبان پر نہیں لا سکتا۔ اپنی اولاد سے بھی نہیں کہہ سکتا۔ پر وقت آج تمھیں یہ سمجھائے گا کہ کوئی کس مجبوری اور بے بسی کے ساتھ اپنے پیاروں سے الگ ہوتا ہے۔

کوئی بھی پھول گچھے کو چھوڑنا نہیں چاہتا، مگر اسے چھوڑنا پڑتا ہے۔ یہ تصویر مجھے اپنی سب چیزوں سے زیادہ پیاری ہے۔ اس لیے یہ تمھارے واسطے ہے۔ میرا تو اب کوئی گھر نہیں ہو گا۔ مگر خدا تمھارے گھر کو سلامت رکھے۔ اسے اپنے کھانے کے کمرے میں آتش دان پر لگانا اور اسے سدا پیار کرنا۔" (افسانہ زرد گلاب)

خواتین اردو ادب میں ایک نئی اور چونکا دینے والی آواز عصمت چغتائی کی ہے۔ انھوں نے ۱۹۴۰ء کے آس پاس اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ ان کی تخلیقات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ان کی تحریریں بلا شبہ موضوعات، اسلوب، کرداروں اور لب و لہجہ کے اعتبار سے تانیثی حِسیّت (feminist sensibility) اور تانیثی شعور (feminist conciousness) کے اظہار کا پہلا معتبر تجربہ ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی تحریریں تانیثیت کی پہلی اور مستند دستاویزات ہیں۔

عصمت کے موضوعات منفرد ہیں۔ سماجی حالات پر ان کا ایک الگ ہی ردِ عمل ہے۔ اس عمل سے گزرتے ہوئے وہ مروجہ عقائد، سماجی و ثقافتی اقدار، حتیٰ کہ

مذہبی اصولوں تک کی دھجیاں ادھیڑ کر رکھ دیتی ہیں۔ ان کے افسانوں اور ناولوں میں عورت کے جذبات، ذہنی کیفیات، روزمرہ کی وارداتوں پر ان کے نفسیاتی ردِ عمل اور ان کے مخصوص سماجی حالات کی عکس بندی فنکارانہ مہارت سے کی گئی ہے۔

عصمت چغتائی کا 'دل کی دنیا' (ناولٹ) موضوع کے اعتبار سے جتنا حساس (sensitive) اور خطرناک (dangerous) آج سے ساٹھ برس پیشتر تھا، اتنا ہی حساس اور خطرناک آج بھی ہے۔ قدسیہ خالہ، جن کے شوہر ایک میم کے چکر میں نہ تو انھیں بساتے ہیں اور نہ ہی انھیں طلاق دیتے ہیں، آخر کار اپنے خاموش عاشق شبیر میاں کے ساتھ غائب ہو کر انگلینڈ میں رہنے لگتی ہیں۔ یہ مسئلہ آج بھی ہزاروں مسلم خواتین کے لیے کسی حل کا متلاشی ہے۔ ان کے خاوند نہ تو ان کے ساتھ معمول کی زندگی گزارتے ہیں اور نہ ہی انھیں طلاق دے کر آزاد کرتے ہیں۔ اس مسئلہ کے اوپر قدسیہ خالہ اور شبیر میاں کی اولاد کے توسط سے مصنفہ کا ردِ عمل ملاحظہ ہو:

> ''امّی اور ابّو کی محبت دیکھ کر شادی بیاہ اور طلاق کی اہمیت پر ہنسی آنے لگتی ہے۔''

ناولٹ کے اختتام پر مصنفہ ایک نئے طرزِ عمل کی نشاندہی کرتے ہوئے یوں مشورہ دیتی ہیں :

> ''جاؤ رفیعہ حسن، تم بے دھڑک جہاں چاہو، جاسکتی ہو۔ زندگی کی قدروں کو ناپنے تولنے کے لیے تمھارا اپنا فیتہ ہے۔ اپنے باٹ ہیں۔ اپنی ترازو ہے۔ تمھاری زندگی میں کوئی ڈنڈی نہ مار سکے گا۔ تمھارے خواب کبھی چکنا چور نہیں ہوں گے۔'' (ناولٹ 'دل کی دنیا')

عصمت چغتائی ہندوستانی دیومالا سے کردار لے کر انھیں بڑی مہارت سے استعاروں میں تبدیل کر کے انھیں برتنے کے فن سے صرف واقف ہی نہیں، بلکہ اس میں کمال بھی رکھتی ہیں۔ ملاحظہ ہو :

> ''رادھا نام کی سب ہی لڑکیاں بڑی ضدی ہوتی ہیں۔ بانگِ دہل وہ اپنے عشق کا اعلان کرتی ہیں۔ ساری ذلتیں اور بدنامیاں ہنس کر

جھیلتی ہیں۔ تن من دھن کی بازی لگادیتی ہیں اور ا انسہ ان کے ہی حق میں پڑتا ہے۔ مخالف ہوائیں ان کے جذبۂ عشق کے آگے سر جھکادیتی ہیں۔ پھر لوگ ان کے جذبہ کی پوجا کرتے ہیں۔ ان کی شان میں گیت گاتے ہیں اور انھیں دیوی کا استھان بخشتے ہیں۔"

(ناولٹ 'دل کی دنیا')

ایک اور دلچسپ نمونہ ملاحظہ ہو :

"وہ خیالی محبوب بالکل چوں چوں کا مربہ تھا۔ کچھ جیمس بونڈ اور کرشن مراری کا مجموعہ سمجھ لیجیے۔ جیمس بونڈ تو زمانہ میں ہیرو رہ چکا ہے، وہ چاہے داستانِ امیر حمزہ کا ہیرو ہو، حاتم طائی ہو یا آلھا اودل کی صورت میں ظاہر ہو۔ اور کرشن مراری کی جھلک شاید اس لیے تھی کہ زیادہ تر لوک گیت انھیں کی شان میں ہوتے تھے۔" (ناولٹ 'دل کی دنیا')

عصمت چغتائی کی زبان خالص ٹکسالی ہے۔ ان کی تخلیقات قاری کو فوراً اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں، اور اسے ایک بار شروع کر کے ختم کیے بغیر چین نہیں آتا۔ ان کی زبان نے ایک مشکل یہ پیدا کی ہے کہ ان کی تخلیقات کا ترجمہ دنیا کی دوسری زبانوں میں بہت کم ہوا ہے۔ وہ ٹکسالی محاوروں اور عوام میں مقبول تشبیہات کا اس حد تک استعمال کرتی ہیں کہ ان کے تراجم میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اردو خواتین ادب میں عصمت چغتائی کا ایک منفرد مقام ہے۔ افسانہ 'لحاف' اگر ان کی انفرادی سوچ اور بے باکی کا آئینہ ہے تو افسانہ 'پنکچر' جس میں ایک عورت ایک مرد سے محبت کرنے کے باوجود کسی دوسرے آدمی کے ساتھ شادی کر لیتی ہے، کیوں کہ مرد، عورت سے اظہارِ محبت میں پہل کرنے سے ہچکچاتا ہے، عصمت کے نسائی جذبات کا مظہر ہے۔

عصمت چغتائی نے تقریباً آٹھ ناول لکھے جن میں 'ضدی'، 'ٹیڑھی لکیر'، 'معصومہ'، 'سودائی'، 'عجیب آدمی'، 'جنگلی کبوتر'، 'دل کی دنیا' اور 'ایک قطرہ خون' شامل ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے اپنے ادبی سفر کا آغاز تقریباً عصمت چغتائی کے ساتھ ہی

کیا۔ قرۃ العین کے ادبی کارنامے اب چھ دہائیوں سے بھی زیادہ عرصے پر محیط ہیں۔ اُن کے موضوعات وسیع ہیں۔ اُن کا 'کینوس' اس سے بھی وسیع تر ہے۔ ان کے ناول اور افسانے فلسفہ، تاریخ، سماجیات، سیاسیات، تہذیب، ثقافت اور سماجی وانفرادی نفسیات (social and individual psychology) پر ان کی گہری نظر کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے ناول 'میرے بھی صنم خانے'، 'آگ کا دریا'، 'کارِ جہاں دراز ہے' اور 'آخرِ شب کے ہم سفر' اردو ادب میں موضوع، زبان و بیان اور ایک نئی دانشورانہ سوچ اور سماجی حسیّت کے لحاظ سے ایک سنگِ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے مجموعے 'پت جھڑ کی آواز' اور چار ناولٹوں کا مجموعہ 'اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو' اس نئی حسیّت کی نشاندہی کرتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کی تحریریں برصغیر ہند میں سیاسی تبدیلیوں، بالخصوص جغرافیائی تقسیم سے پیدا شدہ صورتِ حال اور اس تقسیم کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی اثرات کو نہایت سنجیدگی سے اجاگر کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے شہرۂ آفاق ناول 'آگ کا دریا' میں عہدِ پارینہ سے لے کر تقسیم ہند تک سماجی اور ثقافتی ادوار کا احاطہ عالمانہ اور دانشورانہ انداز میں کیا گیا ہے۔ یہ ضخیم ناول پلاٹ، زبان و بیان، علامتوں اور استعاروں کے لحاظ سے بلاشبہ اردو ادب میں ایک علیٰحدہ اپروچ اور ایک منفرد سوچ کا آئینہ دار ہے۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ اردو ادب کے بیشتر ناقدین قرۃ العین حیدر کے وسیع اور گراں قدر ادبی سرمائے کا تجزیہ اکثر و بیشتر محض اسی ناول کی بنیاد پر کرتے آئے ہیں۔ حقیقت میں ان کے ادبی سرمائے کے کماحقہ جائزے کی اشد ضرورت ہے۔

قرۃ العین حیدر نے ملک کی تقسیم اور اس سے پیدا شدہ انسانی، سماجی اور سیاسی مسائل سے متاثر ہو کر کئی ناول اور افسانے تخلیق کیے ہیں۔ ان کے دو مشہور ناول 'میرے بھی صنم خانے' اور 'آگ کا دریا' براہِ راست اسی موضوع سے متعلق ہیں۔ اصل میں ملک کی تقسیم نے ان کے ذہن کو خاصہ متاثر کیا ہے۔ انھوں نے خود بھی اس بات کا ذکر کیا ہے کہ :

"اگر کسی حادثے نے میرے لیے محرک کا کام کیا ہے، تو وہ پہلا حادثہ

۱۹۴۳ء میں میرے والد کی موت تھا اور دوسرا تقسیمِ ہند۔ تقسیمِ ہند نے میرے لکھنے پر گہرا اثر ڈالا ہے۔"

ان کے ایک اور ناول 'آخرِ شب کے ہم سفر' میں بھی تقسیم ملک اور اس کے دور رس اثرات ان کا موضوع ہے، اس میں ایک اضافہ قیامِ بنگلہ دیش ہے۔ ان کی تحریروں کی خوبصورتی یہ ہے کہ ان میں انسانی مسائل کا حل زمینوں کی تقسیم میں نظر نہیں آتا ہے۔ ان کی تحریروں سے یہ اخذ ہوتا ہے کہ اس طرح کی تقسیم سے مسائل کے حل تو در کنار، بہت سے دوسرے اور پیچیدہ مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ 'آخرِ شب کے ہم سفر' میں ناول کی ایک بنیادی کردار، دیپالی تاریخ کے مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی کلکتہ (آج کل کی اصطلاح میں کولکتہ) پہنچ جاتی ہیں۔ شانتی نکیتن سے وہ گیسٹ ہاؤس کے لیے ایک رکشا لیتی ہیں۔ رکشا والے کے ساتھ ان کا یہ مکالمہ ملاحظہ ہو:

"کہاں چلوں دیدی؟" لڑکے نے پوچھا۔

"تمھارا نام کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"آمار نام علی حسین۔"

"علی حسین۔ اس نے دہرایا۔ یہ مدقوق رکشا والا علی حسین انڈیا میں بھی موجود تھا، بنگلہ دیش میں بھی، پاکستان میں بھی۔ اس کے لیے کچھ نہیں بدلا تھا۔"

تقسیمِ ہند اور اس تقسیم سے پیدا شدہ صورتِ حال قرۃ العین حیدر کا ایک مستقل موضوع ہے۔ ان کا مشہور افسانہ 'ہاؤسنگ سوسائٹی' نو مولود اسلامی مملکت پاکستان کے ابتدائی سیاسی اور سماجی حالات کی گہری تصویر کشی کرتا ہے پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد پاکستانی سماج میں جو نئے طبقات ابھر کر سامنے آتے ہیں، اُن کی سوچ، نفسیات اور طرزِ عمل کو اس افسانے میں نہایت فنکاری کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ سیاسی اندازِ فکر جو اس ملک کے مفادِ خصوصی (vested interest) کے لیے خطرہ تصور کیے جاتے ہیں، ان کے تئیں مملکت کی جانب جو قہر نازل ہوتا ہے، اس کی رونگٹے کھڑی کرنے والی عکس بندی بھی اس افسانے میں نظر آتی ہے۔

قرۃ العین حیدر اپنی تخلیقات میں زندگی اور کائنات کے مختلف رنگوں کو سمو کر ایک خوشگوار منظر پیش کرتی ہیں۔ مختلف رنگوں کی یہ متضاد دھنک ان کی تحریروں کو خوبصورت بناتی ہے۔ بقول ان کے :

"شاعرہ! پروں جیسا، بادل جیسا سفید، کسی مرنے والے کا کفن بنتے ہیں ہم۔ دلہن کی سرخ ساری اور موت کا سفید کفن۔ تانا بانا، زندگی اور موت، سکھ اور دکھ، نیکی اور بدی، امن اور تشدد، ریحان اور جہاں آرا۔"

(آخرِ شب کے ہم سفر)

قرۃ العین حیدر کا مکانی کینوس کافی وسیع ہے۔ اس سلسلے میں ان کا افسانہ 'حاجی گل بابا بیکتاشی کے ملفوظات' یوگوسلاویہ (آج کل کے بوسنیا، ہرزہ گووینا) کے صوفی ازم کے پس منظر میں تحریر کیا گیا ایک نہایت ہی دلچسپ اور علامتی افسانہ ہے۔ یہ افسانہ اُس دور کی یادگار ہے، جب یوگوسلاویہ ایک مکمل سیاسی اکائی تھا اور کمیونزم (اشتراکیت) کے ساتھ ساتھ مقامی صوفی ازم وہاں کے مسلمانوں کا ایک قابلِ فخر قیمتی سرمایہ تھی۔

خواتین کے خصوصی مسائل بھی قرۃ العین حیدر کی تخلیقات کا ایک حصہ ہیں۔ ان کا ناولٹ 'اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجیو' میں خواتین کو درپیش ذاتی اور سماجی مسائل کا تجزیہ نہایت ہی فنکاری کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس ناولٹ میں حالات و واقعات کا تسلسل خود بخود اس سماجی صبر کو اجاگر کرتا ہے جس میں اکثر و بیشتر ہمارے سماج کی خواتین اپنے آپ کو محصور پاتی ہیں۔

جیلانی بانو نے ۱۹۵۵ء سے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا۔ ان کے کئی قابلِ ذکر ناول، ناولٹ اور افسانوی مجموعے شایع ہوئے ہیں۔ ان میں 'بارشِ سنگ' (ناول) ایوانِ غزل (ناول) اور افسانوی مجموعے 'روشنی کے مینار'، 'نروان'، 'یہ کون ہنسا؟' اور ناولٹ 'نغمے کا سفر' شامل ہیں۔ انھیں متعدد انعامات سے نوازا گیا ہے۔

جیلانی بانو کا شمار ترقی پسندوں میں ہوتا ہے۔ ان کا ذہن اشتراکی سوچ کا حامل

ہے۔ ان کی تخلیقات کے موضوعات میں مسلم سماج پر تقسیم ہند کے اثرات اور مسلمانوں کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی مسائل شامل ہیں۔ان مسائل کی منظر کشی اور ان کا تجزیہ ان کی تخلیقات میں خوب نظر آتا ہے۔

نئی اور پرانی اقدار کی کشمکش جیلانی بانو کے افسانوں کا خاص موضوع ہے۔ان کے افسانوں میں متوسط مسلم سماج میں رہنے والے افراد کی نفسیاتی کشمکش، جس میں ان کے اذہان پر پرانی روایات اور اقدار حاوی ہیں، اور اس کے ساتھ ساتھ انھیں نئی حقیقتوں اور نئی اقدار سے بھی نبرد آزما ہونا پڑتا ہے، ان سب کی دلچسپ عکاسی نظر آتی ہے۔

جو مسلمان ترکِ وطن کے بعد نئی مملکت پاکستان میں آباد ہوئے، ان کو بالخصوص متوسط طبقے کے افراد کو، جس ثقافتی بحران سے دوچار ہونا پڑا، اس کی دلچسپ تصویر کشی جیلانی بانو کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔ سرزمینِ پاکستان پر اردو زبان بولنے والے ہندوستانی مہاجرین کے لیے ثقافتی مسئلہ ایک اچھے خاصے بحران (crisis) کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ بقول مصنفہ :

> ”ادھر پاکستان سے جس کا خط آئے، دو چار نئی شادیوں کا ذکر سن لیجیے۔ وہ بھی یوں ہی بے جوڑ۔ کسی نے سندھی سے بیاہ کر لیا تو کسی نے پنجابی لڑکے کو بیٹی دے دی۔ لوگ انگلیاں اٹھاتے اٹھاتے تھک گئے۔ جب سارے محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے نظر آئیں، تو کس کس پر ہنسا جائے......“
>
> (افسانہ : روشنی کا مینار)

آمنہ ابوالحسن تقریباً پچھلی آدھی صدی سے برابر لکھ رہی ہیں۔ ان کے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۵۱ء میں ان کی پہلی کہانی سے ہوا جو 'ساقی' میں شایع ہوئی تھی۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'کہانی' ۱۹۶۵ء میں منظرِ عام پر آیا، اس کے بعد ان کے کئی ناول اور افسانوں کے مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ ان کا ناول 'سیاہ، سرخ، سفید' خاصہ مقبول ہو چکا ہے۔

آمنہ ابوالحسن کی تحریروں میں ایسی نسائیت ہے جو بہت خوشگوار لگتی ہے۔

ان کی کہانی 'برجو' ایک ایسے دلچسپ آدمی کی کہانی ہے جس کو جنگل کے ماحول سے بے پناہ عشق ہوتا ہے۔ یہ مفلس آدمی ایک اچھی آرام دہ نوکری کو جنگلوں میں مزدوری کی خاطر تیاگ دیتا ہے۔ آج کے جدید دور میں جب کہ انسان نے مادّی ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے جنگلوں کا صفایا کرنا شروع کر دیا ہے، ایسے لوگ بھی موجود ہیں، جو اس ماحول کے ساتھ جنون کی حد تک پیار کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کہانی ایک نیا تجربہ ہے۔

ان کی تحریروں میں انسانی نفسیات تک رسائی کی کوشش کا اندازہ ہوتا ہے۔ کہیں کہیں انگریزی الفاظ کا استعمال نامناسب معلوم ہونے کے باوجود تسلسل قائم رہتا ہے۔ آمنہ ابوالحسن کی تحریریں ایک آہستہ بہتی ہوئی ندی کا احساس دلاتی ہیں جو بغیر شور مچائے اپنی اہمیت اور شخصیت کو منواتی ہے۔ خود ایک عورت ہو کر وہ غالباً عورت کی شخصیت کو یوں دیکھتی ہیں :

> "میں ایک ایسی کتاب ہوں، جس کا زیادہ حصہ کھلا ہوا، عیاں ہے، سب پر ظاہر۔ لیکن اس کتاب کا مخفی حصہ ایسا بھی ہے جو صرف اس کی ذات، اس کی آگہی تک محدود و مخصوص ہے۔ جس کی بابت دوسرا کوئی کچھ نہیں جانتا۔ کھلے عیاں حصے میں اس کی ہنسی، مسکراہٹیں، اس کے ارادے اور عزائم ہیں۔ مگر مخفی حصے میں درد و کرب ہے۔ وہ آنسو جو پوشیدہ ہیں، جن کا کوئی حصّہ دار نہیں ہے۔ اور آنسو بہانا اسے پسند نہیں کہ اگر ایک بار آنسوؤں نے راستہ پالیا تو اسے رہ رہ کر تھکاتے نڈھال کرتے رہیں گے۔ انھیں باہر آنے کی عادت ہو جائے گی۔ مگر بسورتے چہرے کتنے برے لگتے ہیں......"
>
> (افسانہ : کاش)

آمنہ ابوالحسن کا ادبی سفر اب بھی برابر جاری ہے۔ وہ نئے نئے موضوعات کے ساتھ اردو کے ادبی سرمائے میں برابر اضافہ کر رہی ہیں۔

صغرا مہدی خواتین اردو ادب کی ایک ایسی ہمہ جہت شخصیت ہیں، جنھوں نے ادب کی مختلف اصناف، جن میں ناول، افسانے، تنقید، تراجم اور سفر نامے شامل ہیں، تحریر کیے ہیں۔ انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز پانچویں دہائی کے اختتامیہ سے کیا اور جب سے برابر لکھ رہی ہیں۔ ان کے ناول 'پابہ جولاں'، 'دھند'، 'پُروائی'، 'راگ بھوپالی' اور 'جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو' اردو زبان وادب میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے 'پتھر کا شہزادہ' اور 'جو میرا وہ راجہ کا نہیں' خاصے مقبول ہو چکے ہیں۔ اکبر الٰہ آبادی کی شاعری پر ان کا تجزیہ 'اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ' اردو تنقید میں ایک اہم اضافہ ہے۔

صغرا مہدی کے ناول اور افسانے سماجی اور اصلاحی ہیں۔ ان کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صالحہ عابد حسین سے خاصی متاثر رہی ہیں۔ صغرا مہدی کی تعلیم و تربیت اور علمی مصروفیات کا محور جامعہ ملیہ اسلامیہ رہا ہے۔ اس ادارے کے ماحول اور اقدار کا عکس صغرا مہدی کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔

صغرا مہدی کی تحریریں ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی آئینہ دار ہیں۔ انھیں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب پر فخر ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس تہذیب کا وارث گردانتی ہیں۔ ہندوستانی دیومالا سے استعارات لے کر وہ انھیں اپنی تخلیقات میں فن کاری سے برتتی ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

> "ماں کے الفاظ اس کے کان میں گونج رہے تھے...... رام چندر جی نے اپنے ملک میں رہ کر دکھ اٹھائے، تکلیفیں سہی، اس کی خدمت کی۔ ایسا راج جو 'رام راجیہ' کہلایا، جو آج بھی ترقی یافتہ زمانے میں حکومتوں کا آئیڈیل ہے۔ اور تم عباس ماجد یہاں پڑے ہو۔ زندگی کی آسائشیں حاصل کرنے کو، پیسہ بٹورنے کو، اپنے بچوں کا مستقبل بنانے کو — اس نے گھبرا کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ سب کھڑکیاں دروازے بند تھے۔ کمرے میں زیرو بلب کی مدھم، زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

دن بھر کی شدید محنت سے چُور اس کی بیوی بے خبر پڑی سو رہی تھی۔
اور بچے؟ اسے لگا کہ جیسے بچے اس کے پاس کھڑے اس سے سوال
کر رہے ہوں کہ رام کو بن باس کیکئی نے دیا تھا، اور ہمیں ——— ؟"

(افسانہ : بن باس)

خواتین اردو ادب کا تیسرا دور بیسویں صدی کی چھٹی دہائی سے شروع ہوا۔ اس دور میں اردو ادیباؤں نے ان موضوعات پر بلا جھجک لکھنا شروع کیا، جو ان کے لیے شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ معاملات واقعات و حادثات، جن پر لکھنا ایک ٹیبو (taboo) سمجھا جاتا تھا، اب اردو ادیباؤں کی بے باک تحریروں کے دائرے میں آ گئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ عصمت چغتائی نے خاتون تخلیق کاروں کے گرد باندھے گئے ایک حصار پر پہلے ہی دھاوا بول دیا تھا اور شجر ممنوعہ کو صرف ہاتھ ہی نہیں لگایا بلکہ پوری طرح سے اسے اپنے قبضے میں کرنے کا رجحان بھی شروع کیا تھا۔ لیکن خواتین اردو ادب میں یہ ایک رجحان کی شکل اختیار نہیں کر پایا تھا۔ اب یہ طرزِ تحریر ایک باقاعدہ رجحان (trend) کی شکل اختیار کر کے سامنے آتا ہے۔ اس دور میں جو اب بھی جاری ہے، خواتین افسانہ و ناول نگاروں کے ساتھ ساتھ شاعرات بھی بڑے شد و مد کے ساتھ اردو ادب کو نئی جہتوں کے ساتھ ہم کنار کرنے میں اپنا حصہ ادا کر رہی ہیں۔ واجدہ تبسم اور ذکیہ مشہدی اس دور کی دو اہم ادیبائیں ہیں۔

واجدہ تبسم کے ناول اور افسانے گو ایک مخصوص تہذیبی اور معاشرتی پس منظر میں لکھے گئے ہیں، تاہم موضوعات اور زبان و بیان کے اعتبار سے خواتین اردو ادب میں ایک منفرد اور بے باک رجحان کا اعلان کرتے ہوئے منظر عام پر آئے ہیں۔ ان کی تحریروں میں سماجی اور معاشی دباؤ میں کچلی، پسی عورتوں کی نفسیات، ذہنی رجحانات اور ذاتی ردِ عمل (individual response) کی مکمل عکاسی نظر آتی ہے۔

ان کے مشہور افسانے 'اترن' میں تاریخی، سماجی اور معاشی جبر کی شکار ایک الھڑ، نازک لڑکی کی نفسیات اور جبر کے خلاف اس کا ردِ عمل پوری طرح سامنے آتا ہے۔ یہ افسانہ تاریخی، سماجی، ثقافتی اور نفسیاتی اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ یہ افسانہ

نوابین کی نجی زندگیوں، ان کی اپنی پروردہ قدروں اور سماج کے مجبور طبقوں پر ان کے استبداد کی تصویر کشی کرتا ہے۔ یہ تصویر کشی واجدہ تبسم کی تحریروں کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ افسانہ 'اُترن' کے یہ مختصر اقتباسات ملاحظہ ہوں :

"چمکی کا روتا ہوا حسن نارنجی جوڑے میں اور کھل اٹھا تھا۔ یہ جوڑا وہ جوڑا تھا، جو اسے احساسِ کمتری کے پاتال سے اٹھا کر عرش کی بلندیوں پر بٹھا دیتا تھا۔ یہ جوڑا کسی کی اترن نہیں تھا۔ نئے کپڑوں سے سِلا ہوا جوڑا، جو اسے زندگی بھر میں ایک ہی بار نصیب ہوا تھا ورنہ ساری عمر تو شہزادی پاشا کی اترن پہنتے ہی گزری تھی اور اب چونکہ جہیز بھی تمام تر اُن کی اترن ہی پر مشتمل تھا، اس لیے باقی کی ساری عمر بھی اُسے اترن ہی استعمال کرنی ہوگی۔"

ستم ظریفی تو یہ ہے کہ نواب زادی کی خادمہ 'چمکی' جو ساری عمر نواب زادی کی اترن پر بظاہر اتراتی پھرتی ہے، خود ایک سیّد زادی ہے۔ اس کا ردِ عمل ملاحظہ ہو :

"لیکن بی پاشا۔ ایک سیّد زادی کہاں تک پہنچ سکتی ہے۔ یہ تم بھی دیکھ لینا۔ تُمے ایک سے ایک پرانی چیز مجھے استعمال کرنے کو دیے نا اب تم دیکھنا......"

اس کے بعد خادمہ، سیّد زادی چمکی، تمام حشر سامانیوں کے ساتھ، ملیدے کا تھال اٹھائے، بی پاشا کے ہونے والے دولہا میاں کے ہاں پہنچ جاتی ہے۔ دولہا میاں کا طرزِ عمل اور چمکی کا ردِ عمل ملاحظہ ہو :

"انھوں نے ڈرتے ڈرتے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا خالص مردوں والے لہجے میں، جو کسی لڑکی کو پٹانے سے پہلے خواہ مخواہ کی ادھر ادھر کی ہانکتے ہیں۔ لرزتے ہوئے اپنا ہاتھ شانے سے ہٹا کر اس کے ہاتھ کو پکڑتے ہوئے بولے: 'یہ تھال میں کیا ہے؟' چمکی نے قصداً اُن کی ہمت بڑھائی: "آپ کے واسطے ملیدہ لائی ہوں۔ رَت جگا تھا نہ رات کو!" اور اس نے تلوار کے بغیر انھیں گھائل

کر دیا۔ "مونہہ میٹھا کرنے کو۔" وہ مسکرائی۔

"ہم ملیدے ولیدے سے مونہہ میٹا کرنے کے خائل (قائل) نہیں ہیں...... ہم تو...... ہاں......" اور انھوں نے ہونٹوں کے شہد سے اپنا منہ میٹھا کرنے کو اپنے ہونٹ بڑھادیے اور چمکی ان کی بانہوں میں ڈھیر ہو گئی۔ ان کی پاکیزگی لوٹنے ___ خود لٹنے ___ اور انھیں لوٹنے کے لیے۔"

اس طرح سماج کی کچلی ہوئی سیّدزادی خادمہ چمکی، بی پاشا سے انتقام لیتی ہے۔

واجدہ تبسم نے مسلم سماج کے اس نوابی، اور استحصال کرنے والے طبقے کے نظام کو بے نقاب کر کے خاصی شہرت حاصل کی۔ انھوں نے ۱۹۶۰ء کے آس پاس لکھنا شروع کیا۔ ان کے افسانوں کے مجموعے 'شہر ممنوعہ'، 'آیا بسنت سکھی'، 'نتھ اترائی'، 'نتھ کا بوجھ' اور ناول 'نتھ کا غرور' خاصے مقبول ہو چکے ہیں۔ استحصال کرنے والے طبقوں کے وضع کردہ اصول اور روایتیں، جن کا تعلق اور براہِ راست اثر خواتین پر ہے، واجدہ تبسم کے تیروں کا نشانہ ہیں۔ یہ دکھ کی بات ہے کہ واجدہ تبسم اب خواتین اردو ادب کے منظر نامے پر زیادہ دکھائی نہیں دے رہی ہیں۔

ذکیہ مشہدی تقریباً تین دہائیوں سے افسانے لکھ رہی ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے 'پرائے چہرے' اور 'تاریک راہوں کے مسافر' شایع ہو چکے ہیں۔ وہ نہ صرف نفسیاتی بلکہ سماجی اور سیاسی موضوعات پر بھی بڑی بے باکی سے لکھ رہی ہیں۔ ان کے تازہ افسانے 'افعی' میں بابری مسجد کے المناک انہدام، ملک میں فرقہ پرست سیاسی فرقوں کے احیاء اور بالادستی اور ملک پر اِن واقعات کے مہلک اور دور رس اثرات کا ایک غیر جانبدارانہ جائزہ لیا گیا ہے۔

ذکیہ مشہدی 'شجر ممنوعہ' پر یقین نہیں رکھتی ہیں۔ وہ پدر سری سماج اور ادب میں اس نکتہ نگاہ سے وضع کردہ موضوعات کی پابندیوں سے آزاد ہیں۔ پدر سری سماج میں عورتوں کی بے وفائی کو تو مرد حضرات نے لکھ لکھ کر اور کہہ کہہ کر ایک ضرب المثل کی حیثیت دی ہے لیکن خود مرد حضرات کی بے وفائیوں کو ایک تسلیم شدہ سماجی قدر

(social value) کا درجہ دیا گیا ہے جس کو جھیلنا عورت کے فرائض میں شامل کیا گیا ہے۔ اپنے ایک بے باک افسانے 'چرایا ہوا سکھ' میں ایک شادی شدہ مرد ایک شادی شدہ عورت کی طرف تھوڑی دیر کے لیے ملتفت ہو جاتا ہے۔ کہانی بالآخر مرد اور عورت کے جسمانی اختلاط پر ختم ہو جاتی ہے۔ کہانی کا اختتامیہ مصنفہ کی زبان سے ملاحظہ ہو :

"بڑی حیرت سے آنکھیں پٹپٹا کر اجیت نے سوچا کہ یہ عورت اُسے اِس قدر انوکھی، اچھوتی، آسمان سے اتری ہوئی مخلوق کیوں معلوم ہو رہی تھی۔ یہ عورت جو کسی بھی عام عورت سے الگ نہیں ہے ـــــ کیا یہ چرایا ہوا سکھ اپنا سے ملنے والے سکھ سے کچھ الگ تھا؟ حساب لگایا تو سارے جمع، ضرب، تقسیم کا جواب ایک ہی آیا۔ پھر بھلا چھ مہینوں سے اس نے اپنی نیندیں کیوں حرام کر رکھی تھیں؟ محض بند لفافے کو کھولنے کے لیے؟ ایک بیمار سے تجسّس کی تسکین کے لیے؟ یا اس لیے کہ وہ ایک ناقابلِ حصول شئے معلوم ہوتی تھی اور اجیت کے لیے ایک چیلنج۔"

(افسانہ : چرایا ہوا سکھ)

موضوع اور زبان وبَیان کے اعتبار سے، مرد کے احساسات اور نفسیات کا مندرجہ بالا تجزیہ بے باک تو ہے ہی، مگر مصنفہ کی گہری نظر اور سنجیدہ سوچ کا سراغ بھی فراہم کرتا ہے۔ ذکیہ مشہدی اب بھی برابر لکھ رہی ہیں۔

پچھلی دو دہائیوں سے زاید عرصے میں کئی اور اردو ادیباؤں کی تحریریں منظرِ عام پر آئی ہیں۔ یہ تحریریں پڑھ کر ایک نئی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان تحریروں سے تاریخ اور سماج پر خواتین کے ایک نئے تجزیے کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ تحریریں خود عورت کی ازسرِ نو دریافت کی طرف ایک واضح اشارہ ہیں۔

نگار عظیم نئی نسل کی ان چند افسانہ نگاروں میں شامل ہیں جو ترقی پسند تحریک سے خاصی متاثر نظر آتی ہیں۔ اپنے بیشتر افسانوں میں وہ نچلے متوسط طبقے کے مسائل کا

جائزہ لینے کی کوشش کرتی ہیں۔

غزال ضیغم کا شمار ان ہی خواتین افسانہ نگاروں میں کیا جاسکتا ہے، جو اپنی تاریخ، تہذیب، سماجی و ثقافتی وراثت اور اقدار کا از سر نو جائزہ لے کر انھیں اپنے تجزیوں کی روشنی میں جانچنے کی کوشش کرتی ہیں۔ان کے افسانوں کا مجموعہ 'ایک ٹکڑا دھوپ کا' شایع ہو چکا ہے۔اس مجموعے میں شامل افسانوں میں 'بھولے بسرے لوگ' 'سوریہ ونشی چندر ونشی' ان کی مخصوص سوچ اور فکر کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کا اندازِ بیان سادہ اور دلچسپ ہے۔ان کی تحریریں ان کے روشن مستقبل کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

آشا پربھات کا ایک ناول 'دھند میں اگا پیڑ' شایع ہو چکا ہے۔وہ افسانے برابر لکھ رہی ہیں۔ان کی کہانیاں سماجی نوعیت کی ہیں۔زبان پر توجہ کی گنجائش کے باوجود وہ اپنی تحریر میں خواتین کے استحصال کی، ان کا تعلق خواہ کسی بھی سمت سے ہو، دلچسپ انداز میں برابر نقاب کشائی کرتی ہیں۔

قمر جمالی، ڈاکٹر شمیم نکہت، شہناز کنول، فرحت جہاں، کہکشاں پروین، قمر جہاں، ذکیہ ظفر اور مبینہ امام وغیرہ اپنی تخلیقات سے خواتین اردو ادب میں اضافہ کر رہی ہیں۔

ادب کی تخلیق ایک مسلسل کاوش ہے۔اردو کی کئی ادیبائیں تقسیم ملک کے بعد ہندوستان کو خیر باد کہہ چکی ہیں۔ کچھ ادیبائیں اپنے ادبی سفر کو ادھورا چھوڑ کر زندگی کی دوسری مصروفیات میں کہیں کھو گئی ہیں۔رفیعہ منظور الامین کے دو معروف ناول 'عالم پناہ' اور 'ایک جہاں اور بھی ہے' شایع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔بعد میں وہ بھی اردو کے ادبی منظر نامے سے ہٹ گئیں۔ ممتاز شیریں، جن کی کہانی 'انگڑائی' (عصمت چغتائی کے 'لحاف' کی طرز پر) مشہور ہو گئی تھی، تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلی گئیں۔ یہی حال ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کا تھا۔ سرلا دیوی نے تقسیم ملک اور فرقہ وارانہ فسادات کے پس منظر میں کئی لاجواب کہانیاں تحریر کیں۔افسوس کہ موت نے انھیں زیادہ مہلت نہیں دی۔

اردو نثر میں اردو ادیباؤں نے بیسویں صدی کی پہلی دو یا تین دہائیوں میں اپنی ایک مخصوص پہچان بنالی تھی، لیکن شاعری کے میدان میں تقریباً چار دہائیوں تک کوئی قابلِ ذکر شخصیت نظر نہیں آتی ہے۔ یہ کچھ عجیب بھی لگتا ہے۔

ادا جعفری، جنھیں حمایت علی شاعر نے جدید اردو شاعری کی 'خاتونِ اول' کہا ہے، اردو شاعرات میں پہلا اہم نام ہے۔ ادا جعفری، پہلے ادا بدایونی کے نام سے لکھتی تھیں۔ انھوں نے بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے آخر میں، لگ بھگ ۱۹۳۶ء کے آس پاس اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام 'میں ساز ڈھونڈتی رہی' ۱۹۵۰ء میں شایع ہوا۔ اس کے بعد ان کے تین اور مجموعے 'شہر درد'، 'غزالاں تم تو واقف ہو' اور 'سازِ سخن بہانہ ہے' شایع ہوئے۔ اپنے ایک ردِ عمل میں ادا جعفری نے اپنی شاعری کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کیا ہے :

> "شاعری کے اندر شخصیت ضرور آتی ہے، لیکن بنیادی اور اہم بات یہ ہے کہ جو شعر کہا گیا ہے اس میں شعریت ہے یا نہیں۔ میں نے مردوں کی عائد کردہ پابندیوں کو قبول نہیں کیا، بلکہ میں نے ان پابندیوں کو قبول کیا جو میرے ذہن نے مجھ پر عائد کی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ بات کو بین السطور میں کہنا زیادہ مناسب ہے، کیونکہ رمز و کنایہ بھی تو شاعری کا حسن ہے۔"

(ماہنامہ شاعر، جنوری ۱۹۹۹ء)

یہ خود کردہ جائزہ (self assessment) ہی ادا جعفری کی شاعری کا خلاصہ ہے۔ ان کے موضوعات روایتی نہیں ہیں، ان کے موضوعات اور اظہارِ سخن میں ایک جدت ہے۔ ان کے استعاروں اور تلمیحات میں ایک پُر وقار رنگینی ہے۔ انھوں نے خود ایک جگہ لکھا ہے کہ "مجھے اپنی روایات جتنی عزیز ہیں، روایتوں سے بغاوت بھی اتنی ہی عزیز رہی ہے۔" (سازِ سخن، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی)

ملاحظہ ہو :

دیکھ لو نکہتِ رائیگاں
آج محفوظ و مامون ہے
ہر گلِ تر کو تم سے معنون کیا
میں نے خوشبوئے رفتہ کو اپنا لیا
پیرہنِ تار تار، انگلیاں خونچکاں
اپنا مسلک مگر برتر از جسم و جاں
کند ہوتے نہیں دردِ احساس کے نیشتر
دل کو پھر بھی نہیں خواہشِ در گزر
جو خطا آج تک مجھ سے سرزد ہوئی
اس خطا سے مجھے آج تک پیار ہے
ان رہوں میں کوئی میں اکیلی نہیں
اور آشفتہ سر ساتھ ہیں
وہ جو غیروں کے پتھراؤ پر ہنس پڑے
اور اپنوں کے پھولوں سے زخمی ہوئے

(اعتراف : شہر درد)

ادا جعفری کے کلام میں خود آگہی اور خود اعتمادی ہے۔ وہ اپنی نسائی شناخت کا اعلان نہیں کرتی ہیں، بلکہ یہ شناخت خود بخود ایک وقار اور تمکنت کے ساتھ ان کے کلام میں ابھر کر سامنے آتی ہے ؂

حرفِ آغاز بھی میں، نقطۂ انجام بھی میں
کل کی امید بھی میں، آج کا پیغام بھی میں

ان کے استعارے ایک نسائی شناخت کے ساتھ یوں سامنے آتے ہیں :

میں تو خود خالق و کوزہ گر و صناع بنی
شہربانو بھی میرا نام رہا، مریم بھی

روایات کے احترام کا اظہار وہ سلیقہ مندی سے یوں کرتی ہیں :

پتھر کو جانتے تھے، مگر پوجتے رہے
اہلِ وفا تھے اور مروّت کی بات تھی

شفیق فاطمہ شعریٰ نے بیسویں صدی کی پانچویں دہائی کے آس پاس اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ انھوں نے جلد ہی اپنی انفرادیت کی بنا پر اردو شاعری میں اپنا ایک مخصوص مقام پیدا کیا۔ ان کی شاعری، زبان و بیان اور تلمیحات و مرکبات کے لحاظ سے غیر معمولی اور مختلف ہے۔ ان خصوصیات کی بنا پر ان کی شاعری ایک عجیب اَسراریت کا تاثر چھوڑ جاتی ہے۔ ان کے شعری مجموعہ 'آفاقِ نوا' کا پیش لفظ ان کی تخلیقی سوچ اور ایک جداگانہ انفرادیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو :

شاعر کا من
کسی ایسے دلیرانہ۔ ڈھیٹ اقدام پر
للچا اٹھتا ہے
جیسے کہ
گھاس پھوس اور پتوں سے ڈھکا گڑھا
اپنی پیش قدمی سے پاٹنا
یہاں تک کہ درختوں کے پیچھے سے
سِدھائے ہوئے ہاتھیوں کے غول بر آمد ہوئے
اب صدیوں تک ہم جو کچھ بھی لکھیں گے
وہ ایسا ہو گا
جیسے صدیوں سے زمینیں
بنجر پڑی ہیں
اختتام
کارہائے مابہ پایاں نارسیدہ
درد و داغِ آرزو، درماں نہ دیدہ"

شفیق فاطمہ کی شاعری میں عربی، فارسی اور ہندیؔ الفاظ کی ایک دلچسپ آمیزش ملتی

ہے۔ لیکن یہ آمیزش لفظوں کا محض استعمال نہیں ہے اور نہ ہی شاعری میں نامانوس الفاظ جوڑنے کی کوئی زبردستی کی کوشش ہے۔اس کا ایک باقاعدہ تسلسل نظر آتا ہے اور یہ تسلسل کسی ٹھوس بنیاد پر قائم ہے۔ان اشعار سے ان کے فلسفیانہ ذہن کے گوشوں تک رسائی ممکن ہوتی ہے :

"جب کوئی نہ ہو
جب سایۂ شاخِ گُل افعی بن کر رینگے
ہر آہٹ کے نادیدہ ہاتھ میں چاقو کا پھل کھلا
رہ رہ کر چمک اٹھے

تب کون ہے یہ
شانے پر نرمی سے رکھا جانے والا
ایک ہاتھ ...... کہیں یہ
خسرو کا نغمہ تو نہیں
ایک پل سنجوگ زمانوں کا
جانوں کا اور ارمانوں کا
جھرنا بن کر پتھر سے پھوٹ پڑا
یہ اپنی آنکھیں
کتنے دُور دراز زمانوں میں
کھل سکتی ہیں
پانی اس چھاؤں کا ٹھنڈا یخ
پانی میں بسی کوزہ کی سگندھ

(شہر نوا)

شفیق فاطمہ شعریٰ کی شاعری میں ایک بامعنی ابہام ہے۔ یہ ابہام جو میراجی اور ن۔م۔راشد کی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ یہ ابہامِ فاطمہ شعریٰ کی شاعری کو ایک نیا حسن عطا کرتا ہے

ہم ہیں تو یہی غنیمت ہے
ہم ہیں تو زندہ ہے وعدوں کا اگم
موجوں کے بعد اُبلتی موجوں کا دھارا
جو فراموشی کے ریگستان میں بہتا ہے
اس کی راہیں پہلے ہی سے مقرر ہیں
اور ان سے ہٹ کر کوئی راہ نہیں
سنگین سچ کی پتھریلی زمینوں میں
ارمانوں کا زرّیں کہرا بکھراتا
سچ کے سوتوں سے پھوٹتا رنگین جھوٹ
سچ کا ساگر کھوجتا، شیریں جھوٹ

(ارضِ موعود)

شفیق فاطمہ انسان کے روحانی سفر اور تاریخ کی دھاراؤں کو اپنے ذہن و دل میں جذب کر کے انھیں اپنے مخصوص اندازِ بیان اور اسلوب میں، اپنی نظموں میں نہایت خوبصورتی سے پیش کرتی ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کی طویل نظم 'شفیع الامم' کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ یہ بند ملاحظہ ہوں :

"ادھڑتے ہوئے پیرہن سے
جھلکتے ہیں تانبے کے شانے
تو ان کی دُکھن چیخ چیخ اُٹھتی ہے
"یادداشت!
صلیبوں میں اے سب سے بھاری صلیب
کہیں اس سے بہتر یہ ہوتا
کہ خم، شہ رگوں کے وہیں کھول دیتے
اگر وقت نوروز بنتا ہمارے لیے
تو اقوامِ عالم کی ہوتی یہ باری

کہ ڈھوئیں سدا کو عذابِ حیات۔"

اِسی نظم کا یہ بند اُن کے تاریخی اِدراک اور حساس ذہن کا آئینہ دار ہے :

اگر جنسِ بازار ہوتیں مرادیں
توجاں کے عوض مول لیتے
مگر کب شکستِ عزائم سے ہوتی
چکاچوند عرفانِ حق کی
جو صد سالہ شب زندہ داری سے ممکن نہیں
بہت یوں تو دانا تھیں بینا تھیں آنکھیں
بہت یوں تو دانا تھیں بینا تھیں
دارا تھیں، گیرا تیں آنکھیں
سکوں کی گھنی چھاؤں تھیں دردمندی کا دریا تھیں
صدق و صفا کا ذخیرہ تھیں آنکھیں
مگر یہ پہاڑی کے دامن میں پتھریلے کنڈ
نہ جانیں ابلنا، مچلنا، نہ شورش میں ڈھلنا
تحمل کی شاموں میں گہرائیاں
اور گہری ہوئیں اور گہری
کبھی ہلکی ہلکی گلابی سنہری
کبھی ارغوانی الاؤ
چکاچوند عرفانِ حق کی

(شفیع الامم)

شفیق فاطمہ شعریٰ کی شاعری کا ابہام اور اَسراریت ان کی شاعری کا حسن ہیں۔ لیکن کہیں کہیں پر یہ ابہام قاری کے ذہن کو الجھادیتا ہے اور کہیں ان کی شاعری پڑھ کر ایک ایسی پینٹنگ کا گمان ہوتا ہے، جس کے معنی ڈھونڈنے کھوجنے میں ساری عمر نکل جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ان کے شعروں کا ایک اور مجموعہ 'گلہ صفورہ' بھی

منظر عام پر آگیا ہے۔

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی سے جو ترقی پسند تحریک کے زوال (decline) کا دور تھا، خواتین کی شاعری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ ساجدہ زیدی اور زاہدہ زیدی نے اپنی شاعری کا آغاز اسی دور میں کیا۔

ساجدہ زیدی کی شاعری کے محرّکات ان کے اپنے الفاظ میں یوں ہیں :

"ایسی دنیا میں کسی منصب، کسی عظیم سچائی کی تلاش، کسی عبادت کے بغیر کوئی کیسے جئے......؟ میری شاعری میرے اسی روحانی کرب کا اظہار ہے۔ اس کیفیت سے وہی لوگ واقف ہوں گے جنھوں نے اپنے باطن کی آواز پر لبیک کہا ہے، جنھوں نے شاعری یا کوئی بھی تخلیق، کوئی بھی کام عبادت کی سی محویت سے کیا ہے...... حور و قصور والی عبادت نہیں، بلکہ دل کے نہاں خانے میں ایمان کی جوت جگانے والی عبادت۔ ایسی عبادت جس میں حسین ابن علیؑ کی شہادت کا عکس ہو۔ عیسیٰ مسیح کی صلیب کا کرب ہو۔ غارِ حرا کی محویت کی روشنی ہو۔"
(پیش لفظ : آتش زیرپا)

کوئی ادیب یا شاعر اپنے عہد کی مروّجہ ادبی اقدار اور اس منظر نامے سے اپنے آپ کو بالکل الگ نہیں رکھ سکتا۔ ان کے اثرات کم و بیش ہی سہی، وہ قبول تو کرلیتا ہے۔ اسی تناظر میں ساجدہ زیدی کی شاعری میں غمِ حیات اور غمِ دوراں، دونوں رنگ نظر آتے ہیں۔ ان کے اندازِ بیان اور تشبیہات کے ایک جداگانہ استعمال نے ان کی شاعری میں جو رنگ بھر دیے ہیں، اس نے ان کی شاعری کو ایک الگ اور اپنی ایک منفرد صورت بخشی ہے۔ یہی انفرادیت ان کی پہچان ہے۔ ملاحظہ ہو :

"ہم نے کیا کیا نہ اس جلتی ریتی کو
ہاتھوں میں بھرنے کے حیلے کیے
ریت میں گل کھلانے کے سرکش وسیلے کیے

رُک کے دیکھا ــــ تو جانا کہ
الفاظ خاموش ہیں
معنیٰ بے بدل، آسمانوں زمینوں میں روپوش ہیں
نغمۂ جاں فزا گنگ ہے
رقصِ جاں پا شکستہ ہے...... اندازِ جلوہ نمائی
دیواروں میں محبوس ہے
اور ہم
بے خطر ــــ جلتی آنکھوں کی جیوتی لٹاتے رہے
ہر قدم ــــ عافیت کا اثاثہ گنواتے رہے

(یہ زماں یہ زماں)

ساجدہ زیدی کی ذہنی کیفیات ذاتی حدوں سے پھیل کر آفاقی حدوں کو چھوتی ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی شاعری میں ذات و کائنات دونوں کے پرتو دکھائی دیتے ہیں :

میں شاید
انفس و آفاق کے سرِّ نہاں میں
خود بھی شامل ہوں
اسی اسرار کا جزو لاینفک ہوں
ایک ذرّہ ہوں
لیکن وسعتِ صحرا کی حامل ہوں

(جستجو ذات کی)

ساجدہ زیدی کی شاعری میں انسان کی بے بسی اور زندگی کی جدوجہد کی بے معنویت بھی نظر آتی ہے۔ وجودیت کی دل شکن حقیقتوں کے سامنے خواب چکنا چور نظر آتے ہیں :

جب گزار آئے اک عمر غم پیرہن
جب سنوار آئے گیسوئے ہستی، شکن در شکن

جب تلاشِ صداقت میں دے آئے ہم
نطق و لب، جان و تن
تب کھلا ہم پہ یہ عقیدۂ دل شکن
کہ ......

لوحِ ہستی پہ تحریر، اسرارِ جاں، رائیگاں
بے مقدر زباں، سحر صرف و بیاں، رائیگاں
جوہرِ ہر نفس، بر زمین و زماں، رائیگاں

(عرصۂ بال و پر رائیگاں)

ساجدہ زیدی کی شاعری زندگی کے تقریباً ہر پہلو سے متاثر نظر آتی ہے۔ 'دعائے نیم شب' میں ان کی ممتا کا سمندر لہریں مارتا نظر آتا ہے تو 'ہر کربلا کے بعد' اور 'سالِ اطفال' اور 'سیاسی بازیگر' میں 'اقوامِ جابر' اور کرسی نشینو(ں)' کے ضمیر کو بالترتیب للکارا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو :

جن کی باتوں میں تجلی تھی، خموشی میں طلسم
وہی اربابِ ہنر سوختہ جاں دیکھے ہیں

اور

جلتے بام و در و دیوار، سلگتے ہوئے شہر
جن سے پتھرا گئیں آنکھیں، وہ سماں دیکھے ہیں

ساجدہ زیدی کے اندر جو لاوا ہے، وہ ان کی شاعری کے توسط سے وقفے وقفے سے ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ ان کی شاعری کے مجموعے 'جوئے نغمہ'، 'آتشِ سیال'، 'سیلِ وجود' اور 'آتشِ زیرپا' شایع ہو چکے ہیں۔

زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی کی ہم عصر شاعرہ ہیں۔ زاہدہ زیدی کے موضوعات، اندازِ بیان، تلمیحات و تشبیہات کے لحاظ سے ان کی شاعری میں فلسفیانہ اور کہیں کہیں پر عارفانہ رنگ نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری کا ابہام، قاری کو الجھائے بغیر، اپنے جال میں لپیٹ کر اسے غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

زاہدہ زیدی انفرادیت پر اصرار کرتی ہیں۔ یہ انفرادیت، جو ہر حال میں مدغم ہونے سے انکار کرتی ہے :

"تلاطم کا محبس
وہ قطرہ
سمندر کی جانب بڑھا
(وصال
ہر جسم سیال کا ہنستا)
سمندر نے آغوش وا کی
تلاطم کا مرکز ــــــ سمندر
بھی قطرہ تھا
تھی جس کو
اک بیکراں بحر کی آرزو......
سمندر نے قطرے کو گوہر بنایا
اپنی گہرائیوں میں چھپایا
.........اور
بیتاب موجوں کے پہلو میں
وہ منجمد جسم
تنہا رہا......

(وصل)

زاہدہ زیدی کا ابہام خوشگوار ہے اور ان کے استعارے معانی کے بحر ذخار، تاریخ کے گزرتے ہوئے عمل، جس میں تمدن، تہذیبیں، حتیٰ کہ شہر تک تہہ و بالا ہو کر رہ جاتے ہیں، زاہدہ زیدی اپنی نظم 'تخریب کے بعد میں' اس عمل کو یوں شعروں میں ڈھالتی ہیں :

یہیں مٹا تھا
وہ شہر رعنا
یہیں بجھے تھے
وہ سب جگمگاتے ہوئے دریچے
یہیں وہ نغمے
بکھر کے
خاموشیوں میں تحلیل ہو گئے تھے
یہیں وہ اصنامِ مرمریں
ریزہ ریزہ ہو کے
ریت کا ڈھیر ہو گئے تھے

اس نظم کا آخری بند ملاحظہ ہو :

نرم لہرو
اب اس بلند پیکر کا عکس
اپنے شفاف سینے میں
جذب کر لو
—— سنہری کرنو
بس اک بار اور چوم لو
اس جراحت نصیب
کرب آشنا بدن کو
کہ کوئی زلزلہ
پھر زمین کی تہہ میں
پروان چڑھ رہا ہے

(تخریب کے بعد)

اس بات کا ذکر غالباً ضروری ہے کہ 'تخریب کے بعد' نظم میں شہر رعنا ایک استعارہ

بھی ہو سکتا ہے اور یہ شہر رعنا انسان کے اندر بسا ہوا اپنا شہر رعنا بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ بقول زاہدہ زیدی :

شعور و فکر سے آگے ہے چشمۂ تخلیق
ہٹے گا سنگ تو بہنے لگے گا پانی بھی

زاہدہ زیدی 'معانی' کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ خواہ وہ حیات کے معانی ہوں یا کائنات کے۔ ذہنوں کا اضطراب معانی سے ہمکنار ہوئے بغیر شانت نہیں ہو سکتا :

میں نے ڈھونڈا ہے
الجھی ہوئی جھاڑیوں میں اسے
تنگ غاروں میں
ٹھنڈے بگولوں میں
کالی خلاؤں میں
مبہم صداؤں میں
بے نام راہوں میں
کھنڈروں میں
چنگاریوں
سنگ پاروں میں
ڈھونڈا ہے میں نے اسے
مضطرب، منفعل
دامنِ لفظ میں
منہ چھپائے ہوئے

(معنی)

زاہدہ زیدی کی غزلوں میں شوخی بھی ہے :

تمھارے قصر تقدس کی خیر مفتیٔ شہر
نظر لباسِ تکلف اتار آئی ہے

اور :

وہ وقف ناز نہیں، میں وفا شعار نہیں
ہمارا عہدِ محبت بھی استوار نہیں

زاہدہ زیدی کا ادبی سفر خاموش ندی کی مانند جاری ہے۔ دو شعری مجموعوں 'زہر آب' اور 'دھرتی کا لمس' کے علاوہ ان کا تیسرا مجموعہ بھی منظرِ عام پر آچکا ہے۔

پچھلی دو دہائیوں سے زاید عرصے میں نئی شاعرات کی ایک پوری نسل نے نئے نئے تجربوں اور نئے نئے موضوعات لے کر اپنی ایک الگ شناخت بنائی ہے۔

رفیعہ شبنم عابدی کے دو شعری مجموعے 'موسم بھیگی آنکھوں کا' اور 'اگلی رات کے آنے تک' شایع ہو چکے ہیں۔ رفیعہ شبنم عابدی کے اندازِ بیان میں ان کی انفرادیت اور ایک الگ پہچان کا پرتو ہے :

مرے سخی! یہ فریب کا فن ہوا پرانا
چہکتی چڑیوں کے آگے رزق اور جال رکھنا

اور :

عمر بھر ذہن کے گم نام جزیروں میں رہی
بے گناہوں کی طرح میں بھی اسیروں میں رہی

بلقیس ظفیر الحسن کا ایک شعری مجموعہ 'گیلا ایندھن' شایع ہو چکا ہے۔ ان کی غزلیں اور نظمیں اردو کے اہم رسائل میں برابر شایع ہو رہی ہیں۔ ان کی تخلیقات ان کے روشن مستقبل کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ان کی نظم 'یسر لی امری' کا یہ بند ملاحظہ ہو :

مجھ کو معلوم ہے
وادیِ طور سے کوئی شعلۂ صدا
مجھ کو آواز دے میری قسمت نہیں
میری سونی ہتھیلی پہ وہ داغ جس سے

ضیا پھوٹ کر تیرگی چیر ڈالے
اجاگر نہ ہو گا کبھی
معجزوں والا کوئی عصا، مجھ کو بخشا نہیں جائے گا
اور یہ سُم بہ سُم بجلیاں۔ صف بہ صف سامری
زہر شعلے اگلتے ہوئے لہریے
راستہ دے نہ دے نیل، لیکن بتادے مجھے
میں کہ موسیٰ نہیں ___ پھر بھی فرماں روائی فرعون
تسلیم کیسے کروں ___ کیا کروں

رخسانہ جبیں پچھلی دو دہائیوں سے زاید عرصے سے اردو شاعری کو اپنی سنجیدہ اور ایک نئے آہنگ کے ساتھ مالا مال کر رہی ہیں۔ رخسانہ جبیں کے شعروں میں جدت ہے، ان کے استعارات اور تلمیحات میں گہرائی ہے۔ ان کی شاعری کی روانی ایک عجیب اور پُر سحر کیفیت طاری کرتی ہے۔ رخسانہ جبیں فطری طور پر غزل کی شاعرہ ہیں :

آنکھوں میں مری ابرِ رواں اور طرح کے
دل میں بھی کئی دشتِ تپاں اور طرح کے

اور :

اجداد وراثت میں گھٹن چھوڑ گئے ہیں
تعمیر کریں اب کے مکاں اور طرح کے

رخسانہ جبیں کے شعور میں پختگی ہے۔ ان کی سوچ میں ایک فلسفیانہ گہرائی ہے :

تمھاری سلطنت نیلے سمندر وسعتِ افلاک
کرم بادِ فنا سے مانگتی ہے میری مشتِ خاک

اور :

بہت شرمندہ ہے خنجر زمیں کو سونپنے والا
کہ اب فصلیں سروں کی کٹ رہی ہیں کھیت میں بے باک

اردو شاعرات کی نئی نسل میں پچھلی زائد ایک دہائی سے تانیثی رجحانات بڑی شدّت کے ساتھ سامنے آرہے ہیں۔ ان شاعرات میں شہناز نبی، عذرا پروین کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ یہ شاعرات اکثر و بیشتر نظم کی شاعرات ہیں۔ ان کے موضوعات اور اندازِ بیان میں ایک تانیثی ولولہ ہے۔ یہ شاعرات گرد و پیش پر نظر ڈالتے ہوئے ان پر اپنا ردِ عمل ظاہر کرتی ہیں۔ عذرا پروین کی نظم 'شرعی سرکس' اور شہناز نبی کی نظم 'معصوم بھیڑیں' اسی سوچ کو ظاہر کرتی ہیں۔ شہناز نبی کا ایک مجموعہ کلام شایع ہو چکا ہے۔ ان ناموں میں ایک اور نام شبنم عشائی کا بھی جوڑا جا سکتا ہے۔ کم و بیش ایک ہی طرح کے موضوعات پر لکھنے کے باوجود وہ اپنی تحریر کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ موضوعات کی وسعت انھیں ایک روشن مستقبل کی راہ پر گامزن کر سکتی ہے۔ شبنم عشائی کے دو مجموعہ کلام بھی شایع ہوئے ہیں۔ اردو شاعرات کا یہ قافلہ اردو ادب میں برابر گرانقدر اضافہ کر رہا ہے۔

آزادی کے بعد کی شاعرات میں داراب بانو وفا، سیدہ شانِ معراج، رعنا حیدری اور نور جہاں ثروت چند قابلِ ذکر اور نام ہیں۔

اردو شاعری کی نئی اور قابلِ غور آوازیں عفت زرین، شائستہ یوسف، پروین راجہ، آشا پربھات، سیدہ نسرین نقاش، اور اسنیٰ بدر زبیری ہیں۔ نئی نسل کی ان شاعرات سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ ان کے علاوہ بالکل نئی شاعرات میں قمر قدیر ارم، مسعودہ حیات، نسیم مخموری، شگفتہ طلعت سیما، کہکشاں تبسم، حنانہ برجیس، ریحانہ فریدی وغیرہ اردو شاعری کی آبیاری میں اپنا حصہ ادا کر رہی ہیں۔

ادھر کچھ اردو ادیباؤں نے خود نوشت سوانحی ناول تحریر کر کے اردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ ان میں نفیس بانو شمع کی خود نوشت سوانحی ناول 'جنت سے نکالی گئی حوا' ایک بے باک اضافہ ہے۔ یہ سوانحی ناول مسلمانوں کے نچلے متوسط طبقوں کے سماجی اور روزمرہ حالاتِ زندگی کا ایک ایسا آئینہ ہے، جس کو دیکھ کر عبرت حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح سعیدہ بانو احمد کی خود نوشت سوانح حیات 'ڈگر سے ہٹ کر'، تقسیم ملک کے بعد کے حالات کی تاریخ ہے۔ اور اردو ادب میں ایک باوقار،

سنجیدہ اور دلچسپ اضافہ ہے۔ تکنیکی وجوہات کی بنا پر ان تحریروں کو اس جائزہ میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔

خواتین اردو ادب کا یہ طائرانہ جائزہ قطعی طور پر ایک تنقیدی تجزیہ نہیں ہے۔ اس تصنیف کا بنیادی مقصد خواتین اردو ادب کی خاکہ کشی ہے۔ تجربہ سے یہ ظاہر ہے کہ اردو ادب کی کئی قابلِ ستائش تصانیف اب دستیاب نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے ساہتیہ اکادمی کا یہ اقدام قابلِ تحسین ہے۔

مجھ سے سہواً کسی قابلِ ذکر ادیبہ یا شاعرہ کا نام رہ گیا ہو، تو میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ یوں بھی میں نے ادیباؤں کے کوائف دریافت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ذاتی طور پر خطوط بھی لکھے اور بار بار ٹیلی فون پر رابطہ کرنے کی کوششیں بھی کیں۔ کچھ نے تعاون دیا اور کچھ نے اس طرح کی یاددہانیوں کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔

مجھے اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ اس طرح کے کام میں دعاؤں کے ساتھ ساتھ بددعاؤں اور 'خشت باری' کے لیے بھی تیار رہنا پڑتا ہے اور میں دونوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوں۔

(ترنم ریاض)

نذر سجّاد حیدر

نذر سجاد حیدر ۱۸۹۴ء میں علی گڑھ میں پیدا ہوئیں۔ وہ اردو ادب کے قافلے کی اوّلین معروف خاتون ادیبوں میں شامل ہیں۔ انھوں نے بیسویں صدی کی پہلی دہائی یعنی ۱۹۱۰ء کے آس پاس لکھنا شروع کیا۔ انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز بچوں کے ادب سے کیا۔ ۱۹۱۰ء میں انھیں بچوں کے مشہور ہفت روزہ 'پھول' کا مدیر مقرر کیا گیا۔ انھوں نے کئی ناول لکھے ہیں۔ جن میں 'آہِ مظلوماں' نے خاصی شہرت حاصل کی۔ اس ناول میں کثیر الازواجی (Polygamy) سے پیدا شدہ مسائل کو بے باکی سے ابھارا گیا ہے۔

نذر سجاد حیدر اُس دور کی خاتون سماجی اصلاح کاروں (Social reformers) میں پیش پیش تھیں۔ انھوں نے اپنی تخلیقات میں خواتین کے گھریلو اور سماجی مسائل کا جائزہ لینے کے ساتھ مسلم خواتین میں تعلیم کے رجحانات کو فروغ دینے اور توہمات کے خلاف ایک زوردار مہم چلانے پر زور دیا ہے۔ نذر سجاد حیدر کی تحریریں ناول کی مکمل تعریف پر بھلے ہی پوری نہ اترتی ہوں، اور پلاٹ کے اعتبار سے ان میں کہیں کہیں تسلسل کی کمی ظاہر ہوتی ہو، تاہم یہ تحریریں اُس دور کے مخصوص سماجی ماحول کی آئینہ دار ہیں۔ نذر سجاد حیدر کی بیشتر تحریریں اب دستیاب نہیں ہیں۔

اس مجموعہ میں شامل کہانی 'نجمہ' بالاقساط ماہنامہ 'عصمت' دہلی کے جولائی، ستمبر، نومبر اور دسمبر ۱۹۴۰ء کے شماروں میں شایع ہوئی۔ یہ کہانی ان کی نمائندہ تحریر سے زیادہ ان کے تئیں خراجِ عقیدت کے طور پر شامل کی جارہی ہے۔

نذر سجاد حیدر کا انتقال ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو بمبئی (ممبئی) میں ہوا۔

نذر سجاد حیدر

نجمہ

شام ہو چکی تھی۔ آج گھر میں سناٹا تھا، مسٹر و مسز حامد مع اپنے بھائی قمر کے ایک جگہ ڈنر پر جا چکے تھے۔ بیچارہ جمیل تنہا گھر پر رہ گیا تھا، کمرے میں پڑے پڑے اکتا گیا تو باہر آکر مسز حامد کے چھوٹے سے خوبصورت باغیچے میں پتھر کی بنچ پر بیٹھ گیا۔ چاند کی ٹھنڈی روشنی پھیل چکی تھی پھولوں کی خوشبو سے معطر ہوا چل رہی تھی۔ اس وقت ایک عجیب سماں تھا۔ بالکل تنہائی اور رات کی اداسی اور ایک اکیلا شخص یہاں اپنے خیالات میں مستغرق بیٹھا تھا۔ گھر کے لوگ دعوت میں تھے۔ سب ملازمین بھی کام ختم کر چکے تھے۔ انھوں نے اس وقت سلیپنگ سوٹ پر ایک گرم سوئٹر کوٹ پہن رکھا تھا۔ بال بے ترتیب پیشانی پر بکھر رہے تھے۔ وہ بنچ پر کہنی ٹیکے اپنے ہاتھ پر سر رکھے ہوئے نیچے کو دیکھ رہے تھے۔ قریب ہی کسی کے قدموں کی آہٹ معلوم ہوئی سر اٹھا کر دیکھا پھاٹک کی طرف سے سیاہ اوور کوٹ پہنے باغیچہ کی طرف ایک عورت آتی ہوئی نظر آئی۔ انھوں نے خیال کیا کہ شاید مسز حامد کی کوئی ملنے والی ہوں گی۔ جب قریب آئیں گی ان سے کہہ دیا جائے گا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ چند سیکنڈ میں یہ کہتی ہوئی وہ عورت بالکل ان کے قریب آگئی : ”معاف کیجیے، مسٹر قمر! میں ذرا بے وقت آئی

ہوں ہمشیرہ کہاں ہیں۔ میرا خیال تھا اس وقت وہ بھی یہیں ہوں گی۔ کیونکہ اکثر شام کو وہ باغیچہ میں ملا کرتی ہیں" یہ آوز سن کر جمیل چونک پڑے۔ آنے والی کی طرف دیکھا اور ایک دم کھڑے ہو گئے۔ مگر اس وقت ان کی عجیب حالت تھی۔ منہ سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔ دو تین منٹ تک جب آنے والی لڑکی کو کوئی جواب نہ ملا تو وہ بھی حیران سی ہو گئی۔ کبھی چاروں طرف دیکھتی تھی اور کبھی ان کی طرف۔ پھر کہا۔

"کیا مسٹر و مسز حامد گھر پر نہیں ہیں؟" جمیل نے بڑی ہمت سے کام لے کر کہا "جی نہیں۔ وہ لوگ آج کہیں ڈنر پر گئے ہیں۔ صرف میں ہی گھر پر ہوں۔"

"آپ ڈنر پر تشریف نہیں لے گئے؟"

"میری طبیعت کچھ ٹھیک نہ تھی۔" جمیل نے جوب دیا۔ "اچھا! آپ کی طبیعت کچھ ناساز ہے؟ بالکل تنہائی میں آپ نے کیسے وقت گزارا؟" لڑکی نے کہا۔

"میں تنہائی سے نہیں گھبراتا۔ میری تو زندگی تنہائی میں بسر ہو رہی ہے اور آئندہ ہو گی۔ کہیے آپ اس وقت کیسے تشریف لائیں۔ آپ تو مدت سے اس طرف نہیں آئی تھیں؟"

"جمیل صاحب میں بھی ایک ہفتہ سے بیمار ہوں۔ اس وقت چونکہ کوٹھی سے یہاں تک پیدل آنا ہوا اس لیے بہت تھک گئی ہوں۔ کیا میں تھوڑی دیر کے لیے یہاں بیٹھ جاؤں۔ ذرا تکان کم ہو جائے تو واپس چلی جاؤں گی۔"

جمیل نے کہا۔ "ضرور۔ آپ تشریف رکھیں۔ میں اندر سے کشن لے آؤں۔ یہ بنچ پتھر کا ہے۔"

"نہیں نہیں۔ آپ تکلیف نہ کیجیے۔ یہی ٹھیک ہے" اور بنچ پر بیٹھ گئیں۔ "میں بھی کئی ماہ سے تندرست نہیں۔ آج تو دن میں بخار بھی تھا۔" یہ کہہ کر جمیل وہیں بنچ کے پاس گھاس پر بیٹھ گئے۔ ان کے گھاس پر بیٹھا دیکھ کر وہ بھی اٹھ کر وہیں زمین پر بیٹھ گئیں۔ "اور اس وقت یہاں بیٹھنا بہت اچھا معلوم ہو رہا ہے۔ کیسی مخملی گھاس ہے لیکن آپ کو آج ٹمپریچر رہا ہے تو یہاں ٹھنڈ میں نہیں بیٹھنا چاہیے۔" لڑکی نے کہا۔

جمیل نے جواب دیا "اوہ۔ میں اتنی احتیاط نہیں کرتا۔ لیکن آپ کا رات کے

وقت گھاس پر بیٹھنا ٹھیک نہیں۔ اٹھیے پھر بنچ پر ہی بیٹھتے ہیں۔"" نہیں جمیل صاحب! یہاں بہت اچھا ہے۔ میں اپنا کوٹ اتار دیتی ہوں آپ گھاس پر بچھالیں تو ٹھنڈ کم ہو جائے گی۔" یہ کہہ کر انھوں نے اپنااوور کوٹ گھاس پر بچھادیااور بہت اصرار سے جمیل کو گھاس پر بٹھادیا۔ خود وہ عنابی جارجٹ کی ساڑھی پہنے تھیں جو سبز گھاس پر بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ جمیل اس وقت بہت حیران تھے کہ وہ اس قدر مہربانی سے کیوں پیش آرہی ہیں۔ آخرانھوں نے سوال کیا۔ "نجمہ صاحبہ! میں حیران ہوں کہ آج کیا دیکھ رہا ہوں کیاں یہاں بنچ پر میری آنکھ تو نہیں لگ گئی۔ میں یہ خواب دیکھ رہا ہوں؟ یا عالمِ بیداری ہے۔ تین ماہ سے میرا قیام مسوری میں ہے۔ اس عرصہ میں بارہا آپ کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہیں مسز حامد کے یہاں دو ملاقاتیں ہوئیں لیکن آپ نے مجھے کبھی سلام کرنے یا بات کرنے کا موقع نہ دیا۔ آج آپ کی تبدیلیٔ مزاج سے سخت متعجب ہو رہا ہوں۔ کیا میں اس کا سبب دریافت کر سکتا ہوں؟ آج یہ غیر معمولی عنایت کیسی؟ کیا آپ مسوری سے جارہی ہیں جو آخری ملاقات کا موقع دیا؟ اور اس وقت آپ تنہا کیوں ہیں۔ وہ خوش نصیب کامران کہاں ہیں؟"

جمیل کے ان سوالات پر مصیبت زدہ نجمہ سرنگوں ہو گئیں اور ایک ہاتھ پر سر ٹیک کر زمین کی طرف جھکالیا۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو جمیل اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے سامنے آبیٹھے اور پھر کہا۔ "شاید آپ کو میرے سوالات گراں گزرے۔ معاف کریں تھوڑا وقت ہے اور غالباً یہ آخری ملاقات ہے" نجمہ خاموش رہی تو جمیل نے کہا: "غالباً آپ کو نیند آرہی ہے۔ چلیے میں آپ کو آپ کی کوٹھی تک پہنچادوں۔" یہ سن کر نجمہ نے پہلے رومال سے اپنی آنکھوں اور چہرے کو پونچھااور سر اٹھایا۔ جمیل کی طرف عجیب حسرت زدہ نگاہوں سے دیکھ کر جواب دیا۔ "جمیل صاحب نہ مجھ کو نیند آرہی ہے اور نہ ابھی گھر جانا چاہتی ہوں مجھے تو بہت کچھ آپ سے بیان کرنا تھا۔ لیکن اب تابِ گویائی نہیں۔ اچھا پھر کسی دن سہی۔ ہاں۔ آپ کے سوالات کا جواب کیا عرض کروں۔ میں اس وقت اس طرف کیونکر چلی آئی میں خود حیران ہوں۔ دل کچھ پریشان سا تھا میرا خیال تھا تھوڑی دیر مسز حامد سے باتیں کر کے واپس آکر سو رہوں گی۔ یہ تو گمان

بھی نہ تھا آپ اب تک یہاں تشریف رکھتے ہوں گے۔ مگر جو ہوا اچھا ہی ہوا۔ اس عرصہ میں بارہا آپ کو دیکھا تھا لیکن بات کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی آج بھی اگر گھر کے لوگ ہوتے تو غالباً میں آپ سے بات نہ کر سکتی۔ میں ابھی مسوری سے نہیں جا رہی ہوں۔ لیکن آپ سے ایک بار ملنا ضرور چاہتی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ آج موقع مل گیا۔ میرے تنہا آنے کی بابت آپ کیا پوچھتے ہیں۔ آپ کے خیال میں اس وقت جن کو میرے ساتھ ہونا تھا وہ کئی دن سے مجھ سے نہیں ملے۔ میرا خیال ہے آج کل وہ مسوری میں نہیں۔ کسی ضرورت کی وجہ سے شاید دہرہ دون گئے ہوئے ہوں۔ سچ کہیے جمیل صاحب۔ آپ تو مجھ سے بہت ہی ناخوش ہوں گے؟ دراصل میں اس قابل بھی نہیں کہ آپ مجھ سے بات بھی کریں نہ میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ ہمیشہ مجھ سے دوستانہ تعلقات رکھ کر ملتے رہیں بس میری تو ہر طرح زبان بند ہے۔"

"نجمہ! میں بالکل تم سے ناخوش نہیں۔ بلکہ میں اکثر اوقات تمھاری آئندہ زندگی کے لیے دعا کیا کرتا ہوں۔ میں تمھیں خوش سننا چاہتا ہوں۔"

نجمہ نے مسکرا کر کہا "صرف سننا! دیکھنا نہیں چاہتے" "ہاں دیکھنا ذرا مشکل ہے۔"

نجمہ نے بھی یہی الفاظ دہرائے۔ "ہاں۔ بالکل درست۔ دیکھنا بہت مشکل ہے۔ اچھا کہیے آج کے بعد پھر کب مل سکیں گے۔" نہایت افسردگی کے ساتھ جمیل نے جواب دیا۔ "کیا بتاؤں۔ دل تو چاہتا ہے کہ بارہا ملا جائے۔ لیکن حالات کے مطابق ہمیں ایک دسرے سے ملنا نہیں چاہیے اور خصوصاً کامران کی بغیر اجازت ان کی غیر موجودگی میں تو بالکل ہی درست نہیں۔" نجمہ یہ سن کر پریشان ہو گئیں اور چلنے کے لیے اٹھیں۔ جمیل بھی کھڑے ہو گئے اور دونوں پھاٹک تک آئے تو نجمہ کہنے لگیں۔ "اچھا جمیل صاحب! آپ اس کا تو خیال نہ کریں کہ مجھے ان کی بغیر اجازت آپ سے نہ ملنا چاہیے۔ میں اپنے پہلے رشتہ داروں یا دوستوں کو ان کی وجہ سے نہیں چھوڑ سکی۔ اور نہ انھوں نے مجھ کو منع کیا ہے۔ اچھا کل آپ شام کو مسز سالومن کے یہاں تشریف لائیے۔ میں بھی وہیں آجاؤں گی۔"

"نہیں نجمہ! کامران کے پیچھے چھپ چھپ کر تم سے ملنا پسند نہیں کرتا۔ چلو تم کو کوٹھی تک پہنچادوں۔ نو بج رہے ہیں تنہا جانا ٹھیک نہیں۔"

"قمر! کیا جمیل صاحب کی شادی ہو گئی؟" بیگم حامد نے اپنے بھائی سے سوال کیا۔ جب کہ وہ اخبار کے مطالعہ میں محو تھے۔ کچھ جواب نہ ملنے پر انھوں نے دوبارہ پوچھا، تو قمر نے جیب سے ایک خط نکال کر بہن کو دے دیا جو یہ تھا :

پیارے قمر! غالباً تم کو یہ سن کر خوشی ہو گی کہ آخر کار میں والدین کا ایک ہی بیٹا ہونے کے جرم میں، باوجود سخت مخالفت، ضد اور کسی قدر بے ادبی کے پابند سلاسلِ متاہل کر دیا گیا۔ مگر میں بے حد رنجیدہ ہوں کہ بد عہد اور بے وفا خیال کیا جاؤں گا۔ گزشتہ ہفتہ کو عقد ہوا ہے، رسمِ رخصتی آئندہ ماہ میں قرار پائی ہے۔ امید ہے آخر نومبر تک آپ لوگ بھی مسوری سے اتر آئیں گے۔ اب تو غضب کی سردی ہو گئی ہے؟ میری طرف سے جناب باجی بیگم حامد صاحب و مسٹر حامد سے عرض کرنا کہ تمھارے ساتھ وہ دونوں اس رسم بے کار میں شریک ہو کر عزت بخشیں۔ غالباً ۲۲ دسمبر تاریخ گرفتاری ہے۔ تم ضرور سوال کرو گے کہ کہاں شادی ہو رہی ہے۔ سنو میرے چچا کی بیٹی ہے۔ دیکھی بھالی ہے۔ کہتے ہیں حسین ہے اور پرائیوٹ میٹرک پاس ہے۔ پردہ کی بھی پابند ہے، خدا میرے ساتھ خوش رکھے۔ بہت فکر مند ہوں، میں تو یوں گرفتار کیا گیا کہ میرے والدین کی قطع نسل نہ ہو۔ مگر وہ بیچاری بے گناہ ایک ایسے شخص سے وابستہ کر دی گئی، جس کو اس سے ذرا بھی محبت نہیں۔ اللہ یہ بیڑا پار کرے۔ دعا کرو۔

تمھارا جمیل

بیگم حامد نے اس خط کو دو تین بار پڑھا، اور بہت دیر سر پکڑ کر کسی سوچ میں پڑ گئیں۔ اب بھائی اخبار ختم کر چکے تھے۔ بہن سے بولے: "باجی جان یہ شادی کیسی ہوئی؟ شادی یا بربادی؟" "میں خود ہی سوچ رہی ہوں رات مجھے تمھارے اور جمیل

کے دوست رتن لال نے سنیما میں کہا کہ مبارک ہو وہ وحشی بھی اب انسان بن جائے گا۔ تم نے تو بتایا ہی نہ تھا۔" بیگم حامد نے جواب دیا۔ "آج صبح ہی تو یہ خط ملا ہے۔ رتن لال کے پاس پہلے آگیا ہوگا" قمر نے کہا۔ "نجمہ آج کل کہاں ہے۔ وہ اپنے ہونے والے شوہر سے بہت ناخوش تھی۔ تمھیں کہیں ملی ہے؟" بیگم حامد نے سوال کیا۔ "یہی تو غضب ہو گیا باجی جان۔ رات ہی سنا گیا ہے۔ کامران کمبخت نے اس کرسچن لڑکی سے شادی کرلی نجمہ سے قطع تعلق ہو گیا۔ ابھی نکاح تو ہوا ہی نہ تھا۔ نجمہ کئی روز سے نظر نہیں آئی۔ غالباً مسوری میں نہیں ہے۔ بیچارہ جمیل شادی کر کے زندگی سے بیزار رہے گا۔ اور وہ نا سمجھ لڑکی خدا جانے کیا کیا مصیبتیں اٹھائے گی۔"

یہ سن کر بیگم حامد نے بہت ہی افسوس کیا "کاش ابھی جمیل کا رشتہ نہ ہوا ہوتا۔ اگر جمیل کو علم ہو جاتا کہ نجمہ کا بیاہ کامران سے نہ ہوگا تو وہ ہرگز نہ کرتا۔ والدین کو منت و سماجت سے رضامند کر لیتا۔ آہ غریب بھولی نجمہ خودسری اور فیشن پرستی کا کیسا برا نتیجہ پایا۔ مسٹر و مسز سالومن نے اس کو تباہ کیا۔ اب کیا کرے گی۔ اپنے گھر والوں سے بھی شرمندہ اور دنیا میں بھی بدنام۔ حسب پسند رشتہ کا انتخاب کرنا لڑکی لڑکے کا اس باب میں خود مختار ہونا لازمی ہے مگر ایک حد تک۔ کامران کو وہ خود نہ جانتی تھی۔ سہیلی کے کہنے میں جمیل ایسا فرشتہ خصال انسان ہاتھوں سے کھویا اور پریشان ہوئی۔"

قمر نے کہا "باجی اب تو ہم لوگ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ جمیل کا نکاح ہو گیا۔ خدا جمیل کے دل میں اس لڑکی کی محبت دے کہ زندگی خوش گوار گزرے۔"

شکیل منزل کلکتہ کے پائیں باغ میں آج کوئی پردہ پارٹی تھی۔ شام کے سات بجے تک سب مہمان بیبیاں اور لڑکیاں رخصت ہو گئیں اور صاحب خانہ کی حسین و جمیل لڑکی شکیل آرا بیگم تنہا رہ گئیں تو انھوں نے باوجود سخت سردی کے اسی جگہ نماز مغرب ادا کی اور اس کے بعد سرخ شال اوڑھ باغیچہ کے ایک پتھر کے بنچ پر بیٹھ گئیں۔ ہاتھ میں خط تھا جس کو باغ کے لیمپ کے آگے کئی بار پڑھ چکی تھیں۔ وہ اس وقت کسی گہری سوچ میں بیٹھی تھیں کہ قدموں کی آہٹ معلوم ہوئی دیکھا سامنے سے

ان کا چچازاد بھائی جمیل آرہا ہے جس سے وہ اب پردہ کرتی تھیں۔ جمیل صاحب بہت تیز آرہے تھے۔ جلدی سے آگے بڑھے اور شکیل آرا کے قریب آکر کھڑے ہو گئے۔ شکیلہ نے اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ رکھ لیے اور رومال سے منہ چھپالیا۔ مگر جمیل صاحب نے ان کے دونو ہاتھ پکڑ کر رومال ہٹادیا اور خود وہیں زمین پر ان کے سامنے بیٹھ رہے اور کہا۔ "شکیلہ تم تو پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ ہم جیسے قریبی رشتہ داروں میں پردہ کیسا؟ اور اب تو ہم میں پردہ بہت ہی نامناسب ہے۔ ٹھیک طرح بیٹھو اور مجھ سے باتیں کرو۔" یہ سن کر لڑکی نے سر اونچا کیا اور شرماتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ سب صحیح ہے، لیکن جب بزرگوں کا حکم ہے تو اس کے خلاف نہیں کرنا چاہیے۔ ابھی کوئی آگیا تو کیا ہوگا؟" جمیل بولا "آجائے۔ مجھے پرواہ نہیں ہے۔ میں اس وقت اس لیے آیا ہوں کہ تم نے میرے خط کا جواب نہیں دیا تھا۔ سنا ہے تم بہت مغموم رہتی ہو۔ جس دن سے عقد ہوا ہے، ہر وقت روتی ہو۔ یہ حالات سن کر میں بدنصیب سخت پریشان ہوں، صرف اتنا معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ رنج و غم افسردگی آخر کیوں؟ تمھیں میرے حالاتِ زندگی معلوم ہیں، پہلے رشتہ سے بھی باخبر ہو مجھ کو اس سے بے حد محبت تھی، اس کی بھی رازدار ہو۔ آخر میری "بنت عم" ہو۔ (یہ لفظ "بنت عم" جمیل نے ذرا مسکرا کر کہا، جس پر وہ ہنس پڑیں) تاہم یہ بھی جانتی ہو کہ تمھارا ابن عم کوئی بدطینت انسان نہیں۔ شریف ہے۔ نرم دل ہے تمھارا ہمدرد ہے اس پر بھی رشتہ تمھیں ناپسند تھا تو ۱۵ دن قبل والدین سے کہلوادیا ہوتا۔ اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ بجائے رونے کے زندگی ہنس کر گزارنا چاہیے۔ شکیل آرا تم جس سے وابستہ کی گئیں وہ اس قدر برا نہیں ہے۔"

اپنے ہونے والے شوہر سے یہ باتیں سن کر شکیلہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ یہ تو تھے ہی شکستہ دل انھوں نے بھی ساتھ دیا۔ ۱۵ منٹ تک خاموش دونوں روتے رہے۔ شکیلہ اب بنچ سے اٹھ کر ان کے قریب گھاس پر آبیٹھی تھی۔ وہ اس وقت تک سرخ جارجٹ کی ساڑھی اور سرخ دوشالہ میں لال پری معلوم ہو رہی تھی، کانوں میں یاقوت مرصع کے بہت بڑے بڑے

آویزے دونوں گلابی رخساروں پر لٹک رہے تھے۔ وہ روتے روتے بے حال ہوئی جاتی تھی۔ جمیل صاحب کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ بچوں کی طرح چمکارتے بہلاتے، مگر شکیلہ سے صبر نہ ہوتا تھا۔ آخر وہ اس کو یہاں سے اٹھا کر بارہ دری میں لے گئے اور کوچ پر لٹا دیا۔ جب ذرا حواس بجا ہوئے تو پھر اس سے یہی سوال کیا۔ ”شکیلہ تمھارا جمیل اس قدر تو غالباً برا نہیں کہ تم اس سے بیاہی جانے سے اس قدر پریشان ہو۔ بتاؤ جو چاہتی ہو میں کرنے کو تیار ہوں۔ اگر میرے بجائے کسی اور سے رشتہ چاہتی تھیں تو وہ بھی بتادو۔ میں ہر طرح تمھارا خادم ہوں۔ ہمدرد ہوں، مددگار ہوں۔ گو نکاح نے ہم دونوں کو لوہے کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے، تاہم ہم دونوں مسلمان ہیں۔“ جمیل کے اس آخری فقرے پر شکیلہ بیتاب ہو کر رونے لگی۔ بہت دیر بعد کچھ سنبھلی تو سیدھی بیٹھ کر جمیل کے قدموں کی طرف جھک کر کہا: ”میں آپ کی بنت عم نہیں۔ اب ہمسری کا دعویٰ بھی نہیں ہے۔ شکیلہ آپ کی ادنیٰ کنیز ہے۔ مگر افسوس کہ آپ کے دل میں میری طرف سے بہت برے خیالات ہیں۔ آہ میں آپ کے اس حسن ظن کو برداشت نہیں کر سکتی۔ للّٰلہ یہ خیال دل سے نکال دیں۔“ جمیل نے پوچھا: ”کیسا خیال! شکیلہ صاف کہو۔ کونسا خیال؟“

”ایک تو یہ کہ میں آپ کے سوا کسی اور کی قدر کرتی ہوں۔ دوسرا یہ کہ ہم مسلمان ہیں۔ جمیل صاحب آپ مسلمان ہوں مگر میں ہندی لڑکی ہوں۔ میں الفاظ سن بھی نہیں سکتی۔ آپ مجھ کو پسند نہ کریں مجھ سے محبت نہ کریں۔ مگر میں تمام عمر پرستار کنیز ہوں۔“ جمیل نے کہا ”یہ خیال تو میرے دل میں یوں آئے کہ سنا جاتا ہے کہ تم نکاح کے دن سے برابر رو رہی ہو۔ کیا یہ غلط ہے؟“ شکیلہ نے کہا۔ ”غلط نہیں۔ درست ہے۔ مگر آپ غلط سمجھے ہیں، مجھ کو رنج یہ ہے کہ آپ اپنی پہلی قابلِ قدر اعلیٰ تعلیم یافتہ حسین منسوبہ کے رنج میں مبتلا ہیں اور شادی کرنا نہیں چاہتے، مگر ہمارے والدین زبردستی گرفتار کر رہے ہیں۔ اس حالت میں میری گزر کیسے ہو گی؟ میں نجمہ کے برابر قابل نہیں۔ حسین نہیں۔ مجھ سے آپ کی محبت نہیں۔ ورنہ خدا جانتا ہے کہ ایسا قابل نیک ”ابنِ عم“ جسے ملے وہ ناشکری کرے؟ مگر آپ کی قسمت پر افسوس ہے اور اس

خیال میں مری جاتی ہوں۔ خدا کرے مری خدمت و محبت و اطاعت آپ کو پسند آجائے اور آپ کا کچھ غم غلط ہو۔" شکیلہ کے یہ خیالات سن کر جمیل کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے کہا۔ "بھول جاؤ میرے گزشتہ حالات کو اور دعا کرو کہ میں بھی بھول جاؤں۔ میں اب تمھارا ہوں۔ جیسا کچھ بھی ہوں۔ تم خوشی سے قبول کرو۔ اللہ مجھ کو توفیق دے کہ تم کو خوش رکھ سکوں۔"

"بیگم خلیل صاحبہ یعنی والدۂ جمیل نماز مغرب کے بعد ابھی تخت پر ہی بیٹھی تھیں کہ اپنے بیٹے جمیل کو وہیں طلب کیا۔ وہ مسکراتے ہوئے آئے اور ان کے قریب یہ کہتے ہوئے بیٹھ گئے "کیا بات ہے آج آپ نے نماز پڑھتے میں یاد فرمایا۔" انھوں نے چیں بہ جبیں ہو کر جواب دیا "ہاں ایسی ہی بات ہے۔ شام سے بہت پریشان ہوں تمھاری نسبت ایسی خبر سنی ہے جس کی مجھ کو امید نہ تھی۔ پہلے جو کچھ ہوا ہو۔ تم نے سعادت مندی سے والدین کا حکم مانا اور چچازاد سے رشتہ کر لیا لیکن اب کچھ دن سے میں شکیلہ کو بہت پریشان سنتی تھی۔ مجھ کو یہ بھی معلوم ہے کہ تم کبھی کبھی اس سے مل لیتے ہو۔ خیر آزادی کا زمانہ ہے مگر آج شام میں نے یہ خبر سنی ہے کہ تمھاری پہلی منگیتر نجمہ یہاں آئی ہوئی ہے اور تم بار بار اس سے ملنے جاتے ہو۔ حیرت و افسوس ہے، تم جیسا نیک اور سمجھدار لڑکا نکاح ہو جانے کے بعد بھی اس سے ملنا جائز رکھے اور اس کی بھی تو منگنی یا شادی ہو چکی ہے صاف صاف کہو۔ کیا معاملہ ہے؟" ان سے یہ تقریر سن کر جمیل سکتے میں رہ گئے۔ سر جھکالیا اور خموشی کے ساتھ تخت سے اٹھ کر نیچے فرش پر دوزانو بیٹھے پھر والدہ کے قدموں کے پاس تخت پر سر رکھ دیا اور جواب دیا۔ "جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا بجا و درست ہے۔ بیشک میں ضرورت کے لیے کبھی کبھی شکیلہ کے سامنے چلا جاتا ہوں، کیونکہ وہ چچا اور خالہ کی بیٹی بھی ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ غریب نجمہ یہاں آئی ہوئی ہے اور میں بھی دو تین بار وہاں گیا۔ بلکہ پہلی دفعہ تو شکیلہ بھی میرے ہمراہ تھیں۔ اسی خیال سے کہ میرا تنہا جانا مناسب نہیں شکیلہ کو ساتھ لے گیا تھا۔ اماں جان آپ یقین فرمائیں۔ نجمہ سخت بیمار ہے۔ صرف اس کی خبر گیری کے لیے

میں گیا۔ کیونکہ وہ پردیس میں ہے۔ ورنہ ہرگز نہ جاتا اور میں سچ عرض کرتا ہوں کہ اگر آپ اس کی تیمارداری اور علاج کا انتظام کرادیں اور شکیلہ کبھی کبھی جاکر دیکھ آیا کریں تو میں ہرگز نہ جاؤں گا۔"

"یہ ٹھیک ہے کہ وہ بیمار ہے اور اس کی خبر گیری ہمارا فرض ہے لیکن تمھارے چچا خالہ خود شکیلہ وغیرہ کو ہمارا اس سے ملنا جلنا سخت ناگوار ہوگا اور یہ بہت بڑا معاملہ ہے۔" والدہ سے یہ سن کر جمیل کھڑے ہوکر بولے۔ "یہ تو بڑی دِقت ہے۔ میرا دخل نہ رہے لیکن اگر آپ کی طرف سے اس مریضہ کی مدد ہو تو چچا جان و خالہ جان کا کیا ہرج ہے۔ یہ مجھے کسی طرح گوارا نہیں کہ ہمارے شہر میں وہ لاوارث و بیمار پڑی ہو اور ہم کچھ مدد نہ کریں۔ یہ انسانی ہمدردی سے بعید ہے۔ شکیلہ پڑھی لکھی سمجھدار ہے۔ آپ کو کوئی برا خیال دل میں لانا گناہ سمجھنا چاہیے۔ رہے چچا و خالہ جان ان بیچاروں کو تو معلوم بھی نہیں ہو سکتا، اگر شکیلہ احتیاط سے کام لیں خود حوصلہ مندی سے اس کی خبر گیری کریں۔ وہ میرے خیالات سے بخوبی واقف ہیں۔ میں نجمہ سے ملنا نہیں چاہتا۔ مگر جب تک وہ بیمار ہے فرض سمجھ کر مدد کرنا انسانیت ہے۔" یہ کہہ کر جمیل باہر چلے گئے اور ملازم لڑکے کو بلا کر معلوم کیا کہ شکیلہ اس وقت کہاں ہیں۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنے اوپر والے کمرے میں نماز کے تخت پر سو رہی ہیں۔ یہ سن کر جمیل باغیچے والے زینے سے اوپر گئے دیکھا کمرے میں ہلکی سبز روشنی ہو رہی ہے اور واقعی شکیلہ چہرے پر آنچل ڈالے تخت پر لیٹی ہے مگر یہ چونکہ سونے کا وقت نہ تھا جمیل تخت کے قریب بیٹھ گئے اور آنچل اٹھا کر کہا۔ "اوہو نماز میں نیند آ گئی۔ اس وقت کا سونا کیسا اور یہ تو لیٹنے کی جگہ بھی نہیں ہے" منہ پر سے آنچل ہٹتے ہی شکیلہ فوراً اٹھ بیٹھی۔ "والدہ صاحبہ نے مجھے بلایا اور خوب ڈانٹا میری حرکات پر کہ میں نجمہ کے یہاں کیوں جاتا ہوں۔ ان کو یہ خبر کس نے پہنچائی؟ سچ کہو۔" شکیلہ نے اس کے جواب میں کچھ نہ کہا صرف اشکبار آنکھوں سے جمیل کی طرف دیکھا اور نگاہیں نیچی کرلیں پھر جمیل نے کہا "شکیلہ تم کو یہ زیبا نہ تھا۔ تم میری شریکِ زندگی و شریکِ رنج و راحت ہو۔ علاوہ اس کے محبت کرنے والی وفادار و ہمدرد بھی ہو۔ میری اس وقت کی سخت مشکلات پر نظر کرنی تھی۔ بخدا اگر

نجمہ بیمار نہ ہوتی تو میں ہر گز نہ جاتا اور پھر بھی تمھاری اجازت سے تم کو ساتھ لے کر گیا۔ دوسرے دن تم چپکے سے اپنا چور پکڑنے وہاں پہنچیں اور دراصل یہ گنہگار وہاں موجود تھا۔ تمھارا خیال درست نکلا مگر اللہ جانتا ہے کہ میں اپنی خوشی سے تنہا وہاں نہیں گیا تھا بلکہ نجمہ نے اکیلے بلایا تھا یہ معلوم کرنے کے لیے کہ پہلے دن وہ لڑکی آپ کے ساتھ کون تھی۔ اس کو شبہ ہوا تھا کہ تم میری ہونے والی بیوی ہو۔ بتاؤ اس میں میرا کیا قصور ہے؟" یہ سن کر شکیلہ سے خاموش نہ رہا گیا اور کرسی سے اٹھ کر جمیل کے سامنے کھڑی ہو کر کہنے لگی۔

"جمیل صاحب اس ناچیز کی نسبت آپ نے جس حسنِ ظن سے کام لیا اس کی میں مشکور ہوں۔ آج تک میرے دل سے وہی رنج و افسوس کم نہ ہوا تھا جو اس دن وہاں سے چلتے وقت آپ نے میرے کہنے کے غلط معنی سمجھے۔ واللہ میں نے سادے دل و سچی نیت سے عرض کیا تھا کہ اس شب ان کو بہت تکلیف تھی۔ آپ وہاں ٹھہر جائیں۔ اگر میں رہ سکتی تو تنہا چھوڑ کر ہر گز نہ آتی۔ اس ہمدردی کا یہ انعام ملا جو کچھ آپ نے سمجھا۔ میں نے خالہ جان پر ان واقعات کا اظہار نہیں کیا۔ ہوا یہ کہ شکیل بھائی جان کو کسی طرح یہ علم ہو گیا کہ نجمہ یہاں آئی ہوئی ہیں اور ہم دونوں وہاں جاتے ہیں۔ پہلے انھوں نے مجھ سے دریافت کیا جب میں نے اقبالِ جرم سے احتراز کیا تو انھوں نے خود تحقیقات کی۔ اُن کے گھر پہنچ کر ملازم سے سب پتہ لگالیا اور خالہ جان کے آگے سب کچھ بیان کر دیا۔ اور یہ آج ہی کا واقعہ ہے بغیر معلوم کیے آپ نے سب الزام میرے سر لگا دیے۔ افسوس ہے۔ کاش میں نے آپ کا حکم نہ مانا ہوتا تو بزرگوں کا عتاب نہ سہنا پڑتا۔ خیر جو مرضی مالک کی سب سہیں گے۔" شکیلہ کی یہ تقریر جمیل صاحب نے خاموشی سے سنی۔ ندامت و تاسف کے ساتھ وہ بھی اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے اور نہایت لجاجت سے کہنے لگے۔ "میں بے حد شرمندہ ہوں۔ معاف کر دو۔ مجھے یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا کہ شریر شکیل کو سب علم ہے اور اس نے اماں جان سے کہہ دیا۔ خیر اب تو جو ہونا تھا ہو چکا، چلو کل صبح ہم دونوں نجمہ کو دیکھ آئیں۔" "نہیں جناب مجھ میں آپ کا غصہ برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے، اس پر بزرگوں کی خفگی علیحدہ۔

آپ خوشی سے اکیلے جائیے۔ جب تک بیمار ہیں ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا (ہنس کر) ہاں جب وہ تندرست ہو جائیں گی تب ہم نگرانی کو ساتھ چلا کریں گے۔" جمیل نے جواب دیا "جب ان کو صحت ہو جائے گی تب مجھے جانے کی ضرورت ہی نہ ہوگی اور غالباً وہ یہاں سے چلی جائے گی۔" "اچھا تو آپ نے میری بابت ان کو بتادیا؟" جمیل نے کہا "ہاں بتانا پڑا کب تک چھپا سکتا تھا اور نہ اس کی ضرورت تھی۔ آخر انھوں نے بھی تو مجھ کو چھوڑ کر دوسرا رشتہ منظور کر لیا تھا۔ میں کیوں اپنی بیوی کو چھپاؤں؟" اتنے میں نیچے سے ملازمہ آئی اور کہا کھانا تیار ہے اور بیگم صاحبہ نے بلایا ہے۔

جمیل صاحب بھی اپنے گھر چلے آئے۔ کمرے میں پہنچے تو میز پر نجمہ کا خط رکھا دیکھا۔ ابھی کھولنے نہ پائے تھے کہ اندر سے کھانے کے لیے طلبی ہوئی۔ بے چارے بند ہی لفافہ جیب میں رکھ کر کھانے پر چلے گئے اور جب فارغ ہو کر پھر اپنے کمرے میں آئے۔ گھڑی دیکھی تو دس بج رہے تھے۔ فوراً لفافہ چاک کیا اور پڑھنے لگے۔

ڈیئر جمیل

دو دن سے آپ تشریف نہیں لائے۔ خدا جانے کیا سبب ہے۔ شاید بیگم صاحبہ نے منع کر دیا ہوگا۔ کل تو میری حالت بہتر رہی لیکن آج طبیعت کچھ زیادہ خراب ہے۔ ڈاکٹر تو دو بار آیا مگر تیمار دار کوئی نہیں۔ افسوس پیاری خوبصورت شکیلہ بھی نہ آئیں۔ کیا آپ لوگ تنگ آگئے ایک مریضہ کے پاس آتے آتے، دل چاہتا ہے کہ آپ دونوں میرے پاس آیا کریں مگر خدا جانے کیوں یہ چاہتی ہوں کہ دونوں ساتھ نہ آویں، بلکہ الگ الگ۔ ایک وقت آپ اور دوسرے وقت وہ۔ شاید میری یہ خواہش ناگوار ہو مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ دل تو یہ ہی چاہتا ہے۔ تھوڑی سی فرصت ہو تو چند منٹ کو ہو جائیں۔

خاکسار

آپ کی بہن نجمہ

یہ خط پڑھ کر صحت کی زیادہ خرابی کی خبر سے پریشان ہو کر انھوں نے اسی وقت جانے کاارادہ کرلیا۔ بیوی کی طرف سے اجازت مل ہی چکی تھی۔ باہر نکلے خود ہی کار نکالی اور گرلز سکول روانہ ہو گے۔ وہاں پہنچ کر دیکھا بر آمدے میں دھیمی دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔ آیا ایک طرف کوچ پر پڑی سو رہی تھی۔ انھوں نے ڈرائنگ روم کا دروازہ آہستہ سے کھٹ کھٹایا۔ ہاتھ رکھتے ہی کواڑ کھل گئے۔ اندر بھی ہلکی روشنی تھی اور بیڈ روم کا دروازہ کھلا تھا سبز بلب روشن تھا۔ اس وقت جب کہ گیارہ بجنے والے تھے دیکھا کہ نجمہ اپنی مسہری پر بیٹھی ہوئی ہیں اور ہاتھ میں پانی کا گلاس ہے۔ اس وقت بیٹھا دیکھ کر تیز قدمی سے کمرے میں آئے اور پوچھا: "کیا حال ہے نجمہ، آدھی رات کے وقت جاگ رہی ہو اور تنہا! آیا کو کیوں باہر بٹھا دیا ہے؟ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا پڑا تھا؟" نجمہ نے شال لپیٹ کر جواب دیا "میں کسی کی منتظر تھی جمیل صاحب۔" "اس وقت آپ کو کیسے امید ہو سکتی ہے تھی کسی کے آنے کی؟" نجمہ کی نبض پر ہاتھ رکھ کر جمیل نے کہا "ہاں وقت تو نہ تھا مگر کچھ دل کہہ رہا تھا کہ کوئی آرہا ہے۔ آج تین وقت کی دوا بھی نہ پی تھی۔ اس وقت سر میں درد زیادہ ہو گیا تو دوا پینے کے لیے اٹھ بیٹھی تھی۔ ابھی پینے نہ پائی تھی کہ آپ تشریف لے آئے۔ اپنے ہاتھ سے پلا دیجیے" جمیل صاحب نے شیشی نکال کر دوا ان کو پلا دی اور مسہری کے قریب کرسی کر کے بیٹھ گئے۔ "آج ٹمپریچر کتنا رہا؟" سوال کیا "دن بھر تو رہا جتنا رہا اس وقت تو بالکل نہیں اور اگر آپ اور شکیلہ بیگم رات اور دن میرے پاس رہا کریں تو بخار کمبخت بالکل ہی نہ آئے۔" نجمہ نے جوب دیا "یہ تو نہ کہیے اگر شکیلہ رہیں تو غالبًا بخار اور زیادہ ہو جائے۔ وہ آرہی تھیں اسی وجہ سے میں ساتھ نہیں لایا۔" جمیل صاحب نے ان کے چھیڑنے کو کہا "اگر آپ کا یہ خیال ہے تو ضرور درست ہو گا۔ اچھا ہوا کہ نہیں لائے" اور ہنسنے لگیں برآمدے سے کسی کے قدموں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ جمیل فوراً اٹھ کر باہر آئے دیکھا کہ ایک خوبصورت نوجوان نہایت عمدہ سوٹ پہنے منہ میں سگار دبائے کھڑا ہے اور اپنی چھڑی سے آیا کو ہلا کر جگا رہا ہے۔

جمیل کو اندر سے آتا دیکھ کر اس نوجوان نے سوال کیا "آپ کہاں سے

تشریف لائے ہیں۔ کیا آپ میری مریضہ مس صاحبہ کے رشتہ دار ہیں؟" جمیل نے چیں بہ جبیں ہو کر جواب دیا "آپ کا اس سوال سے مطلب؟ آپ اس وقت بارہ بجے کیوں تشریف لائے ہیں اور اس بیچاری سوتی کو کیوں جگا رہے ہیں؟"

"جناب کو معلوم ہونا چاہیے کہ مس نجمہ لیڈی ٹیچر مسلم گرلز سکول میری مریضہ ہیں اور چونکہ وہ یہاں بالکل اکیلی ہیں، لہٰذا جس دن ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوتی ہے بحکم پرنسپل صاحبہ گرلز سکول علاوہ دن کے شب کو بھی ایک بار ان کو دیکھنا پڑتا ہے۔ کل میں ذرا مصروف رہا تو معلوم ہوا کہ انھوں نے دن بھر دوا نہیں پی۔ کیا اس وقت وہ جاگ رہی ہیں میں ان کو دیکھنا چاہتا ہوں؟" "چلیے وہ جاگتی ہیں۔" دونوں نجمہ کے کمرے میں آئے۔ نجمہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ ڈاکٹر صاحب نے نبض پر ہاتھ رکھا۔ دوا کی شیشی اٹھا کر دیکھی اور جمیل سے کہا "وہ سو گئیں اب تکلیف نہیں دینی چاہیے میں چلتا ہوں۔ آپ کیا یہاں ٹھہرے ہیں؟ اب ان کو دوا کے لیے جگائیے نہیں" ڈاکٹر کو جمیل نے جواب دیا "آپ کو میری کیا فکر ہے کہیں ٹھہرا ہوں۔ آپ تشریف لے جائیے" یہ سخت الفاظ سن کر ڈاکٹر نے جمیل کو بہت تیز نظر سے دیکھا اور کمرے سے باہر ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی جمیل نے ڈرائنگ روم کا دروازہ بند کر لیا اور آتے ہی نجمہ سے کہا "تم نے جان کر آنکھیں بند کر لی تھیں یا واقعی سو گئی تھیں بتاؤ تو یہ اس قدر مہربان ڈاکٹر کیسے ہیں جو آدھی رات کے وقت آپ کو دیکھنے آتے ہیں؟" ڈاکٹر کے جاتے ہی نجمہ نے آنکھیں کھول دیں، اٹھ کر بیٹھ گئی اور جمیل کو بھی اپنے قریب بٹھا کر کہنے لگی "میں نے آج اس لیے آپ کو بلایا تھا کہ اس ہفتے کی بیماری اور علاج کے حالات آپ کو بتانے تھے۔ شاید اس کا آپ کوئی مناسب انتظام کر سکیں۔ مشکل یہ آن پڑی ہے کہ یہ ڈاکٹر ہماری پرنسپل صاحبہ کا خانہ زاد بھائی ہے اور بلا فیس میرا علاج کر رہا ہے۔ ان کو ہٹا کر آپ دوسرا ڈاکٹر مقرر کر سکتے ہیں۔ مگر پرنسپل کو بہت ناگوار گزرے گا۔ چند دن سے میں بہت پریشان ہوں شاید اس ڈاکٹر کی وجہ سے مجھ کو کلکتہ سے چلا جانا پڑے گا۔" "کیوں آخر یہ ڈاکٹر بیچارہ آپ کو ناپسند کیوں ہے۔ جب بغیر خرچ کے علاج اور تیمار داری ہو رہی ہے تو آپ کیوں مخالفت کرتی ہیں؟" جمیل نے دریافت کیا تو نجمہ

نے جواب دیا۔ مجھ کو اس ڈاکٹر کا علاج پسند نہیں۔ صبح سے رات تک دس بار آتا ہے۔ اس کے خیالات کچھ بدل گئے ہیں۔ میں بالکل تنہا رہتی ہوں۔ اس لیے پسند نہیں کرتی۔" یہ سن کر جمیل نے کہا "نجمہ میں اس نوجوان کو بالکل نہیں جانتا کہ کیسا اور کن خیالات کا انسان ہے لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ اگر پرنسپل صاحب کا عزیز ہے تو نہایت ہی عالی خاندان شخص ہے اور میرا خیال ہے کہ پرنسپل صاحبہ کی رائے بھی شامل ہے۔ بظاہر یہ شخص شریف معلوم ہوتا ہے۔ میرا اس وقت یہاں موجود ہونا اس کو سخت ناگوار گزرا۔" نجمہ نے سوال کیا! "اور آپ کو بھی ان کا اس وقت یہاں آنا کچھ ناگوار معلوم ہوا یا نہیں۔"

جمیل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اوہو یہاں تو بڑا حوصلہ مند دل و جگر ہے۔ مسوری میں دیکھا تھا کہ مسٹر کامران سے میں کیسے اچھی طرح سے ملتا تھا۔ یہ تو ڈاکٹر ہے۔ میرا خیال ہے آپ کو اس سے زیادہ گھبرانا نہیں چاہیے۔" نجمہ نے بگڑ کر کہا "اچھا تو میں ایسی ہو گئی کہ کبھی کامران کبھی ڈاکٹر دھوکے دے دے کر میری زندگی کو تباہ کریں۔ جب آپ نے مجھے بہن بنالیا ہے تو بھائیوں کی طرح میری نگرانی اور بہتری کی کوشش کرنی چاہیے۔"

"نجمہ تم یقین کرو میں زندگی بھر تمھارا خادم بھائی ثابت ہوں گا۔ جس قسم کی تم مدد چاہو کرنے کو تیار ہوں۔ یہ تو میں نے یوں ہی چھیڑنے کو کہہ دیا تھا لیکن یہ ضرور کہوں گا یہ ڈاکٹر مجھے اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے اگر تم اجازت دو تو میں اس کی پریکٹس اور حالات کی تحقیقات کروں۔ میرے لیے وہ بڑی خوشی کا دن ہوگا جب میں اپنی بہن کو اپنے ہاتھوں سے کسی اچھے شخص کے سپرد کروں۔ کیونکہ یہ ثواب لازمی ہے۔" یہ سن کر نجمہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اپنے تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ آنکھیں بند کر لیں اور چند منٹ کے بعد جمیل سے پانی لے کر پیا۔ پھر کہا۔ "بھائی جان ابھی تو میرا کلکتہ میں ہونا آپ پر کچھ بار نہیں۔ نہ مجھے اپنے گھر اٹھا کر لے گئے نہ میری تیمارداری کی۔ ابھی سے اس قدر کیوں گھبرا گئے کہ جو ڈاکٹر میرے علاج کو آیا، اسی کے حوالے کرنے لگے۔ مجھے تھوڑی طاقت آجائے تو کلکتہ سے چلی جاؤں گی۔ مجھ

بد نصیب کے ماں باپ زندہ نہیں۔ چچا چچی ناراض ہو گئے۔ میرا دنیا میں اب کوئی نہیں ہے۔ میں کلکتہ اسی خیال سے آگئی تھی کہ ملازمت کر کے بسر کرلوں گی اور ایک قلبی طمانیت و تقویت رہے گی اور آپ ایک صادق و ہمدرد دوست کی طرح مجھ سے تعلقات رکھیں گے۔ آپ نے اس سے بھی زیادہ عزت دی اور محبت کی کہ اس عاجز کو بہن بنانے کا فخر بخشا لیکن آپ پرانے خیالات کے باپ بھائی کی طرح مجھے رخصت کرنے لگے یہ مجھے کسی طرح منظور نہیں۔ جائیے تشریف لے جائیے۔ رات زیادہ آگئی۔" نجمہ کے یہ فقرے جمیل صاحب پر عجیب اثر کر رہے تھے۔ وہ نہایت افسردہ و غمگین نظر آنے لگے۔ کھڑے ہوئے اور کمرے میں ٹہلنے لگے پھر قریب آکر نجمہ کی طرف جھکے اور کہا۔ "اچھی نجمہ مجھ بے بس انسان سے ناراض نہ ہو۔ آہ تم بہت بے وقت کلکتہ میں آئیں اور نہ مجھ کو تمھارے حالات کی خبر ملی کہ کامران نے شادی کرلی۔ والدین کی بے انتہا سختی وزبردستی سے میرا یہاں عقد ہو گیا۔ اب میری حالت یہ ہے کہ تم سے ملنے کو آنا بھی کوئی گوارا نہیں کر سکتا، تم بالکل بے وارث ہو۔ اب سوائے اس کے چارہ نہیں کہ زندگی امن کے ساتھ بسر کرنے کے لیے تم بھی شادی کرلو۔ دیکھو تنہا رہنا کتنا مشکل ہے۔ ڈاکٹر کا آنا ہی تم کو پسند نہیں اچھا معاف کرو غصہ نہ کرو اگر آپ نے ارداہ کرلیا ہے کہ ایسی حالت میں زندگی بسر کریں گی تو آپ کی مرضی۔ خدا حافظ و مددگار ہو۔ میں نے انہی مشکلات پر نظر رکھتے ہوئے یہ رائے دی تھی نجمہ۔ یہ شادیاں کیا ہیں دنیا میں پُرامن زندگی بسر کرنے کے لیے ایک معاشرتی فرض ہے۔ جس کو انسان خوشی و ناخوشی سے ادا کرتا ہے۔ بس اس سے زیادہ میرے خیال میں تو شادی کی کچھ حقیقت نہیں۔ والدین کا حکم ماننے کے لیے میں نے بھی یہ فرض ادا کیا اسی طرح چاہتا ہوں کہ آپ بھی اس زندگی میں قدم رکھ کر بے فکر ہو جائیں۔ دن گزرے چلے جاتے اور ایک دن خاتمہ ہو جاتا ہے۔"

نجمہ یہ سن کر بستر پر اٹھ بیٹھی اور ان کو جواب دیا۔ "جمیل صاحب آپ مجھ کو کوئی شریف لڑکی خیال کریں یا بدترین میں اپنے خیالات اس وقت آپ کے سامنے صاف صاف بیان کیے دیتی ہوں۔ ہمارے آپسی تعلقات کو دو سال کا عرصہ گزرا مگر

چونکہ ہم میں بے تکلفی نہیں ہونے پائی تھی اس وجہ سے ایک کو دوسرے کے خیالات سے واقفیت نہ تھی۔ آپس کی پسندیدگی پر ہماری نسبت ہو گئی تھی اور وہ پسندیدگی بھی صرف اتنی ہی تھی کہ ایک نے دوسرے کی شکل دیکھی تعلیم یافتہ دیکھا بس آزاد لوگوں نے مجھ کو اور چچا چچی کو بتایا بہکایا کہ آپ کا گھرانہ رسوم قدیم کا پابند ہے میری زندگی وہاں مشکل سے گزرے گی۔ رشتہ ٹوٹ گیا مگر فوراً ہی آپ کی خوبیاں مجھ پر ظاہر ہوتی گئیں اور یہاں تک کہ گرمیوں میں مسوری میں آپ سے ملاقات نصیب ہوئی تو مجھ پر عجیب ہی اثر ہوا۔ اس وقت اگر کامران سے شادی ہو جاتی تو وہیں گزر جاتی مگر وہ بہت جلد مجھ کو چھوڑ کر کسی اور طرف مائل ہو گیا اور مجھ سے علیحدگی ہو گئی۔ اب تو ناممکن ہے کہ میں پھر اس زندگی میں قدم رکھنے کا ارادہ کروں۔ اپنی بد قسمتی سے ایک فرشتہ کا ساتھ چھوڑ کر شیطان سے رشتہ جوڑا تھا اس کی سزا پائی۔" جمیل نے کہا "مگر وہ فرشتہ بھی کسی اور سے رشتہ جوڑ چکا تو اب اس کے خیال میں آپ کیوں دنیاوی مصائب کا مقابلہ کریں۔ آج کل تو میں وقت نکال کر تھوڑی دیر کو بھی آجاتا لیکن اب دو تین دن تک نہ آسکوں گا کہ شکیلہ بیگم پرسوں میرے گھر لائی جا رہی ہیں۔" نجمہ یہ سن کر پلنگ سے کھڑی ہو گئیں اور نہایت خوشی کے اظہار کے ساتھ کہنے لگی۔ "ارے ایسی جلدی یوں کہو کہ پرسوں شادی ہو رہی ہے۔ میں ضرور شریک ہوں گی۔ پرسوں تک بالکل اچھی ہو جاؤں گی۔" جمیل نے انھیں پلنگ پر بٹھا کر کہا۔ "آپ نے یہ کیا غضب کیا کمزوری میں یکایک کھڑی ہو گئیں۔ آپ وہاں جا کر کیا کریں گی۔ میرے خیال میں فضول تکلیف ہوگی" "نہیں ہم ضرور جائیں گے۔ جیسے بنے اس کا انتظام کیجیے ورنہ میں اپنی پرنسپل صاحبہ کے ساتھ آجاؤں گی۔ امید ہے شکیلہ کچھ برا نہ مانیں گی۔"

"اچھا پوچھوں گا کہ کیا کرنا چاہیے۔ میرے خیال میں تو نہ جانا بہتر تھا۔ دو بج رہے ہیں میں اجازت چاہتا ہوں۔"

نجمہ جمیل کو رخصت کرنے شال لپیٹ کر پھر کھڑی ہو گئیں اور ان کے منع کرنے پر بھی دروازہ تک آئیں اور کہنے لگیں "جمیل صاحب کیا میں آج آپ کو آخری دفعہ رخصت کر رہی ہوں؟ غالباً اب آپ نہ آسکیں گے۔" جمیل اس وقت بہت ہی

رنجیدہ ومغموم ہو رہے تھے "میں کل ہی حاضر ہوں گا" کہا اور دوسری طرف منہ پھیر کر تیزی سے دروازے سے نکل گئے۔ نجمہ کمرے میں آئیں مسہری پر گر گئیں۔ کچھ دیر خاموش پڑی رہیں اور پھر اٹھ کر میز پر سے پنسل کاغذ لے کر لکھنے لگیں۔

جناب ڈاکٹر صاحب!

تسلیم۔ میں اطلاعاً لکھتی ہوں کہ میں اب بالکل تندرست ہوں اور کلکتہ سے بہت جلد جانے والی ہوں۔ آپ نے میرے علاج اور تیمارداری میں جس قدر تکلیف اٹھائی اس کی میں تہہ دل سے مشکور ہوں۔ کل سے آپ میرے لیے دوائیں بھیجنی بند کر دیں اور خود بھی تشریف لانے کی زحمت گوارا نہ کریں۔"

خاکسار

نجمہ

اس کو ختم کر کے لیٹ گئیں۔ تین بج چکے تھے نیند نہیں آئی۔ جمیل صاحب کی شادی، پرنسپل صاحبہ اور ڈاکٹر صاحب کے رنج کا بھی کچھ خیال، ایک دم اپنا کلکتہ سے چلنے کا بندوبست کونا۔ ان ہی خیالات کی الجھن میں صبح ہو گئی۔ جب آیا کمرے میں آئی تو سب سے پہلا کام اس کو یہ بتایا گیا کہ وہ خط ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی بھجوا دے اور دوا کی شیشیاں وغیرہ میز پر سے اٹھوا دی گئیں۔ آیا نے میز پر چائے لا کر رکھی۔ وہ ابھی بستر ہی پر تھیں اور چائے نہیں پی تھی کہ کار کی آواز آئی اور تین منٹ بعد دیکھا کہ جمیل صاحب ان کے مسہری کے پاس کھڑے تھے۔ دیکھتے ہی اٹھ بیٹھیں۔ وہ بھی کرسی قریب کر کے بیٹھ گئے اور خود ہی چائے بنانے لگے۔

"میں اس وقت نماز پڑھتے ہی بغیر چائے پیے چلا آیا ہوں۔ بہت اچھا ہوا کہ آپ نے ابھی نہیں پی اب دونوں پئیں گے" نجمہ نے کہا "آپ بہت ہی سویرے آ گئے۔ ایک بجے تو گھر پہنچے ہوں گے۔ کیا سوئے ہوں گے۔" "کون سویا ہے؟ دو گھنٹے کتاب دیکھتا رہا۔ پھر اٹھ کر نماز پڑھی اور حاضر ہو گیا۔ چونکہ آپ نے رات آخری دفعہ رخصت کر دیا اس لیے بہت جلد آ گیا۔"

نجمہ نے کہا "مجھے تو اب بالکل امید نہ تھی کیونکہ آج تو شادی کی رسوم شروع ہو جائیں گی۔ ایسی حالت میں کہاں نکل سکیں گے۔ اسی خیال سے آخری بار رخصت کیا تھا۔ آہ اب آخر تو ہے ہی۔ شکیلہ بیگم کے آجانے کے بعد آپ کا یہاں آنا بالکل نامناسب ہوگا۔ میں تو رات ایک منٹ بھی نہیں سو سکی۔ اس وقت ناشتہ کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن جب آپ تشریف لے آئے اور اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پلا رہے ہیں اب تو مجھ کو کئی وقت کے لیے کھالینا چاہیے۔ پھر خدا جانے ایسا موقع زندگی میں کبھی نصیب ہو یا نہ ہو۔ آیا کچھ پھل اور کچھ نمکین چیزیں جو تم نے کل بنائی تھیں لے آؤ۔" جمیل بولے "آپ ایسا خیال کیوں کرتی ہیں آیندہ سے ہم دونوں آیا کریں گے۔ شکیلہ اچھے خیالات کی لڑکی ہے۔ وہ کوئی رکاوٹ یا اعترض نہ کریں گی۔ صرف تین دن مصروفیت کے ہیں اس کے بعد آزادی ہوگی۔" "آزادی ہوگی تو ہمیں کیا؟ میں تو ہمیشہ کے لیے آپ سے رخصت ہو رہی ہوں، اب جلد کلکتہ چھوڑ دوں گی۔" آیا نے ڈاکٹر صاحب کا کارڈ پیش کیا جس کو دیکھتے ہی نجمہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ جمیل نے کارڈ پر نظر ڈلی اور کہا۔ "آنے دیجئے ڈاکٹر ہے۔ آپ کو دیکھنا ضروری ہے۔ مجھ کو اب جانا ہے۔ کیونکہ تھوڑی دیر میں سب مہمان جمع ہو جائیں گے اور رسم مانجھہ ادا ہونے والی ہے۔" یہ کہہ کر کھڑے ہوگئے۔ نجمہ بھی ساتھ ہی کھڑی ہوئیں اور پھر ان سے کہا "خدا مبارک کرے میرا دل وہیں لگا رہے گا۔ برائے خدا آپ مجھے کل شادی میں ضرور شریک کریں" جمیل نے جواب دیا "آپ کو اس قدر کیوں اصرار ہے؟ وہاں جا کر کیا کریں گی۔ کیا دراصل آپ کو کچھ خوشی ہوگی؟" نجمہ نے کہا "ہاں ایک عجیب قسم کا اثر ہوگا جو زندگی میں پھر کبھی نہ ہو سکے گا میں آپ کو نوشہ بنا ہوا دیکھ لوں گی گویا اپنے ہاتھوں سے ایک اور کے سپرد کر دوں گی" یہ کہہ کر نجمہ نے اپنا سر جھکالیا۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ جمیل صاحب پر بھی بہت اثر ہوا اس بد نصیب لڑکی کی پشیمانی اور ناکامی کا۔ وہ بھی افسردہ ہوگئے اور کہنے لگے۔ "کیا تمھاری زندگی کا نصب العین یہی ہے کہ کبھی میرے سامنے اپنے آپ کو دوسرے کے سپرد کر کے مجھ کو دکھاؤ اور کبھی مجھ کو کسی کے حوالہ کر کے دیکھو آہ کیا ہمت کیا حوصلہ ہے۔ واللہ میں وہ نقشہ تو نہیں

دکھانا چاہتا۔ اچھا تین دن کے لیے رخصت۔" یہ کہہ کر ایک دم جمیل کمرے سے باہر ہو گئے۔ بر آمدہ میں اجازت کے منتظر ڈاکٹر صاحب کھڑے تھے انھوں نے دیکھتے ہی سلام کیا اور اندر جانے کو کہہ کر اپنی کار پر سوار ہو گئے۔ ڈاکٹر نجمہ کے کمرے میں آئے۔ وہ غسل خانہ میں جاچکی تھیں۔ دس منٹ بعد کپڑے بدل کر باہر آئیں اور ڈاکٹر صاحب کو بیٹھنے کو کہا اور خود ہی گفتگو شروع کر دی۔

"دیکھیے ڈاکٹر صاحب اب میں بالکل اچھی ہوں حرارت بھی نہیں۔ خوب کھاتی ہوں۔ آپ کی عنایتوں کی بہت ہی مشکور ہوں۔ آپ نے نہ صرف ڈاکٹر کے بلکہ نرس اور عزیزوں کے فرائض بھی ادا کیے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا "میں تو اس وقت گھبرا گیا آپ نے یہ اچانک چلنے کا اردہ کیسے کر لیا۔ ابھی تو آپ بہت کمزور ہیں بغیر ڈاکٹر کی اجازت کے آپ سفر نہیں کر سکتیں۔" ڈاکٹر صاحب جلد ہی مجھے سفر کرنا لازمی ہے۔ آپ کو اجازت تو دینی ہوگی۔" "ڈاکٹر نے ہنس کر کہا "اس حالت میں کوئی مریض تنہا سفر نہیں کر سکتا آپ کو ڈاکٹر کو اپنے ہمراہ رکھنا ہوگا۔" نجمہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "ڈاکٹر کا ساتھ رہنا تو مشکل ہے۔ آپ کی رائے ہے تو کسی نرس کو لے جاؤں گی۔" ڈاکٹر نے کہا "کچھ مشکل نہیں۔ نرس سے زیادہ ڈاکٹر کا ہمراہ لے جانا آسان ہے۔ کیونکہ وہ آپ کا خادم ہے۔" نجمہ نے ذرا سنجید گی سے جوب دیا "یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے جو مجھ کو عمر بھر یاد رہے گی۔ مگر اب تو ڈاکٹر ہم میں جدائی ہی ہے۔ خدا آپ کو شادمان رکھے۔" ڈاکٹر نہایت افسردگی سے بولے "اگر ہمیشہ کو جدائی ہے تو نجمہ شمشاد کو شادمانی کہاں۔ فی الحال آپ کو یہاں سے جانا نہیں چاہیے۔ میری سچی خدمات کا کیا اتنا بھی صلہ نہیں ملے گا؟" "ضرور آپ کا حکم سر آنکھوں پر میں چار دن کے لیے ٹھہر جاؤں گی لیکن ڈاکٹر جانا ضرور ہے۔" ڈاکٹر شمشاد نے کہا "یہ تو آپ کے اختیار میں ہے اگر آپ پسند کریں تو ہمیشہ کلکتہ میں رہ سکتی ہیں کل ہی پرنسپل صاحبہ کہہ رہی تھیں کہ میں دو سال کے لیے انگلینڈ جانا چاہتی ہوں اور اپنی جگہ مس نجمہ کو مقرر کر دوں گی۔ کیا آپ کو یہ پسند نہیں؟" نجمہ نے جواب دیا "میرا ارادہ ملازمت کا نہیں۔ میرے بزرگ واپس بلا رہے ہیں۔" شمشاد صاحب نے کہا۔ "یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ اگر ملازمت نہیں

تو آپ کو دوسری زندگی شروع کرنی ہوگی۔ ہمیں تو آپ کے حالات سے آگاہی نہیں۔ ہاں کیا میں یہ دریافت کر سکتا ہوں کہ یہ صاحب جو ابھی تشریف لے گئے ہیں آپ کے کوئی رشتہ دار ہیں؟" نجمہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "جی نہیں ان صاحب سے رشتہ تو کوئی نہیں میرے دیرینہ دوست اور آپ کی طرح مہربان ہیں۔ آپ ان کو نہیں جانتے وہ یہاں کے ایک بڑے نامور تاجر سیٹھ خلیل احمد صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ وہ تو آپ کی ہمشیرہ پرنسپل صاحبہ سے خوب واقف ہیں بلکہ ان کے خاندان کی لڑکیاں پرنسپل صاحبہ کی شاگرد ہیں۔ مسٹر جمیل خود بیرسٹر ہیں۔" یہ حالات سن کر ڈاکٹر حیران سے ہو گئے اور چند منٹ کی خاموشی کے بعد کہا: "اچھا آئی۔ سی! یہ بیرسٹر جمیل تھے۔ نام تو سنا ہے لیکن ملاقات کبھی نہیں ہوئی مجھ کو انگلینڈ سے آئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے" یہ کہہ کر پھر کسی اور گہری سوچ میں پڑ گئے۔ نجمہ ان کیحالت کو بخوبی سمجھ رہی تھیں۔ اب ان کو دھوکے میں رکھنا مناسب نہ سمجھ کر کہا "کیوں ڈاکٹر صاحب آپ تو کسی سوچ میں پڑگئے۔ کیا آپ کو اس کا بھی علم نہیں ہے کہ آج جمیل صاحب کی شادی ہے۔ پرنسپل صاحبہ مدعو ہیں۔" جمیل کی شادی سن کر ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر خوشی سے سرخی دوڑ گئی جو ابھی نہایت افسردہ تھے بشاش نظر آنے لگے خوشی سے بولے "اچھا آج ہی بیرسٹر صاحب کی شادی ہے۔ ہمشیرہ صاحبہ نے مجھ سے ذکر نہیں کیا آپ کو شاید وہ شادی کا بلاوا دینے آئے تھے؟" "جی ہاں مگر میں نے یہ جواب دیا ہے کہ "اگر ڈاکٹر صاحب نے اجازت دی تو آؤں گی۔" "اور کلکتہ سے جانے کا خود ہی فیصلہ کر لیا۔"

پھر ایک کار کے آکر ٹھہرنے کی آوز آئی اور آیا نے خبر دی کہ کوئی بیگم صاحب آپ سے ملنے آئی ہیں۔ یہ سن کر نجمہ کھڑی ہو گئیں ڈاکٹر وہیں بیٹھے رہے انھوں نے بیڈ روم کا دروازہ بند کر دیا اور ڈرائنگ روم میں آکر انھیں اتروادیا۔ اور دیکھ کر حیران رہ گئیں "ارے آج آپ کیسے تشریف لے آئیں آج ہی تو مانجھا ہے۔ آپ کو نکلنے کا موقع کیسے مل گیا؟" شکیلہ بیگم نے جواب دیا "آج میرا آنا ناممکن تھا۔ مگر میں صرف اس خیال سے ہزار مشکلیں اٹھا کر آئی ہوں کہ آپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں ہی

اپنی شادی میں شریک کرنے کو بلاؤں گی۔ میں دس منٹ کے لیے آئی ہوں کل آپ کس وقت تشریف لائیں گی؟ میں ابھی پرنسپل صاحبہ سے کہتی جاؤں گی کہ آپ کو اپنے ہمراہ لے آئیں۔ اب تو آپ بالکل اچھی ہیں؟" نجمہ نے کہا "اس خلوص و محبت کا شکریہ ادا نہیں کر سکتی کہ رسم مایوں بیٹھنا بھی دیکھنا چاہتی تھی اگر کوئی بلاتا۔" شکیلہ نے کہا "اس کے لیے میں جمیل صاحب سے کہلوادوں گی اگر وہ کسی ترکیب سے بلوا سکیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ آپ کو شادی میں شریک کرنا چاہتے نہیں غالباً اس وجہ سے کہ ان کی والدہ صاحبہ سے آپ کا تعارف نہیں ہے اور میں ان کی مرضی کے خلاف کچھ کرتی ہوئی ڈرتی ہوں۔ اچھا بہن مجھے اب اجازت دیجیے بہت جلدی ہے۔" اس کی محبت کا نجمہ پر خاص اثر ہوا اور وہ شکیلہ سے لپٹ گئیں اور کہا "پیاری شکیلہ خدا تمھیں یہ شادی مبارک کرے اور تازندگی شاد کام رہو یہ میری دلی خواہش ہے۔" اس وقت شکیلہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اس نے جھک کر اپنا سر نجمہ کے سینے سے لگادیا اور روتے ہوئے کہا :"پیاری بہن آپ دعا کریں کہ میری آئندہ زندگی اپنے شوہر کی رضامندی میں بسر ہو۔ میں ہمیشہ آپ کو اپنی حقیقی بہن سمجھوں گی۔" نجمہ نے شکیلہ کا سر اپنے سینہ سے لگا کر اس کی آنکھوں کو چوم کر رومال سے خشک کیا اور کہا۔ "میری اچھی شکیلہ مجھ کو آج سے نہ صرف اپنی بہن بلکہ اپنے شوہر جمیل کی بھی حقیقی بہن سمجھو۔ پھر میرا بڑا حق ہو جائے گا۔ امید ہے مجھے نند بنالو گی۔" شکیلہ نے سر اٹھا کر جواب دیا "ضرور ضرور مجھ کو معلوم ہے جمیل صاحب نے مجھ سے بیان کر دیا تھا۔ جس دن انھوں نے آپ کو بہن کہا تھا بلکہ ہم نے انھیں چھیڑا تھا کہ عورتیں دوپٹہ بدل کر بہن بنا کرتی ہیں اپ بھی بہن نجمہ سے کوئی چیز بدلنے کی رسم ادا کریں۔ اس کا انھوں نے یہ جواب دیا کہ جب آپ آجائیں گی تو وہ رسم ادا کرنا۔ اچھا خدا حافظ۔" نجمہ نے خود جا کر شکیلہ کو سوار کرایا۔

حجاب امتیاز علی

حجاب امتیاز علی، حجاب امتیاز علی تاجؔ کے نام سے بھی جانی جاتی ہیں۔ وہ ۱۹۱۵ء میں حیدر آباد میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے ساڑھے گیارہ سال کی عمر سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ ان کی تصانیف میں متعدد ناول اور افسانوں کے کئی مجموعے شامل ہیں۔

حجاب امتیاز علی اپنے گھریلو اور ارد گرد کے ماحول کے اعتبار سے اس دور کے مغرب (west) سے بہت قریب نظر آتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں مغرب کے اس دور کے ڈرامائی اور سنسنی خیز ادب (sensational literature) کی چھاپ ملتی ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بارسوخ مسلمانوں کے اس طبقے سے تعلق رکھتی تھیں جو تعلیم، خیالات اور سوچ کے اعتبار سے اپنے وقت سے کافی آگے تھے۔ تعلیم و تربیت اور خیالات کے لحاظ سے، حجاب امتیاز علی سماج کے اس بالائی طبقے کا حصہ تھیں، جو نہ صرف سیاسی اور سرکاری اعتبار سے انگریز حکومت کے قریب تھا بلکہ انگریزی قوم کی سماجی اور ثقافتی اقدار کو بھی اپنی زندگی کا ایک حصہ بنائے ہوئے تھا۔ ان کی تصنیفات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اُس دور کے اُس ہندوستانی طبقے کی نمائندہ ہیں، جو مغربی تہذیب اور ثقافتی اقدار کو ہندوستانی جاگیردارانہ اقدار پر منطبق کر کے ایک نیم انگریز اور نیم

ہندوستانی طرزِ ثقافت کی شکل میں سماج کے ایک مخصوص اور محدود طبقے نے اختیار کر رکھا تھا۔

اس مجموعہ میں شامل ان کی کہانی فورسڈ لینڈنگ (Forced Landing) ایک سنسنی خیز، تخیلی افسانہ تو ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حجاب امتیاز علی خود فورسڈ لینڈنگ میں مہارت رکھتی تھیں۔ دراصل وہ متحدہ ہندوستان کی پہلی ہوا باز (Pilot) خاتون تھیں، جنھیں ۱۱ جون ۱۹۳۶ء کو برطانوی حکومت نے پائلٹ کا لائسنس جاری کیا تھا۔ ان کی تخلیقات کی دنیا کوئی پُراسرار دوسری ہی دنیا نظر آتی ہے، جس کا ہماری سرزمین سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا ہے۔

حجاب امتیاز علی کا انتقال ۱۸ مارچ ۱۹۹۹ء کو ہوا۔

حجاب امتیاز علی

فورسڈ لینڈنگ

(۱)

ان دنوں کلب میں نائٹ فلائینگ (رات کی پرواز) شروع ہو گئی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد اکثر ممبر سگار منہ میں دبائے اور چوکلیٹ کی ڈلیاں چباتے ایک پُر اطمینان فراغت میں کلب آ پہنچتے اور شبِ ماہتاب میں اگر پرواز نہ کرتے تو پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے یا ایزی چیئر پر آسائش سے لیٹے چاندنی میں نہائے ہوئے زمین و آسمان کو ایک لذیذ خود فراموشی میں تکتے اور اپنی محویت یا لمبے لمبے وقفوں کی گفتگو سے صرف اس وقت چونکتے جب کسی رخصت ہوتے یا آتے ہوئے جہاز کا شور ایک خوش آئند طور پر ذرا دیر کے لیے سکوت میں خلل انداز ہو جاتا تھا۔

کھانے سے فراغت پانے کے بعد فلائینگ کلب جانے کے لیے کار میں سوار ہو رہی تھی کہ بوڑھا ڈاکٹر گار اپنی سیاہ لمبی رات کی ٹوپی بغل میں دبائے باغ کی ایک روش سے نکلا اور مجھے رخصت کے لیے تیار دیکھ کر بولا۔ ”کلب؟“

مسکرا کر میں نے کہا۔ ”ورنہ شوپنگ؟“

ڈاکٹر نے تامل کے بعد کہا۔ ”سوچتا تھا ایک روز میں بھی تمھارے ساتھ

اڑنے چلوں۔"

میں بولی۔"اس مسئلہ پر ابھی چند سال اور غور کرنے کی ضرورت ہے۔"

بوڑھے ڈاکٹر گار کو شاید اپنی توہین محسوس ہوئی اس لیے بولا۔"میں ان ہوائی کشتیوں کی سواری سے ڈرتا تو نہیں۔ مزید برآں دس دس منٹ کو دو تین بار سوار بھی ہو چکا ہوں۔"

میں نے کہا۔"تاہم سواری سے پہلے سوچ بچار کی ضرورت اب تک محسوس ہوتی ہے۔"

ڈاکٹر کو مجبوراً کہنا پڑا۔"سوچ بچار کیا ہوتا۔ میں نے تو محض اس وجہ سے اپنی آرزو کا اظہار نہ کیا تھا کہ شاید تم مجھے ساتھ اڑانے میں تامل کرو۔"

میں مسکرا کر بولی۔"آپ غالباً اتنے وزنی تو نہیں کہ میرے ساتھ جہاز پر بیٹھیں تو جہاز زمین سے اٹھ نہ سکے۔"

ڈاکٹر نے موٹر کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔"تو چلوں۔"

میں بولی۔"استدعا کیجیے۔ دھمکی کے طور پر کیوں کہتے ہیں مگر یہ سمجھ لیجیے کہ میں آج رات کئی گھنٹے اڑنا چاہتی ہوں۔ دیکھتے نہیں آج کی رات کتنی پیاری اور دل آویزا ہے۔ مشرقی ممالک کی ایسی گرم اور حسین راتوں کی میں عاشق ہوں انھیں نیند میں کھونا نہیں چاہتی۔ ایسی راتوں میں آدمی یا تو اپنے کتب خانے کی کھڑکی میں بیٹھ کر افسانہ لکھے۔ شعر سوچے، یا پھر آسمان پر اڑے۔ تو ـــــ میں تو آج کئی گھنٹے اڑتی رہوں گی۔"

یہ سن کر ڈاکٹر کا عزم متزلزل ہو گیا۔ بولا۔"اچھا!"

میں بیزار ہو کر بولی۔"کوئی طبی رسالہ پڑھتے ہوئے سو رہیے۔"

ڈاکٹر اپنی مردانگی کی ذلت برداشت نہ کر سکا۔ جواب میں میرے ساتھ بیٹھ کر بولا۔"خواہ ساری رات اڑو، اس میں ڈر کی کیا بات ہوئی۔ آدمی جیسے دس منٹ اڑا ویسے دس گھنٹے اڑا۔"

میں نے جواب میں موٹر کی بریک کھینچی اور موٹر چلانے کے لیے اس کی چابی گھما دی۔

ایک منٹ بعد ڈاکٹر بولا۔ "پر روحی آدھی رات تک تو لوٹ آئیں گے نا؟"
میں بولی۔ "اب شرطیں کیسی؟"
ڈاکٹر بولا۔ "نہیں نہیں شرط و رط کوئی نہیں۔ یہ بات میں نے محض طبی نقطۂ نظر سے کہی۔ شب بیداری ہر حالت میں مضر صحت ہے۔ خواہ وہ سینما یا تھئیٹر میں ہو خواہ ہوائی جہاز میں۔"

میں نے بے پروائی سے کار چلاتے ہوئے کہا۔ "جب اڑتے اڑتے اکتا گئے، آجائیں گے۔"

گار کہنے لگا۔ "خیر اس کے لیے میں دلی شوق سے حاضر ہوں۔"

بچارے بوڑھے ڈاکٹر گار کو کیا پتہ تھا کہ ان کے اس "دلی شوق" سے قضاو قدر کو کیا کیا انتقام لینا منظور ہے اور ان کی اس رات کی اس غیر معمولی دلیری سے کیا کیا خطرناک نتائج بر آمد ہونے والے ہیں۔

(۲)

ڈاکٹر گار کو تو آپ جانتے ہی ہیں کہ بہت باتونی مگر بے حد پیارا بوڑھا ہے۔ اکثر ہم لوگوں کو ہمارے بچپن کی بے وقوفیاں اور شوخیاں یاد دلا کر محجوب کیا کرتا ہے۔ کبھی میری شرارتوں کا ذکر، کبھی ہارلی کا سر سلاخوں دار کھڑکی میں پھنس جانے کا تذکرہ، کبھی جسوتی کے نہر میں ڈوبنے کی کہانی، بھیا ایمانی کے دیوار پر سے گرنے کا قصہ! انھیں قصوں کو سنتے سناتے اور قہقہے لگاتے ہم دونوں ائیر و کلب پہنچے۔

دیکھا تو موسم بالکل اڑنے کے قابل پایا۔ "ونڈ انڈی کیٹر" (ہوائی جھنڈے) ہوا میں آہستہ آہستہ پر سکون انداز سے لہرا رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد میں نے اڑنے کے لیے بلایا۔ وہ بڑے اشتیاق سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

چشم زدن میں ہم تاریک فضا میں اٹھنے شروع ہوئے اور ذرا سی دیر میں

رات کی تیز رفتار چڑیوں کی طرح شہر پر سے گزر گئے۔

شہر کی عمارتیں مدہم روشنی میں چوکور سیاہ دھبّوں کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ روشنیاں نور کی، نقطوں کی طرح نظر آرہی تھیں۔ بہت دور دریائے شون کسی سفید لمبے سانپ کی طرح تاریک درختوں کے درمیان بل کھائے ہوئے سِسک رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے ہم پرستان پر پرواز کر رہے ہیں۔ میں اپنے آپ کو بالکل پری محسوس کر رہی تھی۔ کیونکہ خنکی زیادہ نہ تھی اور میں نے کوئی موٹا وزنی کپڑا ابھی نہ پہن رکھا تھا۔ ہلکے ہلکے کپڑے تھے اور پریوں کے روایتی لباس کی طرح مہین! مگر میرے مقابلے میں بوڑھا ڈاکٹر گار ایک پرانا دیو معلوم ہو رہا تھا جو چپ چاپ اپنے وزنی لباس میں پیچھے کی سیٹ پر بیٹھا زمیں کی طرف جھانک رہا تھا۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ کبھی کبھی ڈاکٹر کی ناک کی ناگوار آواز آجاتی تھی جو نسوار چڑھانے کے سلسلے میں نکلتی تھی (جس کی میں بچپن سے عادی ہوں) ورنہ سوائے ہوائی کشتی کے پروں کے جو بڑی تیزی اور تندی سے ہوا کو کاٹ رہے تھے اور کسی قسم کی آواز نہ تھی۔

بہت دیر ہم چپ رہے۔

رات کے سکوت میں ہمارا جہاز ہوا کو کاٹتا ہوا دڑانہ چلا جا رہا تھا۔ آہ وہ رات! ایشیاء کی حسین ترین رات! شہر اور جنگل، گاؤں اور کھیت، شب ماہتاب کے دھندلکے میں مدہوش ناچتے ہوئے ہمارے عقب کی سمت جا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد اس سکوت سے اکتا کر میں نے کہا۔ "ڈاکٹر تم کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ بات ہی نہیں کرتے۔"

ڈاکٹر بولا۔ "باتیں کرنے سے تمھارے چلانے میں خلل پڑے گا اس لیے چُپ ہوں۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "میں کوئی ریاضی کا سوال تو حل نہیں کر رہی۔ اس کام کی عادی ہو چکی ہوں۔"

ڈاکٹر نے ذرا سے تامل کے بعد کہا۔ "علاوہ ازیں میں ان ہوائی کشتیوں کے سفر کا زیادہ عادی بھی نہیں ہوں۔"

''تو یوں کہیے۔''میں نے کہا۔''تو ایسا کہیے نا کہ خوفزدہ بیٹھے ہیں آپ۔''

ڈاکٹر نے نسوار کی ڈبیا پر چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔''خوفزدہ تو نہیں، مگر میرے خیال میں اب لوٹ ہی چلنا مناسب ہوگا۔''

میں ہنس پڑی۔ جیسی کہ میری عادت ہے۔''او ڈاکٹر! تم نے اپنی دلیری کا خوب ثبوت دیا۔ ابھی تو ہم کوئی سوڈیڑھ سو میل سے زیادہ نہ آئے ہوں گے۔''

ڈاکٹر گار تردد سے بولا۔''ایں سوڈیڑھ سو میل روحی؟ تو یوں کہو سلطانیہ پہنچنے کا ارادہ ہے۔ آخر آج رات گھر بھی لوٹنا ہے یا نہیں؟''

میں بولی۔''کیوں نہیں، بالکل اتنی ہی دیر میں واپس جا پہنچیں گے جتنی دیر میں یہاں آئے ہیں۔''

میں بے فکری سے جہاز کو دریائے شون کے کنارے سیدھا لے جاتی رہی۔ ڈاکٹر تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی بات کرتا جس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ ہوتا کہ مجھے واپس لے چلنے پر آمادہ کرے۔ کبھی کہتا۔''آدھی رات تو ہوگئی ہوگی۔'' کبھی کہتا ''زیادہ دیر اڑنا صحت کے لیے مضر ہے۔'' کبھی بولتا۔''ہم تو اکتا گئے پرندوں کی طرح اڑنا پھرنا انسانوں کا کام نہیں۔'' کبھی پوچھتا۔''کیوں روحی! تھکی نہیں؟''

آخر میں نے بیزار ہوکر کہا۔''وہ مینار دیکھتے ہیں آپ؟ جی چاہتا ہے اس تک ہوکر آجائیں۔''

بوڑھا ڈاکٹر گار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔''کون سا؟ کون سا؟ اس ویرانے میں مینار کہاں سے آگیا؟''

میں نے کہا۔''حکومت سلطانیہ کی کسی عمارت کا مینار ہے۔''

گار نے متعجب ہوکر کہا۔''تو کیا واقعی سلطانیہ آگیا؟ اف! لوٹ چلو روحی۔ پاسپورٹ کے بغیر سلطانیہ میں اس مینار تک جانا نامناسب ہے۔''

میں نے کہا۔''میں نے تو اپنی آرزو کا اظہار کیا تھا۔ وہاں جا تو نہیں رہی۔''

گار جھنجھلا کر بولا۔''اب آخر لوٹنے میں تامل کیا ہے؟ بچہ مت بنو روحی چلو واپس۔''

میں خاموش تھی! کیونکہ یکلخت مجھے انجن کے پرزوں میں سے ایک نئی آواز آنے لگی تھی۔

گار بے صبر ہو گیا۔ بے قرار لہجے میں پوچھا۔ "روحی! اب کیا کر رہی ہو؟ آخر تمھارا مدعا کیا ہے؟"

کچھ تامل کے بعد میں نے کہا۔ "ذرا ٹھہریے۔ انجن میں کچھ خرابی معلوم ہوتی ہے۔"

بوڑھے ڈاکٹر نے اُچک کر میرے شانوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ "انجن میں خرابی؟ کیا معنی اس کے؟"

میں خود کسی قدر پریشان تھی، بولی۔ "انجن کے پُرزوں کی ایک نئی آواز آپ کو سنائی دے رہی ہے؟"

ڈاکٹر گار نے ایک لمحہ کان آواز پر لگائے، پھر گھبرا کر بولا۔ "نہیں، مگر کیا جہاز گرنے کو ہے؟"

میں بولی۔ "نہیں نہیں گرتا کیوں؟ لیکن شاید ہمیں یہاں فورسڈ لینڈنگ کرنا پڑے" (مجبوراً اترنا پڑے)۔

"فورسڈ لینڈنگ!" گار کے منہ سے چیخ نما آوز میں نکلا۔ "او خدا! یعنی جہاز بگڑ گیا! نیچے گرے گا! روحی! یہ کیا مصیبت آئی؟ یا رب ہم پر رحم کر، ہم نیچے کہاں اتریں گے؟ اس ہاتھ تو دریا ہے۔ جہاز کو پرے رکھنا میری روحی! پرے کو احتیاط سے اتارنا۔ آہستہ آہستہ۔ زور سے زمین پر گرا تو بڈی پسلی چکناچور ہو جائے گی۔"

میں نے پریشان ہو کر کہا۔ "او ڈاکٹر ـــــ آپ کی گھبراہٹ اور ہدایتوں نے تو مجھے حواس باختہ کر دیا۔ موت آئی تو آپ تنہا تو اس دنیا سے سفر نہ کریں گے۔ اترنے کو وہ سامنے کھیت کیسا ہے؟"

ڈاکٹر مضطرب ہو کر بولا۔ "کھیت نہیں، کھیت نہیں، اونچی نیچی جگہ ہو گی۔" پھر ادھر ادھر دیکھ کر چلایا۔ "وہ دیکھو، جدھر دریائے ٹن کا پُل ہے۔ اس کے پار ایک میدان نظر آتا ہے۔ وہاں اتر پڑو۔"

میں بولی۔ "مگر وہ تو حکومت سلطانیہ کا علاقہ ہے۔ وہاں اترنے کے لیے وہاں کا پاسپورٹ ہونا ضروری ہے۔ بہر حال باتوں کا وقت نہیں ہے۔"

کئی دفعہ مجھے بعض پتھریلی وادیوں کے سنسان صحراؤں میں فورسڈ لینڈنگ کرنی پڑی تھی۔ مگر اس رات ڈاکٹر گار کی موجودگی اور رات کی تاریکی نے واقعی مجھے پریشان کر دیا تھا۔

اترنے کو کوئی مناسب جگہ نظر نہ آتی تھی۔ اے اللہ ____ !وہ لمحے! وہ خوفناک لمحے! فضا میں معلق ہونا! ____ نہ زمین پر جگہ نہ آسمان پر مقام! زندگی بچانا بہر حال فرض تھا۔

میں نے کہا۔ "سوائے سرحدِ سلطانیہ کے کوئی قابل اطمینان جگہ مجھے نظر نہیں آتی۔ کیونکہ اندھیرا بہت ہے اور نظر کام نہیں کرتی ____ مجبوراً جرم کرنا پڑے گا۔ سلطانیہ ہی سہی ____ انجن بگڑ چکا ہے۔ اب ہم اتر رہے ہیں۔"

گار نے بے اختیار چلا کر "نیچے؟" کہا اور منہ ہی منہ میں نہایت تیزی سے دعا میں پڑھنے لگا۔ اس کے ہونٹوں کی پھڑپھڑاہٹ اب تک آنکھوں میں ہے۔

میں نے اپنی ہوائی عینک کچھ ڈھیلی کر دی۔ یکایک انجن کی آواز بند ہو گئی اور جہاز جانکنی کی حالت میں سرحد سلطانیہ میں مجبوراً اترنے لگا، بلکہ زمین پر پھینکا جانے لگا۔ میں پوری توجہ اور کوشش سے اس کا توازن قائم رکھ رہی تھی۔

ڈاکٹر گار آنکھوں پر ہاتھ رکھے، کانوں کو رومال سے دبائے ایک نیم بے ہوشی کی سی کیفیت میں بیٹھا تھا۔

(۳)

نیچے اتر کر دیکھتے ہیں تو ایک صحرائی میدان ہے جس میں ایک طرف کچھ فاصلے پر تھوڑی بلندی کے بہت سے ٹیلے ہیں اور جس طرف ٹیلے نہیں ادھر بہت دور تک درختوں کی سیاہ قطاریں چودھویں کے آسمان کے کنارے کو خوابناک بنا رہی ہیں۔

مجھ جیسی خواب اور افسانے کی شیدائی عورت کے لیے یہ سہانا وقت یہ جادو بھرا سکوت، اور یہ چاند کی زرد روشنی پاگل بنانے کو کافی تھی۔ مگر اس وقت شاعرانہ احساسات اور رومانوی تخیلات سے لطف اندوز ہونے کا کسے ہوش تھا۔ ع

"میں زمیں کی پیٹھ کا بوجھ ہوں میں فلک کے دل کا غبار ہوں"

کے مصداق ہم دونوں پریشانی کے عالم میں کھوئے ہوئے کھڑے تھے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف تکتے تھے کہ شاید کسی جگہ روشنی کا کوئی دھبہ یا آبادی کا کوئی سراغ نظر آجائے لیکن نظر جہاں تک کام کرتی تھی تمام منظر چاندنی کی نیند میں آسودہ نظر آرہا تھا۔ اس رات، دنیا کفن میں لپٹی ہوئی پرانی لاش کی طرح چپ چاپ کھڑی تھی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں اور کہاں جائیں؟

ایسے موقعوں پر جہاز رانوں کی تمام امید ٹیلی گراف آفس یا ٹیلیفون سے وابستہ ہوتی ہے کہ کلب میں اطلاع دے کر کسی کو وہاں سے امداد کے لے بلا لیا جائے لیکن اس ویرانے میں جہاں آس پاس آبادی تک کا سراغ نہ تھا یہ توقع فضول تھی کہ کہیں ٹیلی گراف آفس یا ٹیلیفون بھی موجود ہو۔ ہمیں تو یہ بھی علم نہ تھا کہ یہ ملک عہدِ جدید کی ان برکات سے آشنا بھی ہوچکا ہے یا نہیں۔ ذرا دیر بعد ڈاکٹر کی بوڑھی آوز سنائی دی۔ "اب؟"

ڈاکٹر گار کی پریشانی اور بے بسی دیکھ کر باوجود تردّد کے مجھے گدگدی سی محسوس ہوئی۔ میں ہنستی ہوئی بولی۔ "جیسا ارشاد ہو۔"

ڈاکٹر جل گیا۔ "توبہ روحی! تمھیں بھی کیسے واہیات موقعوں پر ہنسی آتی ہے نہ کچھ سوچتی ہو نہ کچھ کرتی ہو۔ ہنستی ہو اور مجھ سے پوچھتی ہو جیسا ارشاد۔"

میں بولی۔ "پھر اور کیا کہوں؟ مجھے کوئی ایسا عمل تو یاد نہیں جس سے جہاز اسی وقت اڑنے کے قابل ہو جائے۔ دن کی روشنی میں اس کے پرزوں کو دیکھ سکوں گی۔ اس وقت اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ رات یہیں کہیں بسر کی جائے۔ کوئی ٹھکانہ تلاش کرنے میں میری نظر اور عقل آپ سے زیادہ کام نہیں کر سکتی۔"

بوڑھا ڈاکٹر گار غالباً مجھے زیادہ متردد اور فکرمند دیکھنا چاہتا تھا اس لیے بولا۔ "اور اگر بغیر پاسپورٹ یہاں آنے پر پکڑ لیے گئے تو پھر؟"

میں بولی "کم از کم رات بسر کرنے کے لیے کوئی جگہ تو مل جائے گی۔"

ڈاکٹر اس جواب سے اس قدر جل گیا کہ غصے کے مارے کچھ نہ بولا۔ منہ ایک طرف موڑ لیا اور ذرا دیر کے پس و پیش کے بعد چپ چاپ سیدھا ایک طرف چل کھڑا ہوا۔

میں لپک کر اس کے قریب پہنچی اور س کا بازو پکڑ کر بولی۔ "کہاں جا رہے ہو ڈاکٹر؟"

ڈاکٹر نے کچھ جواب نہ دیا۔

میں نے کہا۔ "ادھر تو افق تک میدان صاف نظر آ رہا ہے۔ ان ٹیلوں کی طرف تشریف لے چلیے۔ ممکن ہے اُن کے اوپر یا ان کی آڑ میں کوئی بستی یا گھر نظر آ جائے۔"

ڈاکٹر غصے میں تھا۔ میری تجویز پر عمل کرنے میں کسر شان معلوم ہوئی۔ جوش میں کچھ دور خاموش چلا گیا۔ مجبوراً میں بھی ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ اس کی وہ چال یاد آتی ہے تو کبھی کبھی آج بھی ہنسی آ جاتی ہے۔ نیولے کی طرح تیز! اور میں گلہری کی طرح پھدکتی ہوئی اس کے پیچھے! تھوڑی دور چل کر میری تجویز کی معقولیت ڈاکٹر پر واضح ہونے لگی۔ بولے۔ "گھر ٹیلوں کی آڑ میں کون بناتا ہے۔ گھر ٹیلوں کے اوپر بنائے جاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "کیا ضروری ہے کہ یہاں کے وحشی آپ کی طرح جدید طبی اصولوں کے ماہر ہوں؟"

میرے اس فقرے میں کہیں ڈاکٹر کی تعریف کا پہلو نکلتا تھا۔ غصہ کسی قدر فرو ہو گیا۔ مڑ کر بولے۔ "کس طرف چلنے کو کہتی ہو؟"

"اُدھر۔" میں سنجیدہ صورت بنا کر کہا۔

ہم ٹھوکریں کھاتے ٹیلے کے اوپر چڑھنے لگے اور پہنچتے پہنچتے دم پھول گیا۔ ڈاکٹر غریب تو کھڑا ہانپ رہا تھا۔ حواس بجا ہوئے تو ہم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس نئے منظر کو دیکھنے لگے جو اب آنکھوں کے سامنے تھا۔ یکلخت میرے منہ سے نکلا۔ "وہ دیکھو وہ!"

ڈاکٹر نے کہا "کہاں کہاں؟" کہہ کر سر میری طرف جھکا دیا کہ جس چیز کو میں

دیکھ رہی تھی اسے وہ خود میری جگہ سے دیکھ سکے۔ کچھ فاصلے پر مدھم روشنی کی ایک لکیر رہ رہ کر ابھرتی نظر آرہی تھی۔

میں بولی۔ "وہ روشنی بہت دور تو معلوم نہیں ہوتی۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "مجھے تو نظر بھی نہیں آرہی۔"

آخر ہم دونوں اس روشنی کی سمت چل کھڑے ہوئے۔ جیسے جیسے چلتے تھے یہ روشنی دور ہی دور ہوتی چلی جارہی تھی۔ ایک دفعہ تو یہ خیال آیا کہ کہیں غولِ بیاباں نہ ہو۔ میں یکلخت تھم گئی اور ڈاکٹر کے بازو سے چمٹ گئی۔

"چلو بیٹی غولِ بیاباں ہی سہی۔" ڈاکٹر نے جھنجھلا کر کہا۔

ہمیں کافی چلنا پڑا۔ جب کہیں ہم روشنی کے قریب پہنچے۔

(۴)

یہ ایک چھوٹا سا گاؤں معلوم ہوتا تھا۔ جو روشنی ہماری رہنمائی کر رہی تھی وہ ایک خیمے کے دروازے سے نکل رہی تھی۔ باقی گھروں پر فرشتہ خواب پَر پھیلائے ہوئے تھا۔

خیمہ کے قریب پہنچ کر ہم رک گئے۔

ڈاکٹر بولا۔ "بیٹی کیا کریں؟ کیا کہہ کر آواز دیں؟"

میں نے کہا۔ "کیا معلوم اس خیمے میں کون ہے؟"

ہم دونوں بغیر کچھ کہے دبے پاؤں خیمے کی طرف بڑھے۔ سر آگے کو بڑھا کر کان کسی آواز پر لگا رکھے تھے۔ مگر خیمے میں کوئی آواز نہ آرہی تھی۔ وہاں تو موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ مجھے تو ہر وقت یہ ڈر لگا ہوا تھا کہ خیمے میں سے ان گرم مشرقی ممالک کا کوئی پرانا دیو نہ نکل آئے اور نکلتے ہی ہمیں نگل نہ جائے۔

کچھ دیر ہم پس و پیش کرتے رہے پھر یہ رائے ہوئی کہ کسی سوراخ سے جھانک کر اندر کا جائزہ لیں کہ کیا ہو رہا ہے؟

"ایسا کرنا تو جرم ہے۔ بلا اجازت کسی کے خیمے میں جھانکنا۔" ڈاکٹر نے کہا۔
میں بولی۔ "ڈاکٹر اب آپ جرم ورم کرتے رہیں گے تو کچھ نہ ہوگا۔ اتنا بڑا جرم تو کر چکے ہو۔ بغیر پاسپورٹ کے یہاں آئے ہو۔"
سانس روک کر ہم نے آنکھ ایک درز پر رکھی تو عجیب اداس منظر دکھائی دیا ایک چھوٹی سی گول میز کے گرد ادھیڑ عمر کی تین عورتیں لیس کی ٹوپیاں پہنے چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ ان میں سے ایک انگلی کے پوروں پر انگوٹھا رکھ کر جیسے کچھ گن رہی تھی۔ دوسری زمین کی طرف دیکھ کر آہیں بھر رہی تھی اور تیسری آنسو بھری آنکھوں سے چپ چاپ خیمے کی چھت کی طرف تک رہی تھی۔ ان سے کچھ فاصلے پر ایک خوش رو نوجوان گرے رنگ کا سوٹ پہنے ایک صندوق پر غمگین انداز میں نیم دراز تھا۔ بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے اور وہ نہایت اداسی کے عالم میں گہری سانسیں لے رہا تھا۔
ان سب کی اس کیفیت کو دیکھ کر میں گھبرا سی گئی۔ ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ کر اسے پرے لے گئی۔ اور بولی۔ "یہ تو جنات کی بستی معلوم ہوتی ہے۔ میں ان شیطانوں کی پھوپھیوں کے پاس نہ جاؤں گی۔"
ڈاکٹر بولا۔ "شیطان کی پھوپیں ہوں یا سائیں، اب تو رات یہیں بسر کرنی ہوگی۔"
میں ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی رہ گئی مگر وہ نہ مانا۔ بولا۔ "پر اب جائیں کہاں، روحی؟ یہاں چند لوگ جاگ تو رہے ہیں۔ ان سے رات کے لیے پناہ مانگنے میں آخر کیا مضائقہ ہے؟"
یہ کہہ کر ڈاکٹر پہلے کھنکارا پھر بولا۔ "کوئی ہے؟"
ڈاکٹر کی آواز کے پہنچتے ہی اندر ایک ہلچل مچ گئی۔ دبی ہوئی آوازیں اور سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔
اندر سے مرد بولا۔ "کون؟"
ہم جواب نہ دینے پائے تھے کہ اس نے خود آکر دروازے کا پردہ اٹھا دیا اور بولا۔ "آجائیے۔"

ہم نے مجبوراً قدم آگے بڑھائے۔ میں بھی دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ڈاکٹر کے ہمراہ اندر چلی گئی۔ ہمارے استقبال کو تین عورتیں کھڑی ہو گئیں۔
غمگین نوجوان کی آنکھوں میں جیسے یکلخت مسرت کی روشنی چمک اٹھی۔ بولا۔ "خوش آمدید! آپ یہاں اجنبی ہیں نا؟"

ڈاکٹر گار بولا۔ "جی ہاں۔ ہم دونوں ـــــــ"

میں ڈاکٹر کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کا جواب سن کر نوجوان نے سر اٹھا کر مجھے جھانکا۔ پھر مسکرا کر بولا۔ "کوئی مضائقہ نہیں۔ میرے لیے یہی کافی ہے کہ آپ یہاں اجنبی ہیں۔ آپ عین وقت پر پہنچے۔"

یہ سن کر میں ڈاکٹر کے اور قریب ہو گئی۔ ڈاکٹر حیرانی سے نوجوان کا منہ دیکھ کر بولا۔ "عین وقت پر؟"

نوجوان بولا۔ "جی ہاں! میں آپ ہی کی راہ دیکھ رہا تھا۔"

ڈاکٹر اور حیران ہو رہا تھا۔ "ہماری راہ؟"

نوجوان بولا۔ "جی ہاں، آپ کی، بالکل آپ کی۔" معلوم ہوتا تھا کہ نوجوان کی مسرت لمحہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ میری طرف مخاطب ہو کر بولا۔ "تشریف رکھیے خاتون!"

میں کچھ نہ بولی۔ ڈاکٹر کے پیچھے سہمی ہوئی چپ چاپ کھڑی تھی۔ نوجوان میں دیکھتے ہی دیکھتے ایک جوش سا پیدا ہو گیا۔ غمگین نظریں خوشی سے، اور مایوس انداز مستعدی اور امید سے بدل چکے تھے۔ اس کے اس تغیر پر ہم حیران ہو رہے تھے کہ دفعتاً اس نے سوال کیا۔

"یہ خاتون جو آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ کی بیوی تو نہیں؟"

غصے سے میرا تنفس تیز ہو گیا۔ جی چاہتا تھا کہ ایک کرسی اٹھا کر نوجوان پر دے ماروں۔

گار کا چہرہ بھی غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ مگر اس نے وقت کی نزاکت کا خیال کر کے غصے کو بڑے تحمل سے ضبط کیا۔

"یہ میری بیٹی ہو سکتی ہے۔ بیوی کبھی نہیں ہو سکتی۔ لیکن آخر اس سے آپ کا مطلب؟"

یہ سن کر نوجوان نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا۔ مسکرا کر زمین کو دیکھا پھر میری طرف مخاطب ہو کر بولا۔ "تشریف رکھیے خاتون۔"

ڈاکٹر نوجوان کو غور کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ "تو کیا آپ کو پہلے سے علم تھا کہ آج کی رات قسمت ہمیں یہاں لا گرائے گی؟"

نوجوان نے بڑھ کر ایک کرسی میری طرف بڑھائی۔ بولا۔ "علم تو نہیں تھا۔ مگر آپ جانیے دنیا بہ امید قائم۔"

ایک بڑھیا جو گلابی رنگ کے لباس میں ملبوس تھی بول اٹھی۔ "یوں کہیے کہ ہم دلہنوں کی قسمت پھوٹ گئی۔"

دوسری بوڑھی نے کہا۔ "آپ لوگوں کو آج ہی مہمان بن کر آنا تھا؟"

نوجوان نے کہا۔ "آج ہی کی رات تو ان کی ضرورت تھی۔ یہ لوگ تو خدا کی طرف سے بھیجے گئے ہیں! ایسے اتفاق زندگی میں کم ہوتے ہیں۔ ایسے اتفاق تو اکثر قصے کہانیوں ہی میں پڑھے تھے۔"

ڈاکٹر پریشان لہجے میں بولا۔ "آپ لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

"سب کچھ سمجھ میں آجائے گا۔" نوجوان بدستور مسکرا رہا تھا۔ مجبوراً ڈاکٹر نے اس امید میں عورتوں کی طرف توجہ کی کہ شاید وہ کوئی معقول بات کریں۔ مگر ڈاکٹر کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر ایک نے شرما کر نظر نیچی کر لی۔ دوسری لجا کر انگوٹھے سے انگلیوں کے ناخن ملنے لگی۔ تیسری نے گھبرا کر بند منہ میں زبان کو گھمانا شروع کر دیا۔

ڈاکٹر گار بے کسی کے لہجہ میں بولا۔ "محترم خواتین! ہم دونوں پردیسی مسافر ہیں۔ رات بھر کے لیے پناہ مانگتے ہیں۔ آپ بجائے اس کے کہ ہمیں سونے کے لیے تھوڑی سی جگہ عنایت فرمائیں معموں میں باتیں کرنے اور ہم سے پہیلیاں بجھوانے لگیں!"

عورتوں کو شروع ہی سے ہمارے آنے پر اعتراض تھا۔ بظاہر وہ ہم سے کچھ

جلی ہوئی تھیں۔ چنانچہ تیسری نے چھوٹتے ہی کہا۔ "آپ جیسے ناخواندہ مہمانوں کی تواضع کیسی؟"

مگر نوجوان بولا۔ "جناب! سب انتظام ہو جائے گا۔ بے فکر رہیے۔ یہ نیاز مند خود سب انتظام کر دے گا۔ مگر ذرا اطمینان تو ہو جائے۔"

ڈاکٹر بولا۔ "کیسا اطمینان؟"

نوجوان نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "آپ تو گھبرا گئے۔ گھبرائیے نہیں۔ بڑا آسان کام ہے اچھا بھلا میرے ایک سوال کا تو جواب دیجیے۔"

"حاضر ہوں سوال کیجیے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"آپ شادی شدہ ہیں یا غیر شادی شدہ؟"

ڈاکٹر نے سر موڑ کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اپنی سہمی ہوئی نظریں اس سے ملائیں۔ ہم دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کہا کہ "دیوانوں کے ہاتھوں میں پھنس گئے۔"

نوجوان ہمہ تن انتظار تھا۔ مجبوراً ڈاکٹر بولا۔ "صاحب میری بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔"

نوجوان کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ "انتقال ہو چکا ہے؟ سبحان اللہ، سبحان اللہ پھر تو نجات ہے۔ مکمل نجات۔"

ایک عورت نے تیز نظروں سے نوجوان کو دیکھا۔ "دیکھو تم ظلم کرنے پر آمادہ نظر آتے ہو۔ اس کا نتیجہ خراب ہے۔"

بڑھیا کی اس بات پر ہم چونکے۔ مگر نوجوان نے کوئی پرواہ نہ کی۔ کہنے لگا "اچھا تو میرے مہربان! ایک بات اور۔ ان تین خواتین کے حسن کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟"

ڈاکٹر گار کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ غصے اور ہیبت سے اس کا چہرہ عجیب سا ہو گیا تھا۔ اس نے رکھائی سے کہا۔ "ان خواتین کی موجودگی میں آپ کا یہ سوال نہایت بے ہودہ ہے!"

نوجوان بولا۔ "تو آپ کا یہ مطلب ہے کہ یہ خواتین بد صورت ہیں؟"

ڈاکٹر نے بگڑ کر جواب دیا۔ "میں نے ہر گز بد صورت نہیں کہا۔"

نوجوان ہنسی دبا کر بولا۔ "تو گویا خوبصورت ہیں، واہ وا، واہ وا، واہ وا اور انھوں نے سروں پر جو سفید لیس کی ٹوپیاں پہن رکھی ہیں یہ ان کے حسن کو چار چاند لگا رہی ہیں یا نہیں؟"

ڈاکٹر کچھ نہ بولا۔ نوجوان اس کے قریب آگیا اور بولا۔ "آپ کو میری ہی قسم۔ اس سوال کا جواب آپ کو ضرور دینا ہو گا۔"

ڈاکٹر خون کا گھونٹ پی کر بولا۔ "لگا رہی ہیں!"

نوجوان نے بڑھ کر خوشی کے مارے ڈاکٹر کا منہ چوم لیا اور ایک بے خودی کی سی کیفیت میں ناچنے لگا اور بار بار کہتا۔ "اجنبی، مناسب عمر، رنڈوا، حسن شناس، سگار کا قدر دان۔ اللہ میاں تمھارا شکریہ کس طرح ادا کروں؟"

تینوں بوڑھیوں نے چلا کر کہا۔ "تمھیں شرم نہیں آتی؟ ناموس کا خیال نہیں؟"

ڈاکٹر گار نے منہ ہی منہ میں کہا۔ "عجیب مصیبت میں پھنسے، اس سے تو اچھا یہی تھا کہ جہاز کے سائے میں رات کاٹتے۔ آخر یہ کیا تماشہ ہے؟"

میں نے ڈاکٹر کا بازو دبایا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے دبی زبان سے اسے واپس بھاگ چلنے کے لیے کہا۔ چنانچہ ہم نے نوجوان کو ناچنے میں مصروف دیکھ کر چپ چاپ دروازے کا رخ کیا۔

(۵)

جوں ہی ہم دروازے کی طرف چلے نوجوان ناچتے ناچتے رک گیا۔ لپک کر ہماری طرف آیا۔ بولا۔ "آپ چلے کہاں؟"

ڈاکٹر نے کہا "ہم نے آپ کو بہت تکلیف دی۔ اب جاتے ہیں کہیں اور جگہ

تلاش کریں گے۔"

نوجوان نے مسکرا کر کہا۔ "بس روٹھ گئے ـــــــ توبہ کیجیے اب آپ جا کہاں سکتے ہیں؟ میں آپ کو سر آنکھوں پر جگہ دوں گا۔ حضرت آپ کی جگہ تو میرے دل میں ہے۔ ان تین حسین خواتین کے پہلو میں ہے۔ آپ آیئے تو۔"

ڈاکٹر گار بے حد غصّے میں بولا۔ "آپ پاگل معلوم ہوتے ہیں۔ ہمیں جانے دیجیے۔"

نوجون لپک کر دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ اور اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر باہر جانے کا راستہ روک دیا اور بولا۔ "بخدا میں آپ کو نہ جانے دوں گا۔ بس ایک کام ہونے تک آپ ٹھیرے رہیے۔ پھر آپ کو اختیار ہے۔"

ڈاکٹر نے رُکھائی سے پوچھا۔ "کیا کام؟"

نوجوان نے بڑی بے تکلفی سے جواب دیا۔ "نکاح!"

ڈاکٹر نے حیران ہو کر پوچھا۔ "نکاح؟ کس کا؟"

نوجوان نے بڑے وثوق سے پوچھا۔ "جناب کا!"

ڈاکٹر پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دیکھ کر جھنجھلا کر بولا۔ "آپ کیا بک رہے ہیں؟"

"بک نہیں رہا ہوں۔" نوجوان نے کہا۔ "سچ عرض کر رہا ہوں۔ آپ کا نکاح ان تین حسین خواتین سے! اسی لیے تو میں اب تک آپ پر یہ ناگوار جرح کر تا رہا۔"

بڑھیوں کی عجیب حالت تھی۔ غصّے سے پھلکی کی طرح ناک پھولی ہوئی تھی، تینوں میں جو بہت تیز تھی کہنے لگی۔ "یہ ظلم ہے، تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

نوجوان بولا۔ "میں وہی کرنا چاہتا ہوں جو تھوڑی دیر پہلے مجھ سے کہا گیا تھا۔"

دوسری بڑھیا بولی۔ "یہ کوئی زبردستی تھوڑا ہی ہے؟"

نوجوان بولا۔ "شادی بیاہ کے معاملات میں اس قسم کا انکار نہیں سنا جاتا۔ یہی باتیں جب میں نے کی تھیں تو سب لوگ مجھ پر ہنس رہے تھے یا نہیں؟" یہ سن کر تینوں بڑھیاں غصّے سے ہانپتی دوسرے خیمے میں چل گئیں۔

ڈاکٹر نے انتہائی غصے سے کہا۔ "یہ سب کیا تماشہ ہے؟ ہم پاگل ہو گئے ہیں یا آپ لوگ جنونی ہیں؟ یہ کوئی لمبا خواب ہے؟ میرے کان کیا سن رہے ہیں؟ اور میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں؟"

"وہی۔" نوجوان نے مسکرا کر کہا۔ "وہی عجیب باتیں جو میں نے تھوڑی دیر پہلے سنی تھیں۔ وہی عجیب منظر جو چند گھنٹے پہلے میری آنکھوں نے دیکھا تھا اب آپ سن اور دیکھ رہے ہیں۔"

ڈاکٹر کہنے لگا۔ "اب ان باتوں کو رہنے دیجیے۔ جناب بدقسمتی سے ہمارا ایروپلین یہاں گر پڑا ہے۔ ہم عزت والے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ آپ ہم سے عزت کا برتاؤ کریں گے۔"

کچھ سوچ کر نوجوان نے جلدی سے پوچھا۔ "آپ کا ایروپلین یہاں گرا ہے؟ آپ یہاں کس غرض سے آئے تھے؟"

ڈاکٹر نے کہا۔ "ہماری نیت ادھر آنے کی نہ تھی۔ ہم دریائے شون کے دوسرے کنارے پر اڑنے نکلے تھے۔ اتفاق سے انجن بگڑ گیا اور ادھر آ گرے۔"

نوجوان نے پوچھا۔ "تو غالباً جناب کے پاس پاسپورٹ نہیں ہے؟"

ڈاکٹر نے میری طرف دیکھا۔ میں ویسی ہی چپ رہی۔ ڈاکٹر نے بھی کوئی جواب نہ دیا۔

"آپ کا ایروپلین کہاں ہیں؟"

ڈاکٹر نے کچھ جواب نہ دیا۔ اشارے کے لیے ہاتھ اس طرف کو اٹھا دیا جس طرف سے ہم پیدل آئے تھے۔

نوجوان نے ایک اور سوال کیا۔ "آپ کا جہاز چلا کون رہا تھا؟"

ڈاکٹر نے آہستہ سے میری طرف اشارہ کر دیا۔

"یہ خاتون؟" نوجوان نے اتنا کہا اور نہایت بے فکری سے قدم اٹھاتا لکڑی کے صندوق تک پہنچا اور س پر اس انداز سے بیٹھ گیا گویا کوئی مطلق العنان حکمران ہے اور ہماری قسمت کا فیصلہ سنانے کو ہے۔

(۶)

نوجوان نے کہنا شروع کیا۔ "میرے معزز مہمان! اب آپ کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ آپ شادی کر لیں۔ کیونکہ ______ "

ڈاکٹر گار قوت ضبط کھو چکا تھا، چلا کر کہا۔ "پاگل آدمی! کیا واہیات رٹ لگا رکھی ہے۔ شادی! شادی! کس کی شادی۔ کیوں شادی؟ تم کون ہوتے ہو یہ لفظ منہ سے نکالنے والے؟"

نوجوان آدمی نے کہا۔ "آپ کو بھولنا نہیں چاہیے کہ آپ مجرم ہیں۔ آپ بغیر پاسپورٹ کے ایرو پلین اس ملک میں لائے ہیں۔ حکام کو اس جرم کا علم ہو جائے تو آپ گرفتار کیے جا سکتے ہیں۔ اگر آپ نے یہ جرم نہ کیا ہوتا تو شادی جب بھی آپ کو کرنی ہی پڑتی۔ اب آپ کی خاطر میں اتنی رعایت کر سکتا ہوں کہ آپ چپ چپاتے شادی پر رضامند ہو جائیں تو آپ کو قید و بند کی مصیبت سے بچالوں۔"

ڈاکٹر جھنجھلا کر بولا۔ "جائیے، آپ حکام کو خبر دار کر دیجیے۔ آپ جیسے نامعقول شخص سے واسطہ پڑنے سے یہ بہت بہتر ہے کہ ہم گرفتار کر لیے جائیں۔"

نوجوان نے ہلکی ہنسی کے بعد کہا۔ "لیکن حکام بھی آپ کو اور کوئی سزا دیں یا نہ دیں آپ کی شادی ضرور کر دیں گے۔ ان خواتین سے نہ کریں گے تو ان کی سی چند اور خواتین آپ کے لیے منتخب کر لی جائیں گی۔"

ڈاکٹر نے غصہ سے کہا۔ "حکام آپ کی طرح دیوانے نہیں ہو سکتے۔"

نوجوان نے ہنس کر کہا۔ "آپ کو غالباً علم نہیں کہ گزشتہ چند سالوں کی جنگ میں سلطانیہ کے بے شمار مرد کام آئے اور ان کی تعداد بے حد گھٹ گئی ہے۔ بمقابلہ مردوں کے عورتوں کی تعداد بے حد زیادہ ہے۔ حکومت کے آگے یہ مسئلہ درپیش تھا کہ زائد عورتوں کا کیا جائے اور ملک کی گھٹتی ہوئی آبادی کیونکر بڑھائی جائے۔ اس کے سوا چارہ نظر نہ آیا کہ تعدد ازدواج کا قانون پاس کر دے۔ آج کل سلطانیہ کے ہر گھر میں کئی خواتین راج کر رہی ہیں۔ ہر مجرم اور ہر اجنبی کے لیے یہ حکم

ہے کہ کم از کم تین عورتوں سے فوراً اس کی شادی کردی جائے۔ حسنِ اتفاق سے آپ اجنبی بھی ہیں اور مجرم بھی۔ چنانچہ آپ اپنے متعلق قانون کے اس فیصلے کو اٹل سمجھیے کہ آپ کو یہاں کم از کم تین خواتین کے شوہر بننے کا فخر حاصل ہوگا۔"

یہ سن کر میں اور ڈاکٹر ششدر رہ گئے۔ اب ہم پر نوجوان کی بہکی بہکی باتوں کا راز بہت کھل چکا تھا۔ میں نے حالات پر غور کرکے آہستہ سے ڈاکٹر کے کان میں کہا۔ "خیر ڈاکٹر شادی کر ہی لو۔" میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

ڈاکٹر بت بنا حالات سن رہا تھا۔ "ستم ستم! بٹی روحی! اب کیا کیا جائے اخبارات میں حکومتِ سلطانیہ کے حالات پڑھنے تمھیں یاد بھی ہوں گے۔ یہ سب مصیبت کا ہے کو پڑتی۔ اگر میں نے جہاز میں بیٹھنے سے انکار کر دیا ہوتا۔ اب عین وقت پر تم بھی بدل گئیں اور کہتی ہو شادی کرلو۔"

نواجوان کہنے لگا۔ "خاتون دور اندیش ہیں۔ اس کے سوا چارہ نہیں، آپ برے پھنسے۔"

ڈکٹر نے چنگھاڑ کر کہا۔ "میں کیوں پھنستا۔ یہ بھی کوئی زبردستی ہے؟"

نوجوان نے کہا۔ "جی ہاں! بالکل زبردستی۔ اس میں رضامندی یا خوشی کا خفیف سا بھی دخل نہیں ہے۔ تھوڑی ہی مدت ہوئی یہی صورتِ حال مجھے پیش آئی تھی۔ مجھے 'کیباس' کے ایک تاجر نے بھیجا تھا کہ سلطانیہ میں پٹرول پمپ لگانے کے متعلق حکومت سے معاملہ کروں۔ مجھے جدید قانون کا علم نہ تھا۔ یہاں پہنچتے ہی دھر لیا گیا اور سرکاری طور پر میرے نکاح کی بات چیت ان تین حسین خواتین کے بزرگوں سے ہونے لگی جنھیں آپ نے بھی ابھی دیکھا ہے۔ میں نے بہتیری عرضیاں دیں۔ افسروں کی منتیں خوشامدیں کیں۔ بہتیرا یقین دلایا کہ میں شریف اور معزز آدمی ہوں اور ان کا یہ سلوک میرے ساتھ نہایت واہیات ہے لیکن کچھ نتیجہ بر آمد نہ ہوا۔ قانون کے آگے کس کی چلتی ہے؟ اور یہاں کے قانون کے آگے اجنبی کی بھلا کیا چلے؟ میرے لیے صرف اس قدر رعایت کی گئی کہ اگر میں دو ہفتے کی مدت میں اپنی بجائے اور مردم بہم پہنچادوں تو مجھے یہاں سے تنہا رخصت کی اجازت مل جائے گی۔ میرے

گزشتہ چودہ دن 'کپاس' کے لوگوں کو چٹھیاں لکھتے گزر گئے۔ رشتہ داروں، دوستوں سے خوشامد کی کہ خدارا میرے بجائے شادی کا خواستگار کوئی دوسرا آدمی یہاں روانہ کردو۔ مگر کسی خدا کے بندے کو میری حالتِ زار پر ترس نہ آیا۔ اجنبیوں کی تلاش میں پھرتے پھرتے میری جوتیاں گھس گئیں۔ لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا یہاں تک کہ آج کا اندیشناک دن آگیا۔ آج ہی میری تقدیر نکاح کے ذریعہ ان خواتین سے وابستہ کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ آج ہی میری مشکل کشائی کو آپ یہاں وارد ہو گئے۔"

یہ تفصیل معلوم کر کے ڈاکٹر کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ میں بھی کانپنے لگی۔ رہ رہ کر آنسو خشک کر رہی تھی۔

ڈاکٹر نے بکیسانہ انداز میں کہا۔ "روحی! ______ اب کیا ہوگا؟ یہ سب تمھاری شرارت ہے ناحق مجھے یہاں لا پھنسایا۔ دیکھیے اب مصیبتوں سے نجات کیونکر ملتی ہے۔ عین وقت پر تم بھی بدل گئیں۔"

میں بولی : "ڈاکٹر پھر کیا کروں؟ میں نے بے حد مجبوری سے یہ صلاح دی تھی۔ میری تو یہی آرزو ہے کہ مالک تمھیں ان مصائب سے نجات دے۔"

نوجوان نے مترحم نگاہ سے دیکھ کر کہا۔ "غریب اجنبی اور قابلِ رحم لڑکی! مجھے دلی افسوس ہے کہ میں انتہائی خود غرضی پر کمربستہ ہو گیا ہوں۔ لیکن معاف کیجیے صورت حالات ہی کچھ ایسی ہے۔ میں آپ سے زیادہ قابل رحم ہوں۔ آپ بہر حال بزرگ ہیں۔ میں نوجوان ہوں۔ زندگی میرے لیے ایک خوش رنگ شراب ہے اور میں نے ابھی اس شراب کو چھوا بھی نہیں۔ آپ کا نشہ اتر چکا ہے۔ چنانچہ میں اس بات کا زیادہ مستحق ہوں کہ یہاں سے جان چھڑا کر بھاگ نکلوں۔ میں ان خواتین کو آپ سے وابستہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں انھیں الگ کیے دیتا ہوں۔ اب آپ کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ یا تو ان حورِ وش خواتین کو میرے ہاتھ سے قبول فرمایئے اور یا قانون کے شکنجے میں پھنس کر علاوہ تین خواتین کے کچھ سزا بھی پایئے۔"

ڈاکٹر غریب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

(۷)

سفیدۂ سحر کے نمودار ہونے میں دو تین ہی گھنٹے باقی ہوں گے کہ اس جنجال کا قطعی فیصلہ دن کی روشنی پر اٹھا رکھ کر نوجوان نے ہمیں آرام کرنے کی دعوت دی۔ اس خیمے سے لگے ہوئے دو اور خیمے تھے جن میں پلنگ اور بستر موجود تھے، نوجوان نے بتایا کہ یہ تین خیمے اس کی دلہنوں کے بزرگوں نے اس کے لیے بہم پہنچائے ہیں۔

ایک خیمے میں دلہنیں جا چکی تھیں۔ دوسرا مجھے دے دیا گیا۔ لیکن ڈاکٹر گار کو نظروں سے اوجھل کرنا مناسب نہ سمجھا گیا۔ اس لیے ڈاکٹر گار کو اسی خیمے میں نوجوان کے ساتھ رہنا پڑا جس میں یہ سب ڈراما ہوا تھا۔

نیند تو کسے آتی؟ مگر وحشت اور پریشانی نے اعصاب کو اتنا مضمحل اور کمزور کر دیا تھا کہ جوں ہی میں خیمہ میں گئی لیٹ گئی۔ آخر کروٹیں بدلتے بدلتے آنکھ لگ ہی گئی۔

ابھی میں پوری طرح سوئی بھی نہ تھی کہ یکلخت مجھے محسوس ہوا کہ کسی نے میری چارپائی زور سے دھکیلی۔ چارپائی خیمے کی دیوار کے ساتھ ہی لگی ہوئی تھی۔ دھکیلنے والا ضرور باہر تھا۔

میں وحشت زدہ ہو گئی اور بستر سے کود کر بھاگی۔ دیکھا تو نوجوان وہاں کھڑا تھا اور انگلی ہونٹوں پر رکھ کر مجھے چپ ہونے کا اشارہ کر رہا تھا۔ میں بہت سخت ڈری ہوئی تھی۔

میرے قریب آکر آہستہ سے بولا۔ "خوف نہ کیجیے، ادھر آیئے۔ یہ بتایئے آپ کے ہوائی جہاز میں کیا خرابی ہو گئی ہے؟ کوئی معمولی سا نقص ہے یا بڑا نقص؟"

میں آہستہ سے بولی۔ "چند گھنٹے ہوئے بالکل درست تھا۔ غالباً کسی ڈھیلے پُرزے کو کسنے کی ضرورت ہو گی۔ آپ کے پاس کوئی ٹرن سکرُو ہو گا؟"

نوجوان نے کہا: "صبح نمودار ہو رہی ہے۔ کوئی معمولی سا کام ہے تو میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔ اس وقت چپکی چلی چلیے، ورنہ بستی جاگ اٹھی تو طرح طرح کی الجھنیں پڑ جائیں گی۔"

نوجوان کا سنجیدہ اور متردد چہرہ دیکھ کر مجھے مناسب معلوم ہوا کہ فوراً اس کی ہدایات پر عمل کیا جائے۔

بیسا ختگی میں میری زبان سے نکلا۔ "اور ڈاکٹر؟"

نوجون نے اسی سنجید گی سے کہا۔ "روتے روتے ابھی آنکھ لگی ہے۔ مجھے ان پر بے حد ترس آرہا ہے۔ خاتون ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ پہلے جہاز کو ایک نظر دیکھ لیجیے۔ نجات کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ جہاز کو اڑنے کے قابل بنایا جائے۔"

میں بولی۔ "یہ اچھا ترس ہے کہ ڈاکٹر کو یہاں تنہا چھوڑ دیا جائے۔ یہ مجھ سے ہر گز نہ ہوگا۔"

نوجون نے بے چین ہو کر کہا۔ "آپ دیر لگا رہی ہیں۔ ہم میں سے کسی ایک کا یہاں رہنا ضروری ہے۔ اگر خالی خیمے کسی نے بھی دیکھ لیے تو ذرا سی دیر میں یہاں ہلچل مچ جائے گی۔ دوسروں کے اطمینان کے خیال سے فی الحال انھیں یہیں رہنے دیجیے۔"

میں نے بگڑ کر کہا۔ "اور آپ کو جہاز میں واپس اڑا لے جاؤں؟"

نوجوان نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ وقت ضائع کر رہی ہیں! باتوں کا وقت نہیں ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر آپ نے چند منٹوں کی بھی دیر لگائی تو آپ کا بھی وہی حشر نہ ہو جو ہمارا ہوا ہے۔ مزید برآں جہاز درست ہو گیا تو ڈاکٹر کو ساتھ لے چلنا ہمارے لیے کچھ دشوار نہ ہوگا۔"

ہم دونوں جہاز کی طرف بھاگے۔

(۸)

پون گھنٹے کی دیکھ بھال اور مسلسل محنت کے بعد مجھے خیال ہوا کہ جہاز درست ہو گیا ہے لیکن جب تک اس کی آزمائش نہ کر لیتی کیا پتہ لگ سکتا تھا۔

چنانچہ میں پائلٹ کی سیٹ پر بیٹھ گئی اور نوجوان سے کہا۔ "آپ براہِ کرم

جہاز کے بلیڈ گھمادیں اور انجن کو رواں کر دیں۔ میں ذرا اپنا اطمینان کرنا چاہتی ہوں۔"

لیکن اس نے ابھی بلڈ گھمانے کے لیے ہاتھ اٹھائے ہی تھے کہ ٹیلے کے اوپر سے ڈاکٹر کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ "روحی! روحی! مجھے اکیلا چھوڑ آئیں؟ مجھے بچاؤ خدا کے لیے مجھے بچاؤ۔"

یہ کہتا ہوا وہ اندھادھند ٹیلے سے ہماری طرف اترنے لگا۔ کہیں پھسلتا، کہیں ٹھوکریں کھاتا لیکن پیچھے مڑ کر دیکھتا اور پھر بھاگ کھڑا ہوتا تھا۔ وہ پچاس گز بھی نہ بڑھنے پایا تھا کہ ٹیلے کے اوپر تینوں دلہنیں معہ چند مردوں کے نمودار ہو گئیں۔ وہ غل مچارہی تھیں اور پیچھے مڑ مڑ کریوں دیکھ رہی تھیں جیسے اور لوگوں کو امداد کے لیے پکار رہی ہیں۔

نوجوان چلایا۔ "ہائے بھانڈا پھوٹ گیا! اب پکڑے گئے۔ ہم دونوں کا نکاح ایک درجن عورتوں سے پڑھایا جائے گا۔"

وہ جلدی سے بلیڈ گھما کر جہاز میں سوار ہو گیا اور بولا۔ "خاتون! جلدی کرو ـــــــ جہاز چل پڑا تو بچ گئے۔ ورنہ تقدیر!"

انجن کے بلیڈ پھرتے دیکھ کر ڈاکٹر کی بیقراری کا ٹھکانہ نہ رہا۔ پاگلوں کی طرح بگٹٹ دوڑا۔

"روحی! مجھے چھوڑ کر نہ جانا ـــــــ چھوڑ کر نہ جانا۔"

پیچھے سے آوازیں آرہی تھیں۔ "پکڑنا۔ پکڑنا ـــــــ جانے نہ دینا۔"

اور پتہ نہیں کا کیا خوفناک جملے تھے جو جہاز کے انجن کی آواز کے سبب سنائی نہ دیتے تھے۔ اب تعاقب کرنے والوں میں اور ڈاکٹر میں بیس گز کا فاصلہ نہ رہا تھا۔

میرا دل دَھک دَھک کر رہا تھا۔

ایک طرف ڈاکٹر کی فکر۔ دوسری طرف انجن کا تردد کہ اگر جہاز نہ اڑ سکا تو کیا ہو گا؟

ڈاکٹر یکلخت دھم سے آ کر جہاز سے ٹکرایا اور فوراً بے ہوش ہو گیا۔ نیچے گرا ہی چاہتا تھا کہ فوراً نوجوان نے اس کے دنوں ہاتھ پکڑ لیے اور اسے اوپر کو گھسیٹا۔ میں دھڑکتے ہوئے دل سے ڈاکٹر کے یہاں پہنچنے کا انتظار کر رہی تھی۔ نوجوان کے ہاتھ

میں اس کا ہاتھ آنا تھا کہ میں نے جہاز کا انجن آدھا کھول دیا اور بریک آہستہ سے اپنی طرف کھینچ لی۔ نوجوان نے پوری طاقت سے کام لے کر لٹکتے ہوئے ڈاکٹر کو اندر کھینچ لیا۔ ساتھ ہی دعائیں مانگنے لگا کہ "خدایا جہاز اڑنے لگے، خدایا جہاز اڑنے لگے۔"

جہاز جگہ سے سرکا ہی تھا کہ تعاقب کرنے والے وہاں آپہنچے اور جہاز کے پیچھے بھاگنے لگے اور پتھر اٹھا اٹھا کر اس پر پھینکنے لگے۔

میرا دل سینے میں اڑا جا رہا تھا۔ ساری توجہ اس طرف لگی ہوئی تھی کہ جہاز اڑنے میں کامیاب ہوتا ہے یا نہیں۔ نہ ہوا تو کیا ہوگا؟

میں نے پورا انجن کھول دیا۔ یکلخت جہاز نے صعود کیا اور پھر چشم زدن میں بریک کے کھینچتے ہی فضا میں پرواز کرنے لگا۔

میرے اور نوجوان کے منہ سے ایک قہقہہ نکل گیا۔

(۹)

اب ڈاکٹر گار مندرجہ ذیل قسمیں کھا چکے ہیں:

(۱) ہوائی جہاز میں کبھی سوار نہ ہوں گے۔

(۲) جہاں کہیں تین عورتیں یکجا نظر آئیں وہ پل بھر کے لیے بھی نہ ٹھہریں گے۔

(۳) کبھی کسی کے خیمے میں نہ جائیں گے!!!

رشید جہاں

ڈاکٹر رشید جہاں ۲۵ اگست ۱۹۰۵ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے لیڈی ہارڈنگ کالج سے ایم، بی، بی، ایس کی ڈگری حاصل کی تھی۔ انھوں نے اٹھارہ سال کی عمر میں انگریزی میں ایک کہانی 'سلمیٰ' تحریر کر کے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔

رشید جہاں ایسے ماحول میں پیدا ہوئیں اور پروان چڑھیں، جو عملاً تعلیمِ نسواں کا علمبردار تھا۔ ان کے والد شیخ عبداللہ مسلم گرلز اسکول اور ویمنس کالج علی گڑھ کے بانی تھے۔ اس لیے کم عمری ہی سے ملک کے سماجی مسائل میں رشید جہاں کی دلچسپی کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ قومی تحریک کے ساتھ ان کی دلچسپی اتنی بڑھتی گئی کہ انھوں نے چودہ سال کی عمر سے ہی کھدر پہننا شروع کیا۔

۱۹۳۱ء میں لکھنؤ میں وہ ترقی پسندوں کے حلقے کے قریب آئیں۔ ان کے شوہر محمود الظفر، کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن تھے اور بعد میں پارٹی کے ہمہ وقتی کارکن ہو گئے تھے۔ رشید جہاں بھی اشتراکی سیاست سے وابستہ تھیں۔ وہ اپنے پیشے ڈاکٹری کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے بھی سماجی بہبود، ترقی پسند تحریک اور اپنی کاوشوں کے ساتھ جوش و خروش کے ساتھ جڑی رہیں۔ بقول آلِ احمد سرور "رشید جہاں انجمن ترقی پسند مصنفین اور انڈین پیوپلز تھئیٹر کی روحِ رواں تھیں۔"

رشید جہاں نے افسانے اور ڈرامے تحریر کیے۔ ان کی تخلیقات 'نیا ادب' (لاہور) میں مستقل طور پر شایع ہوتی رہیں۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "عورت" کے نام سے شایع ہوا۔ ان کا ایک ڈرامہ "آصف جہاں کی بہو" نیا ادب میں شایع ہو کر خاصی داد حاصل کر چکا ہے۔ مصروف زندگی اور ہمہ جہت کار کردگیوں کی بنا پر ان کی اکثر تخلیقات مسوّدوں کی شکل میں ہی رہ گئیں۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے منتخب افسانوں کا ایک اور مجموعہ "شعلۂ جوالہ" کے نام سے شایع ہوا۔ اس انتخاب میں ان کے کچھ ریڈیائی ڈرامے بھی شامل ہیں۔

رشید جہاں زندگی کے ہر محاذ پر برسر پیکار رہیں۔ انھیں ایلیا اہرن برگ کے ناول 'سٹارم' (Storm) کے اس کردار سے مشابہت دی جاتی ہے، جس نے دوسری جنگِ عظیم میں بربریت اور انسانیت کے درمیان مرتے وقت اپنے دوستوں سے کہا تھا "جب روشنی کے دن آئیں تو اتنا یاد کر لینا کہ ہم نے بھی گھٹاٹوپ اندھیرے میں اجالے سے محبت کی ہے۔" بقول پروفیسر سرور "رشید جہاں بھی ایسا ہی ایک کردار ہے۔ اس جیالی عورت، زندگی کی دلدادہ اور اجالے کی اس پرستار کی یاد ہمارے لیے گرمی و روشنی کا ایک پیام ہے، جسے وقت کا دھندلکا بھی مدھم نہیں کر سکتا۔"

۲۹ جولائی ۱۹۵۲ء تقریباً چھیالیس سال کی عمر میں وہ سَرطان کے مرض کے ساتھ لڑتے ہوئے ماسکو میں انتقال کر گئیں۔

رشید جہاں

دلّی کی سیر

"اچھی بہن ہمیں بھی آنے دو۔" یہ آواز دالان میں سے آئی، اور ساتھ ہی ایک لڑکی کرتے کے دامن سے ہاتھ پونچھتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ ملکہ بیگم ہی پہلی تھیں جو اپنی سب ملنے والیوں میں پہلے پہل ریل میں بیٹھی تھیں اور وہ بھی فرید آباد سے چل کر دہلی ایک روز کے لیے آئی تھیں۔ محلہ والیاں تک ان کی داستانِ سفر سننے کے لیے موجود تھیں۔ "اے ہے آنا ہے تو آؤ! میرا منہ تو بالکل تھک گیا۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو سیکڑوں ہی بار تو سنا چکی ہوں۔ یہاں سے ریل میں بیٹھ کر دلّی پہنچی اور وہاں ان کے ملنے والے کوئی نگوڑے اسٹیشن ماسٹر مل گئے۔ مجھے اسباب پاس چھوڑ کر رفوچکر ہوئے اور میں اسباب پر چڑھی برقع میں لپٹی بیٹھی رہی۔ ایک تو کمبخت برقع، دوسرے مردودے مرد تو ویسے ہی خراب ہوتے ہیں، اور اگر کسی عورت کو اس طرح بیٹھے دیکھ لیں تو اور چکر پر چکر لگاتے ہیں۔ پان کھانے تک کی نوبت نہ آئی۔ کوئی کمبخت کھانسے، کوئی آوازے کسے، اور میرا ڈر کے مارے دم نکل جائے۔ اور بھوک وہ غضب کی لگی ہوئی کہ خدا کی پناہ! دلّی کا اسٹیشن کیا ہے بُوا قلعہ بھی اتنا بڑا نہ ہوگا۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی اسٹیشن ہی اسٹیشن نظر آتا تھا، اور ریل کی پٹریاں، انجن اور مال گاڑیاں۔ سب

سے زیادہ ڈر مجھے ان کالے کالے مردودوں سے لگا جو انجن میں رہتے ہیں۔

"انجن میں کون رہتے ہیں؟" کسی نے بات کاٹ کر پوچھا۔

"کون رہتے ہیں؟ نہ معلوم بوا کون! نیلے نیلے کپڑے پہنے، کوئی ڈاڑھی والا، کوئی صفاچٹ۔ ایک ہاتھ سے پکڑ کر چلتے انجن میں لٹک جاتے ہیں۔ دیکھنے والوں کا دل سن سن کرنے لگتا ہے۔ صاحب اور میم صاحب تو بوا دلّی اسٹیشن پر اتنے ہوتے ہیں کہ گنے نہیں جاتے۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گٹ پٹ کرتے چلے جاتے ہیں۔ ہمارے ہندوستانی بھائی بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تکتے رہتے ہیں۔ کم بختوں کی آنکھیں نہیں پھوٹ جاتیں۔ ایک میرے سے کہنے لگا "ذرا منہ بھی دکھا دو۔ میں نے فوراً۔۔۔۔"

"تو تم نے کیا نہیں دکھایا؟" کسی نے چھیڑا۔

"اللہ اللہ کرو بوا۔ ان موؤں کو منہ دکھانے گئی تھی۔ دل بلّیوں اچھلنے لگا۔" تیور بدل کر "سننا ہے تو بیچ میں نہ ٹوکو۔" ایک دم خاموشی چھا گئی۔ ایسی مزیدار باتیں فرید آباد میں کم ہوتی تھیں اور ملکہ کی باتیں سننے تو عورتیں دور دور سے آتی تھیں۔

"ہاں بُوا سودے والے ایسے نہیں جیسے ہمارے ہاں ہوتے ہیں۔ صاف صاف خاکی کپڑے اور کوئی سفید، لیکن دھوتیاں کسی کسی کی میلی تھیں۔ ٹوکرے لیے پھرتے ہیں۔ پان بیڑی سگریٹ، دہی بڑے، کھلونا ہے کھلونا اور مٹھائیاں چلتی ہوئی گاڑیوں میں بند کیے ہوئے بھاگے پھرتے ہیں۔ ایک گاڑی آکر رکی۔ وہ شور و غل ہوا کہ کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے۔ ادھر قلیوں کی چیخ پکار ادھر سودے والے کان کھائے جاتے ہیں۔ مسافر ہیں کہ ایک دوسرے پر پلے پڑتے ہیں اور میں بچاری بیچ میں اسباب پر چڑھی ہوئی۔ ہزاروں ہی ٹھوکریں اور دھکے کھائے ہوں گے۔ بھئی جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو، گھبرا گھبرا کر پڑھ رہی تھی۔ خدا خدا کر کے ریل چلی تو مسافر اور قلیوں میں لڑائی شروع ہوئی : "ایک روپیہ لوں گا۔" "نہیں دو آنے ملیں گے۔" ایک گھنٹہ جھگڑا ہوا جب کہیں اسٹیشن خالی ہوا۔ خالی کیا ہوا اسٹیشن کے شہدے تو جمع ہی رہے۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد یہ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے دکھائی دیے۔ اور کس لاپروائی سے کہتے ہیں "بھوک لگی ہو تو کچھ پوریاںووریاں لادوں۔ کھاؤ گی؟ میں تو ادھر ہوٹل میں

کھا آیا۔"

میں نے کہا کہ "خدا کے لیے مجھے میرے گھر پہنچادو۔ میں باز آئی اس موئی دلّی کی سیر سے۔ تمھارے ساتھ تو کوئی جنت میں نہ جائے اچھی سیر کرانے لائے تھے۔" فرید آباد کی گاڑی تیار تھی اس میں مجھے بٹھایا اور منہ پھُلالیا کہ "تمھاری مرضی، سیر نہیں کرتیں تو نہ کرو!"

صالحہ عابد حسین

صالحہ عابد حسین ۱۹۱۳ء میں پانی پت میں پیدا ہوئیں۔ ان کا اصلی نام صالحہ مصداق فاطمہ تھا۔ صالحہ عابد حسین کو ایک مکمل علمی اور تعلیمی ماحول میں پروان چڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

صالحہ عابد حسین نے اپنے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۳۹ء کے آس پاس کیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ ایک پورے عہد کی گواہ (Wintness to an era) تھیں، تو بے جا نہ ہوگا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ ایک عہد کے مختلف ادوار کی گواہ تھیں۔ وہ ایک دم توڑتے ہوئے عہد کی اقدار کو ریختہ ہونے کا تماشہ بھی دیکھ رہی تھیں اور ان کی جگہ نئے اقدار کے پروان چڑھنے کا نظارہ بھی کر رہی تھیں۔ پرانی اقدار کے ٹوٹنے اور نئی اقدار کے پروان چڑھنے کی کشمکش انھوں نے اپنی سرگزشت 'سلسلۂ روز و شب' میں خوبصورتی سے اجاگر کی ہے۔ اسی لیے اس مجموعہ کے لیے ہم نے اسی سرگزشت سے ایک باب کو شامل کر لیا ہے۔

صالحہ عابد حسین نے کثیر تعداد میں مسائل اور موضوعات کو اپنی تحریروں میں شامل کیا ہے۔ ان میں سیاسی، سماجی، تحقیقی یہاں تک کہ بچوں کے لیے آپ نے کئی کتابیں تحریر کی ہیں۔ انھوں نے بیالیس کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں ساز ہستی،

نراس میں آس، نونگے، آتش خاموش، عذرا، قطرے سے گہر ہونے تک، راہِ عمل، سلسلۂ روز وشب اور حالی کی سوانح حیات اکثر بیشتر بحث کا موضوع رہی ہیں۔

صالحہ عابد حسین کسی فلسفہ کی اسیر نظر نہیں آتی ہیں، البتہ وہ تہذیب جسے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کہتے ہیں، جو دھیرے دھیرے اب معدوم ہوتی جارہی ہے۔ کے ساتھ جذباتی طور پر وابستہ ہیں۔ ان کی تحریروں کا موضوع خواتین کی گھریلو اور سماجی حالت، پردہ، فرسودہ اور جابرانہ رسومات اور قدیم و جدید اقدار کی کشمکش رہے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے انگریز دورِ حکومت کے آمرانہ اقدامات، جدوجہدِ آزادی، فرقہ پرستی اور گاندھیائی فلسفہ کے بارے میں بھی بہت کچھ تحریر کیا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے اثرات پر مبنی حالات کو انھوں نے نہایت دلچسپ انداز میں 'نراس میں آس' میں بیان کیا ہے۔ اس دور کے دوسرے قلم کاروں کی طرح، تقسیم ملک سے ان کے ذہن پر گہرے صدمے کا احساس ان کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔

صالحہ عابد حسین کہیں کہیں پر مولوی نذیر احمد سے بے حد متاثر نظر آتی ہیں۔ لیکن اکثر و بیشتر ان سے آگے بھی نکل جاتی ہیں۔ ان کی زبان بے حد دلچسپ ہے، جو دلّی کی قدیم ٹکسالی زبان کے بہت قریب ہے۔ ان کی تحریروں میں خواتین کو ایک مرکزیت حاصل ہے۔ اس لحاظ سے وہ تانیثی ادیباؤں کے پیش رو قافلہ میں ایک خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

صالحہ عابد حسین کا انتقال ۸ جنوری ۱۹۸۸ء کو دلی میں ہوا۔

صالحہ عابد حسین

گزاری ہیں خوشی کی چند گھڑیاں

۲۵ء کے آخر میں بھائی جان ایم۔ایڈ کی ڈگری بڑے اعزاز کے ساتھ لے کر واپس ہندوستان آ گئے۔

مجھے آج بھی ان کی واپسی کا دن یاد ہے۔ دو برس میں اتنا انقلاب آ چکا تھا کہ ہم بہنوں کو اسٹیشن پر انھیں لینے جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ ان کے آنے کی خوشی میں پہلی بار ہمارے غرارے کے جوڑے بنے تھے اور ''لیڈی شو'' یعنی اونچی ایڑی کی گرگابی بنوائی گئی تھی۔ آج کل لڑکیاں شاید ان کو دیکھنا بھی پسند نہ کریں مگر ہم یہ غرارے اور ''لیڈی شو'' پہن کر اپنے ولایت سے واپس آنے والے بھائی کے استقبال کے لیے بالکل ''موڈرن'' بن چکے تھے۔ ان سے ایک لطیفہ بھی وابستہ ہے۔ جوتے بن کر آئے تو اس وقت اتفاق سے ابا جی گھر میں داخل ہوئے۔ روشن خیال بزرگ تھے مگر اتنے بھی روشن خیال نہیں کہ کنواری لڑکیوں کو ''لیڈی شو'' پہننے کی اجازت دیں! ذرا غصے سے پوچھا ''کس کے ہیں یہ جوتے؟'' کسی نے بتا دیا۔ ڈر کے مارے ہم دم بخود تھے۔ مگر ہماری خالہ اماں ہمیشہ ایسے وقتوں میں کام آتیں۔ بہت بھولا منہ بنا کر بولیں ''بابا سیدہ اور مصداق کے پیٹ میں درد ہوتا ہے نا۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اونچی ایڑی کے

جوتے پہننے سے جاتا رہے گا۔" اور یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اتنے بڑے ایجوکیشن افسر بزرگ اس چال میں آگئے۔

اسٹیشن پر بڑی تیاریاں تھیں۔ حالی مسلم ہائی اسکول کے استاد اور طالب علم معہ بینڈ باجے اور ہاروں کے اور خاندان کے بزرگ و نوجوان سب پلیٹ فارم پر جمع تھے۔ ہم لوگ تانگوں پر برقعے پہنے بے قراری سے انتظار کر رہے تھے۔ جلدی جلدی سب سے مل کر بھائی جان باہر آئے اور برقعوں سمیت بہنوں کو بانہوں میں سمیٹ لیا اور دونوں طرف سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگی۔ مسرت کے ان آنسوؤں کی لذت کوئی بچھڑے بھائی بہنوں سے پوچھتا۔

امّاں اسٹیشن نہ آئی تھیں۔ جلوس کے ساتھ بھائی جان گھر تک پہنچے۔ ماں بیٹے کے ملاپ کا نقشہ کیسے کھینچوں۔ وہ انھیں یوں کلیجے سے لگاتی تھیں جیسے دل میں چھپا لینا چاہتی ہوں۔

جانے کتنے دن گھر میں شادی جیسا ہنگامہ اور رونق رہی۔ بھائی جان کا لہجہ کچھ اور شیریں ہو گیا تھا۔ رنگ اور زیادہ نکھر آیا تھا۔ بس اتنا ہی فرق ہوا تھا ورنہ وہ وہی ماں کے عاشق، بہن بھائیوں کے چاہنے والے، بزرگوں کے سعادت مند سیدین تھے! دن بھر لوگ آتے رہتے تھے۔ رات گئے تک وہ ولایت کے، دوستوں کے، اپنی تعلیم کے قصے سناتے رہتے۔ علی گڑھ میں ان کا تقرر بحیثیت ریڈر کے پہلے ہی ٹریننگ کالج میں ہو گیا تھا مگر چارج لینے سے پہلے وہ کچھ عرصے پانی پت میں رہے۔ ہم سب کی تعلیمی استعداد کا جائزہ لیا۔ چھوٹی باجی کی اردو فارسی قابلیت اور لکھنے کی صلاحیت سے وہ مطمئن تھے مگر انگریزی اور زیادہ پڑھانا چاہتے تھے۔ چھوٹے بھائی جان تو حالی مسلم اسکول سے اس سال میٹرک کا امتحان دے ہی رہے تھے۔ میری طرف سے یقیناً مایوسی ہوئی ہو گی۔

ہماری انجمن تو بنی ہوئی تھی جس کے ممبر اور عہدے دار ہم لوگوں میں سے چنے جاتے تھے۔ اس کے باقاعدہ پندرھویں دن (یا ہفتے وار) جلسے ہوتے تھے۔ کسی ایک بزرگ کو گیسٹ آف آنر (اس وقت نہ ہم اس نام سے واقف تھے نہ اس فیشن سے)

کے طور پر مدعو کیا جاتا، وہی صدارت کرتا تھا۔ بھائی جان کے آنے سے اس میں جان پڑ گئی۔ اس جلسے میں خاندان بھر کے نوعمر لڑکے لڑکیاں شریک ہوتے۔ کسی لڑکی نے قرأت سے کلام پاک کی تلاوت کی۔ کسی نے حالی یا اقبال کی کوئی نظم سنائی۔ کسی نے تقریر کی۔ کبھی مباحثہ ہوا۔ محلّہ انصار میں اس زمانے میں ایک حادثہ ہو گیا تھا۔ کسی شخص نے اپنی بیوی کو اتنا مارا کہ وہ لہو لہان ہو گئی۔ گھر گھر اس واقعے کا چرچا تھا کہ یہ مار پیٹ ہمارے شہر میں نچلے طبقے میں کم ہوتی تھی۔ شاید ہمیشہ ہی سے مجھ میں عورتوں کے مسئلے سے بہت زیادہ اثر لینے کا مادّہ تھا۔ اس بار کے جلسے میں، میں نے ایک جوشیلی تقریر کی "مردوں کے ظلم عورتوں پر" سب نے بہت پسند کی۔ اگلی بار بھائی سعید نے اس کا جواب دیا: "عورتوں کے ظلم مردوں پر۔" موضوع ہی پھسپھسا اور حقیقت سے دور تھا اور ظاہر ہے کہ نہ دلیلوں میں وزن تھا نہ واقعات ایسے ڈھونڈے جا سکتے تھے! خیر تو ان جلسوں نے مجھ میں اور خاص طور پر احمد عباس میں تقریر اور مباحثہ کرنے کا شوق پیدا کر دیا۔

اسی زمانے کے آس پاس ہمارے بھائیوں نے ایک ڈرامہ کلب (نام یہ نہیں تھا) بنایا تھا جس میں حشر کے ڈرامے یا اصلاحی ڈرامے اسٹیج کیے جاتے تھے۔ آڈینس (حاضرین خاندان کے مرد اور عورت ہوتے تھے اور کردار ہمارے بھائی ہوتے تھے۔ لڑکیوں کو اسٹیج پر جانے کی اجازت بھلا کیوں کر مل سکتی تھی) ایک ڈرامے میں باچھو مرد مجاہد تھا، ایک بھائی بادشاہ بنے تھے جو مسلمان مجاہدوں کو مروا ڈالتے تھے، ایک پادری بنے تھے۔ اس میں ایک لڑکی کی ضرورت پڑی جو مجاہدوں کی بہن بنے۔ بزرگوں سے چھپ کر برقع اوڑھ کر "مجاہد" کی "بہن" کا یہ رول میں نے ادا کیا اور بھائی نے بہن کو اسلام پر قربان کر دیا۔ کئی ڈرامے اس طرح اسٹیج ہوئے اور پھر یہ شوق ہلکا پڑ گیا۔ مگر برسوں بعد حالی مسلم گرلز اسکول میں میری چچازاد، خالہ زاد بہنوں نے ڈرامے اسٹیج کیے جو خاص طور پر مجھ سے لکھوائے جاتے تھے کہ اس میں مرد کے کردار نہ ہوں۔ میں نے "سیدہ" اور دو ایک اور ڈرامے اس طرح کے لکھے۔ اس میں بڑھیا کا پارٹ بھی کیا اور شہر بھر سے عورتیں اور لڑکیاں ان ڈراموں کو دیکھنے آئیں اور بہت پسند کیے گئے!

منشی پریم چند کے افسانے پریم پچیسی اور پریم بتیسی اسی زمانے میں شائع ہوئے تھے۔ بھائی جان نے ہم لوگوں کے لیے یہ کتابیں منگائیں۔ رات کو سب کو بٹھا کر قصہ سناتے۔ کبھی کوئی کہانی ایسی سناتے کہ ادھوری معلوم ہوتی۔ وہ ہم سب سے کہتے کہ اس کہانی کو پورا کرو۔ اس ادبی کھیل میں باجی سے لے کر مجھ تک سب بہن بھائی شریک ہوتے۔ مگر چند دن میں سب کا شوق ٹھنڈا پڑ گیا۔ جو کہانیاں میں نے پوری کیں وہ زیادہ پسند کی گئیں اور اسی بہانے منشی پریم چند کو پڑھنے کی چاٹ تو پڑ ہی گئی۔

دسمبر ۲۵ء میں علی گڑھ کے کالج کی سلور جوبلی ہونے والی تھی۔ علی گڑھ گرلز انٹر کالج میں بھی شیخ عبداللہ اور بیگم عبداللہ نے بہت بڑے فنکشن کا فیصلہ کیا تھا۔ اس اسکول کے قیام میں خواجہ غلام الثقلین نے شیخ عبداللہ کی گلے گلے مدد کی تھی۔ (ان مرحوم نے بارہا مجھ سے یہ بات کہی تھی) اس ناطے یا سیدین کی بہن ہونے کے رشتے سے بہر حال ہم لوگوں کو مدعو کیا گیا۔ چھوٹی باجی نے بھائی جان کے مشورے پر بہت شوق سے تعلیم نسواں پر ایک تقریر لکھ کر تیار کی۔ ہم دونوں بے قراری سے وہاں جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ مگر۔ اب یاد نہیں کیا ہوا۔ اماں بیمار ہو گئیں یا دوسری بزرگ خواتین نے روڑا اٹکایا کہ ہم لوگ جلسے میں شرکت نہ کر سکے۔ چھوٹی باجی کو بہت صدمہ ہوا، اگرچہ وہ اظہارِ غم غصہ نہ کرتی تھیں۔ سب کچھ دل پر جھیل لیتی تھیں۔

۲۶ء کے شروع میں ہم سب لوگ بھائی جان کے گھر علی گڑھ آگئے۔ بنگالی کوٹھی کے نام سے ایک پرانی وضع کا بنگلہ جو کافی وسیع بھی تھا اور جس کے چاروں طرف باغ تھا، انھوں نے کرائے پر لیا تھا۔ اس کے کئی آؤٹ ہاؤسس تھے۔ ان میں سے دو کو ملا کر ایک کوارٹر بنایا گیا تھا جس میں اس وقت اشرف[1] صاحب اور ان کی نوبیاہتا نوعمر بیوی رہتے تھے جو غالباً اس وقت اسکول میں ماسٹر تھے۔ ان کی بیوی کلثوم مجھ سے کچھ بڑی تھیں اور ان سے میری دوستی ہو گئی تھی۔ بعد میں جب کئی برس جامعہ میں

---

[1] مشہور کمیونسٹ لیڈر ڈاکٹر محمد اشرف

آپا جان کی حیثیت سے انھوں نے کام کیا تو ہماری دوستی پھر تازہ ہو گئی لیکن ان غریب پر افتاد پڑتی رہی اور اب تو برسوں سے ایک دوسرے کی خبر ہی نہیں۔

علی گڑھ کی یہ چند سال کی یادیں بڑی دلکش ہیں۔ نیا شہر، نئے لوگ، نئی نئی دلچسپیاں، تعلیم کا انتظام، سیر تفریح، بہت سے عزیزوں کا ساتھ رہنا۔ بہت چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں مگر ان کا نقش اَن مِٹ ہے۔

بھائی جان کا گھر چھوٹا سا بورڈنگ ہاؤس بن گیا تھا۔ اپنے دونوں بھائیوں کے علاوہ کئی اور رشتے کے بھائی، دو ایک دوستوں کے بھائی باہر کے ایک بڑے کمرے میں رہتے تھے اور علی گڑھ کے لڑکوں کی بے ضرر شرارتیں گھر میں ہوتی رہتیں۔ رنگین پانی ڈال دینا، فاختہ[1] اڑانا، چوروں کا ڈھونگ رچا کر گھر والوں کو ڈرانا اور خدا جانے اور کیا کیا۔ اندر گھر میں میری چچازاد اور ماموں زاد بہنیں بھی ماؤں کے ساتھ بھائی جان کے اصرار پر آئی تھیں اور ہم سب گرلز اسکول میں داخل کر دیے گئے۔

پانی پت میں ہم اپنے کو بڑا قابل سمجھتے تھے۔ اردو کی کتنی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں (اور میں تو مضمون نویس اور افسانہ نویس بھی تھی گویا) فارسی جانتے تھے۔ قرآن شریف، مسئلے مسائل پڑھ چکے تھے جغرافیہ اور حساب وغیرہ بھی کچھ تو جانتے ہی تھے۔ مگر یہاں آکر معلوم ہوا کہ ہم "کچھ بھی نہیں جانتے" اس لیے کہ ہمای انگلش کی قابلیت کچھ نہ تھی۔ دو تین چھوٹی چھوٹی کتابیں پڑھی بھی تھیں تو کیا۔ یہاں خدا کے فضل سے اے اور بی کلاس سے انگریزی شروع ہوتی تھی۔ بات چیت میں بے تحاشہ انگریزی (غلط سلط) لفظ استعمال ہوتے تھے۔ چنانچہ میرا اور امن کا داخلہ (عمر ۱۳۔ ۱۴ سال) دوسری کلاس میں ہوا۔ دل کو دھکا تو بہت پہنچا مگر پڑھنے کا شوق غالب آیا۔ چھوٹی باجی کو ساتویں میں داخلہ مل رہا تھا مگر ان کی سچ مچ اچھی قابلیت تھی اور یہ انھوں نے گوارہ نہ کیا کہ ساتویں میں پڑھیں۔ مگر میں اور امن اور دونوں بہنیں اکھن[2] اور ممن[3]

---

[1] علی گڑھ کا ایک خاص مذاق تھا کہ اسپرٹ میں روئی بھگو کر کسی سوتے ہوئے ساتھی کے گال پر رکھ کر دیا سلائی دکھا دیتے اور رقصِ بسمل کا تماشا دیکھتے۔

[2] بیگم ذوالفقار الحسنین۔ [3] بیگم نجم الحسن نقوی

داخل ہو گئیں۔ اور بہنیں تو سال کے اندر ہی چھوڑ کر چلی گئیں کہ پانی پات میں ہمارے رشتے کی اور بہنوں نے رو دھو کر کہ امن اور مصداق پڑھ جائیں گی اور ہم رہ جائیں گے، ایک لڑکیوں کا اسکول قائم کرالیا تھا۔ یہ لوگ بھی وہیں جاکر داخل ہو گئیں۔ مگر میں نے تین سال یہاں پڑھا۔ شروع میں پریشانی اٹھائی۔ یہاں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں فیشن کی ماری ہوئی تھیں (کتنے معصوم اور معقول ہوتے تھے ان بچاریوں کے فیشن آج کی فیشن زدہ لڑکیوں کے مقابلے میں) اور ہم لوگ سیدھی سادی قصباتی لڑکیاں۔ نہ آڑی مانگ، نہ جھکے بال اور پتے، نہ سرخی پاؤڈر۔ شلوار قمیص دوپٹہ بھی سوتی اور معمولی ہوتا تھا (ایک بات کہہ دوں۔ تنگ پاجامہ اور شلوار جو بدل بدل کر فیشن کی انتہا آج بن گیا ہے اور بن رہا ہے ہمیں سخت قدامت پسند بنا رہا تھا) انگریزی لفظ اس وقت تو کیا بولتے آج بھی گفتگو میں بے تکے انگریزی لفظ سن کر کوفت ہوتی ہے (ماشاء اللہ انگریز کے جانے کے بعد کچھ یہ شوق اور بھی بڑھ گیا ہے) لیکن دھیرے دھیرے چند لڑکیوں سے دوستی ہونے لگی۔ ہمارا ایک قصور یہ بھی تھا کہ ہم شیعہ تھے۔ ابتدا میں لڑکیاں ہم سے کہتیں، بدر، قمر صغرا تمھاری قوم کی ہیں یعنی وہ دونوں لڑکیاں بھی آگرے کے کسی گھرانے کی شیعہ لڑکیاں تھیں (خدا جانے اب وہ کہاں ہیں؟) ان سے دوستی کرو۔ خیر ان سے تو کچھ دوستی ہوئی مگر پھر برجیس[1] عبداللہ، خورشید[2] عبداللہ، شاہدہ[3] اور کئی لڑکیوں سے شناسائی ہو گئی۔ عصمت چغتائی اس وقت ساتویں یا آٹھویں میں پڑھتی تھیں۔ ان کی بھانجی نیّر سے میری اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ غرض تین سال میں کئی لڑکیوں سے دوستی (اگرچہ اس وقت دوستی کا لفظ ہمارے گھرانے میں ممنوع تھا۔ اور تھی بھی وہ دوقتی "دوستی") ہو گئی لیکن اپنی استانیوں میں، میں شروع

1۔ شیخ عبداللہ کی چھوٹی بیٹی جواب مسز احمد کے نام سے مشہور ہیں۔
2۔ شیخ عبداللہ کی اس سے بڑی لڑکی جس نے رینوکا دیوی کے نام سے فلموں میں کام کیا۔ اب پاکستان میں بیگم اکبر کے نام سے مشہور ہیں
3۔ جس نے کئی فلموں میں کام کر کے شہرت پائی۔ لکھنؤ کے ایک مشہور گھرانے کی لڑکی ہے۔ پہلے محسن عبداللہ سے شادی ہوئی تھی۔ بعد میں مشہور ڈائرکٹر احمد سے بیاہ کیا۔ اب پاکستان میں ہے۔

ہی سے ہر دلعزیز تھی۔ اول تو اردو، حساب، دینیات اپنی کلاس کی سب لڑکیوں سے زیادہ جانتی تھی چنانچہ زینت آپا، اچھن آپا اور آپا جی (حساب، اردو، دینیات کی ٹیچرز) مجھے بہت چاہتی تھیں۔ انگلش کی جو ٹیچر دوسری کلاس کو پڑھاتی تھیں وہ مدراسی عیسائی تھیں۔ رنگ بالکل تارکول جیسا تھا لیکن اپنے کو شہنشاہ جارج پنجم کی سگی بھتیجی تصور کرتی تھیں۔ "ہندوستانی" لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھیں۔ ہماری کلاس میں ایک لڑکی گریس عیسائی تھی۔ صبح کو پہلا گھنٹہ انھیں کا ہوتا۔ جیسے ہی کلاس میں آتیں سب لڑکیاں کھڑی ہو کر ایک آواز میں چلاتیں "گڈ مارننگ مس۔۔۔" (ہر کلاس میں گڈ مارننگ ہی کہی جاتی تھی) اور جواب ہمیشہ ایک ہی ملا۔ پہلے نرم لہجہ، "گڈ مارننگ گرلس!" پھر لہجہ سخت "بے وکوف لڑکیو بیٹھ جاؤ۔" سال بھر ہم نے ان سے اس کے سوا اور کچھ نہ سنا، نہ چہرے پر مسکراہٹ دیکھی۔ لڑکیاں ان سے سخت چڑتی تھیں، صورت بھی بھیانک تھی۔ البتہ ایک بار میں نے شام کے وقت ان کو اپنے کمرے کے سامنے نہانے کے بعد بال کھولے ہوئے دیکھا۔ کیا خوبصورت بال تھے۔ گھنے سیاہ ایڑیوں کو چھوتے ہوئے!

زینت آپا کی والدہ پانی پت کی تھیں۔ یہ خاندان عیسائی سے مسلمان ہوا تھا اور پانی پت میں لڑکیوں کی تعلیم کا رواج انھیں سے شروع ہوا۔ زینت آپا نے خود مڈل تک پڑھا تھا اور گرلز اسکول میں پہلی دوسری کی ٹیچر تھیں (بعد میں میٹرک بھی کر لیا تھا اور شاید کوئی ٹریننگ بھی) بے حد موٹی، بے حد خوش مزاج، مجھ سے خاص طور پر بہت خصوصیت کرتی تھیں۔ ایک تو ان کی ہم وطن۔ دوسرے میں حساب میں سو فیصدی (۹۹ فیصدی) نمبر لاتی تھی۔ چند سال پہلے تک جب بھی میں ان سے ملتی تو وہ اسی خلوص و محبت سے پیش آئیں۔ اپنی پانچ بہنوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی کسی نے ایم اے کیا۔ کسی نے ڈاکٹریٹ، کوئی ڈاکٹر بنی کوئی وکیل۔ انھوں نے شادی نہیں کی اور خاندان کے لیے اپنے کو وقف کر دیا تھا۔ اب انتقال ہو گیا ہے۔

آپا جی، سید بشیر الدین[1] کی سالی تھیں۔ نو عمری میں بیوہ ہو گئی تھیں اور گرلز

---

[1] مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی لائبریری کے لائبریرین تھے (جو اب مولانا آزاد لائبریری کے نام سے مشہور ہے۔)

اسکول میں دینیات پڑھاتی تھیں۔ صورت حوروں کی سی تھی۔ دینیات میں جو لڑکی ذرا لاپروائی کرتی (اور اکثر کرتی تھیں) اس کو خوب پھٹکارتی تھیں۔ شیخ عبداللہ کی لڑکیوں کی، عام طور پر استانیاں تک خوشامد کرتی تھیں مگر وہ ان کی ذرا پروانہ کرتیں بلکہ کچھ زیادہ ہی خفا رہتیں کیونکہ وہ لڑکوں کے سے پاجامے پہنتیں، بال کٹاتیں اور دوپٹہ نہیں اوڑھتی تھیں۔ آپاجی میں تعصب نام کو نہ تھا۔ خاص طور پر اصرار کر کے مجھ سے "شیعہ دینیات" کی کتابیں منگوائیں اور وہی کتابیں مجھے پڑھاتیں اور اسی میں امتحان لیتی تھیں۔ اب ظاہر ہے کہ نماز روزہ اور سارے مسئلے مسائل تو بچپن سے پڑھے تھے امتحان میں سو فیصدی نمبر آتے تو کوئی ہماری ذہانت یا کوشش نہ تھی۔ مگر وہ ہم سے بہت خوش تھیں اور مثال دیا کرتی دیکھو مسلمان لڑکیاں ایسی ہی ہونی چاہئیں۔ دراصل وہ سب کو بہت لگن سے پڑھاتیں اور مذہب کی تعلیم دیتیں اور اخلاق کے اصول سکھاتی تھیں۔ بڑی ہی نیک بی بی تھیں۔

علی گڑھ میں دو سال ہم نے بہت مزے میں گزارے۔ اماں کی محبت کا سایہ، بھائی جان کی پُر لطف صحبت، ان کے دوستوں کی بیویوں، بہنوں اور ماؤں سے میل جول جن میں سے ہر ایک میری والدہ اور بہن کی گرویدہ ہو جاتی تھیں۔ مجلسِ عزا سب سے پہلے علی گڑھ میں اماں نے شروع کی۔ یہ بات نہیں کہ وہاں شیعہ لوگ نہ تھے مگر مجلس کرنے کی ہمّت کسی میں نہ تھی اور اماں ہر جمعرات کو مجلس کرتی تھیں۔ پہلے دن شیعہ خواتین آئیں پھر بھائی جان کے کچھ دوستوں کی سنّی بیویاں اور ماں بہنیں آئیں اور ہوتے ہوتے یہ مجلس اس قدر مقبول ہوئی کہ ان لوگوں کو جمعرات کا انتظار رہنے لگا۔ پورا دالان بیویوں سے بھر جاتا تھا۔ اب بعض اور شیعہ خواتین نے بھی مجلس کرنی شروع کر دی! (آج تو علی گڑھ میں بہت سی زنانی مجالس ہوتی ہیں اور پوری روایت کے ساتھ) میلاد کبھی ہمارے ہاں ہوتا کبھی کسی کے اور کے ہاں میلاد میں شرکت کرتے۔ اب ہم پر پانی پت والی بند شیں نہ تھیں۔ برقعہ اوڑھ کر تانگے میں بیٹھ کر ہر جگہ جا سکتے تھے یعنی جہاں اماں جاتیں یا جانے کی اجازت دیتیں۔ گرلز کالج میں جو فنکشن ہوتے اس میں اماں تو کم جاتیں۔ مگر باجی ہوتیں تو وہ اور چھوٹی باجی اکثر شرکت کرتی تھیں۔ اکثر

رات کو ٹہلنے کے لیے نکلتے تو یونیورسٹی کی مسجد (جو سر سید نے بنوائی اور پانی پت کے معماروں نے بنائی ہے) کچی بارک، سوئمنگ باتھ وغیرہ دیکھنے چلے جاتے اور اپنے باغ میں تو مالیوں کو ہٹا کر روز ہی شام کو سیر ہوتی اور آم اور جامن کے پیڑ کے سائے میں لطف اٹھاتے۔ اندر صحن میں بھی پھولوں کی کیاریاں لگائی گئی تھیں۔ باہر بھائی جان نے بیڈ منٹن کورٹ بنوایا تو اندر صحن میں ہم لوگوں کے لیے بھی بنوا دیا۔ خود ہمیں سکھایا اور جب فرصت ہوتی ہمارے ساتھ کھیلتے بھی تھے۔ کس قدر مختلف اور پسندیدہ تھی یہ دنیا پانی پت کے گھروں کی چار دیواری سے؟ ہمارے اسکول میں ہر سال ۷ نومبر کو اس کی سالگرہ دھوم دھام سے منائی جاتی۔ معزز مہمان مدعو کیے جاتے۔ کھیل ہوتے، ڈرل ہوتی، ڈرامے ہوتے۔ ڈراموں میں ہیرو خورشید، ہیروئن شاہدہ یا بر جیس ہی بنائی جاتی تھیں۔ مجھے ڈراموں میں کام کرنے کا بڑا ولولہ اٹھتا مگر ایک تو خودداری کسی سے کہنے نہ دیتی دوسرے میرے صورت اور لباس بھی ہیرو ہیروئن بننے کے قابل کہاں تھے۔ اکثر انگلش ڈرامے اسٹیج کیے جاتے، کلکٹر وغیرہ کی بیویوں کو بلایا جاتا تھا۔ God save the king کا گایا جانا ضروری تھا۔ بھلا مجھے کون پوچھتا۔ وہ تمنا پوری نہ ہوئی مگر ہاں برسوں بعد جب میرے ڈراموں نے مقبولیت حاصل کی تو اسی گرلز کالج میں بارہا میرے متعدد ڈرامے سٹیج ہوئے اور مجھے اکثر مدعو بھی کیا گیا۔ خاص طور پر مجھ سے ڈرامے لکھوائے گئے۔

بیگم عبداللہ اکثر بڑے وقار کے ساتھ اسکول کالج کا چکر لگایا کرتی تھیں۔ سفید غرارہ، سفید قمیص اور سفید یا ہلکا رنگین دوپٹہ، پاکیزہ صورت، لڑکیوں کو دروازے پر کھڑا، یا سودا خریدتے دیکھ کر ڈانٹتیں۔ کسی کا سر کھلا دیکھتیں تو ہلکا سا چپت لگا دیتیں اور تنبیہہ کرتیں۔ ان کی ڈانٹ میں محبت اور شفقت ہوتی تھی۔ ماں کا سا پیار ہوتا تھا مگر لڑکیاں یہ کہنے سے باز نہ رہتیں کہ اپنی لڑکیوں کو نہیں دیکھتیں کہ نہ وہ پردہ کرتی ہیں نہ دوپٹہ اوڑھتی ہیں۔ لیکن ویسے عام طور پر لڑکیاں ان سے محبت کرتی تھیں۔ وہ آلہ بی کہلاتی تھیں۔ ہم "ڈے اسکالر" لڑکیوں کا ان سے دور کا ہی واسطہ تھا مگر ان کا چہرہ جس پر شفیق سی مسکراہٹ ہوتی تھی آج بھی میری نظروں میں پھرتا ہے۔ یہاں ایک تکلیف

وہ چیز میرا نام بن گیا یعنی مصداق فاطمہ۔ ہماری پرنسپل مس کارلٹن پورے اسکول کی حاضری لیا کرتی تھیں۔ وہ ہمیشہ مجھے "مس داک" کہہ کر پکارتی رہیں۔ اور بھی کئی لڑکیاں اور استانیاں "مس داک" کہتیں۔ بعض بے وقوف تو یہ تک پوچھتیں تمھارے باپ کا نام واک ہے! سوچیے ذرا خواجہ غلام الثقلین کی بیٹی جس کو اس لیے نام پر ناز تھا کہ ابامیاں نے میرا ایسا نام رکھا ہے جو اس سے پہلے کسی کا نہیں رکھا گیا، اس سے کہا جائے کہ تم کس "داک" کی بیٹی ہو؟ میں نے بہت غصّے سے اماں سے شکایت کی کہ کوئی نہ میرا نام ٹھیک لیتا ہے نہ معنی سمجھتا ہے۔ انھوں نے مشورہ دیا تم صالحہ خاتون اپنا نام بتایا کرو۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ نام انھوں نے میرا بچپن سے رکھا تھا یا اسی وقت تجویز کیا تھا۔ بہر حال حاضری میں تو میں "مس داک" ہی پکاری جاتی رہی لیکن جب رسالوں میں مضمون اور کہانیاں چھپنی شروع ہوئیں تو صالحہ خاتون ہمشیرہ خواجہ غلام السیدین کے نام سے! ہنسنے کی بات نہیں اس زمانے میں فیشن ہی یہ تھا کہ عورتوں کے رسالوں میں "بنت" یا "ہمشیرہ" ضرور چھپتا تھا۔

مجھے آج تک قلق ہے کہ میرا ایسا نادر نام قلمی نام نہ بن سکا لیکن چند سال میں صالحہ اتنا مشہور ہو چکا تھا کہ بدلنے کا سوال ہی نہ رہا۔

دوسری کلاس میں، میں فرسٹ آئی۔ حساب اور اردو میں ۹۵ اور ۹۹ فیصدی نمبر آئے۔ ڈبل پروموشن ملا اور دوسرے سال پانچویں میں آگئی۔ اسی زمانے میں وہ واقعہ پیش آیا جس کی یاد ہمیشہ رہے گی کہ بیگم بھوپال سلطان جہاں کی زیارت کا موقع ملا۔

اس سال سالانہ جلسے میں "گیسٹ آف آنر" کے طور پر بیگم صاحب کو مدعو کیا گیا تھا۔ وہ یونیورسٹی تشریف لائی تھیں۔ وہاں سے گرلز کالج بھی آئیں۔ بڑی تیاریاں ہوئیں۔ اہتمام ہوئے۔ ڈرامے تیار ہوئے۔ شہر کی مشہور خواتین مدعو کی گئیں۔ جھنڈیاں لگیں۔ لال قالین (بانات) راستے میں بچھایا گیا اور اس کے دونوں طرف لڑکیوں کو پھولوں کی پتیاں دے کر کھڑا کر دیا گیا کہ ان پر "گل باری" ہوتی رہے۔ اس ساری تیاری میں میرے حصے میں بس یہی "شرف" آیا کہ میں دورویہ

کھڑی لڑکیوں کی صف میں تھی، اور سب لڑکیاں بے حد خوش تھیں کہ والیٔ ریاست بیگم بھوپال کو دیکھیں گی اور مجھے یہ اشتیاق، تجسّس تھا کہ میں ایک ادیبہ کو، ایک مصنفہ کو دیکھوں گی! اور جب وہ آئیں، برقعہ نما عجیب سا لباس، چھوٹا سا قد، بھاری ڈیل، بڑھاپے کی طرف مائل عمر اور باوقار صورت۔ بڑی شفیق مسکراہٹ بکھیرتی، ہاتھ سے لڑکیوں کے سلاموں اور پُر جوش استقبال کا جواب دیتی وہ ڈائس پر چلی گئیں اور میں اس شوق کے پورا ہونے کی مسرت میں ڈوبی رہی کہ آج میں نے ایک "ادیبہ" کو دیکھا ہے۔ جب کبھی کہیں مجھے اسکولوں وغیرہ میں مدعو کیا جاتا ہے سیکڑوں لڑکیوں کے اشتیاق بھرے چہرے اور مسرت سے چمکتی آنکھیں دیکھ کر ہمیشہ مجھے اپنی وہ کیفیت یاد آجاتی ہے اور خیال آتا ہے کہ وہ اپنی "ادیبہ" کو دیکھ کر شاید مایوس نہ ہوتی ہوں۔

کبھی کبھی اماں کے پاس مسز سجاد حیدر بھی ملنے آتی تھیں۔ ان کے ہم نے کئی ناول پڑھے تھے۔ وہ اماں، چھوٹی باجی اور باجی اور بھابی جان سے ملتیں، باتیں کرتیں اور مجھے بالکل نظر انداز کر دیتی تھیں۔ یوں بھی وہ ادبی باتیں شاید کبھی نہ کرتی تھیں بلکہ انھیں رشتے کرانے کا شوق تھا اور اکثر بھائی جان کے اور چھوٹی باجی کے رشتے لایا کرتی تھیں۔ عرصے بعد کا ذکر ہے، ایک بار میں اور بھائی جان ان سے ملنے گئے۔ سجاد حیدر صاحب کا انتقال ہو چکا تھا اور وہ قرولباغ میں رہتی تھیں اور بلڈ پریشر کے مرض اور شوہر کے جدائی کے صدمے سے بے حال تھیں۔ ہم لوگوں سے بہت محبت سے ملیں اور بولیں "صالحہ عابد حسین، صالحہ عابد حسین۔ میں سمجھی جانے کون بھاری بھرکم خاتون ہیں۔ یہ نہیں معلوم کہ یہ تو سیدین کی وہی چھوٹی سی دیوانی سی بہن ہے جس سے کبھی ہم نے بات نہ کی۔"

ان کی بیٹی قرۃ العین حیدر اس وقت فرسٹ ایر میں پڑھتی تھی۔ اس نے ہمیں دیکھا مگر بات وات نہیں کی۔ برسوں بعد بمبئی میں ملاقات ہوئی پھر جب بمبئی جاتی ملاقات ہوتی۔ اور ادھر کوئی تین سال پہلے جب وہ جامعہ میں وزیٹنگ پروفیسر ہو کر سال بھر کے لیے آئی تو ان سے ملنا جلنا اور بے تکلفی، محبت اور دوستی ہو گئی۔ اب وہ میری "عینی" ہے اور میں اس کی "صالحہ باجی۔" ادبی باتیں ہم میں بہت کم ہوتی ہیں۔

ہاں باقی دنیا بھر کی گفتگو اور گپ ہوا کرتی ہے۔ بڑی محبت اور خلوص ہے اس ہستی میں۔

۷۲ء میں بھائی جان اپنے دوست ڈاکٹر عابد حسین کے ساتھ کشمیر سیر کے لیے گئے۔ ہم سب کے لیے انھوں نے کمار ہٹی میں جو سولن کے قریب ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے، اپنے ایک دوست کی کوٹھی میں انتظام کیا اور چچی اماں اور ان کے خاندان کے ساتھ کئی ہفتے ہم وہاں جاکر رہے۔ یہ ہمارا پہاڑ کا دوسرا سفر تھا۔ کوٹھی بہت بڑی تھی اور ارد گرد کا ماحول بہت حسین تھا۔ پہاڑیاں سبزی اور پھولوں سے ڈھکی، جن پر ہم قلانچیں مارتے پھرتے۔ احاطے سے گزرتا ہوا ٹھنڈے میٹھے شفاف پانی کا خوبصورت چشمہ جس پر گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کرتے، بیت بازی کرتے، کتابیں پڑھتے اور کپڑے دھوتے۔ کبھی کبھی ہمت کرکے کپڑوں سمیت نہا بھی لیتے تھے۔ آس پاس دیہاتی عورتیں رہتی تھیں، ان سے باتیں کرتے۔ اماں کمزور تھیں، کھانسی آتی رہتی تھی مگر وہ ہماری دلچسپیوں میں روزانہ انکاتی تھیں اور چچی اماں تو ہر موقع پر ساتھ دیتی تھیں۔

پھر کشمیر سے بھائی جان، باچھو اور عابد صاحب کے واپس آنے کی خبر آئی۔ ہم لوگوں نے خوب تیاریاں کیں۔ آس پاس چنبیلی کے بہت سے پھول کھلے تھے۔ کوچ اور کرسیوں کے سوراخوں میں پھول لگا کر انھیں پھولوں کی سیج بنادیا گیا پھر کئی میل دور کمار ہٹی کے اسٹیشن پر ان کو لینے کے لیے ہم سب دوڑتے ہوئے گئے اور پیدل ہی واپس آئے۔ بھائی جان کا گھر میں آنا ہمیشہ خاندان بھر کے لیے خوشیوں کا پیغام ہوتا تھا۔ عابد صاحب تو دو دن رہ کر چلے گئے۔ چند دن بعد بھائی جان ہم سب کو لے کر علی گڑھ آگئے۔

میرا اسکول کھل گیا تھا۔ صبح بہت سویرے اسکول کی سیج گاڑی ہمیں لینے پہنچ جاتی۔ مجھ سے پہلے صرف علیمن جو پروفیسر اللہ بخش کی بیٹی تھی، گاڑی میں آتی تھی۔ میں صبح سویرے اٹھ کر تیار ہو جاتی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ہمارا لباس سر سے پیر تک سفید ہوتا تھا۔ اللہ رکھی اور اماں جاگتی ہوتیں اور ناشتہ کرکے میں دروازے پر تیار رہتی کہ گاڑی بان ذرا سی دیر ہو جانے پر چلاتا تھا۔ سب سے آخر میں عصمت چغتائی کے گھر پر گاڑی جاتی جو "لال ڈگی" کے قریب تھا۔ وہاں بہت دیر لگتی۔ پھر جب اندر سے وہ

اور نیّر نکل کر آتیں تو گاڑی کھچا کھچ بھری ہوتی تھی۔ نیّر اوپر کوچوان کے پاس بیٹھ جاتی۔ عصمت آپا (ہم ان کو یہی کہتے تھے) اندر کھڑی ہو جاتیں مگر بالکل دُہرا ہونا پڑتا تھا اور گھر میں سے کسی کے بگڑنے کی چیخنے کی آوازیں آتی رہتی تھیں کہ میری بچی کو اوپر بٹھا دیا ہے گر پڑے گی۔ اس وقت میں سمجھتی تھی کہ یہ ان کی بھاوج ہوں گی مگر وہ دراصل ان کی بڑی بہن، مجیب[1] اور نیر کی والدہ تھیں اور پھر ہم اپنی پڑھائی میں لگ جاتے۔

میرے پڑھنے والے شاید مضحکہ اڑائیں اتنی نیچی کلاسوں کی تعلیم کا ذکر میں نے اس قدر تفصیل سے کیا ہے۔ وہ لڑکیاں جو آج اعلیٰ تعلیم پاتی ہیں، یورپ اور امریکہ تک سے ڈگریاں لاتی ہیں، کیسے سمجھ سکیں گی میرے زمانے کی لڑکیوں کی کیفیت اور دل کی حسرت جن کو تعلیم کی لگن تھی، علم کی پیاس تھی لیکن یا تو مواقع نہ ملتے تھے یا اتنی دیر میں ملتے تھے کہ میٹرک اور بی۔ اے تک کرنے کی خواہش حسرت ہی بن کر رہ جاتی تھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ اگر میں دس بارہ برس بعد پیدا ہوئی ہوتی، تو وہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتی تھی جس کی عمر بھر تمنا رہی اور مجھ سے اگلی نسل نے خود میرے گھرانے میں حاصل کی۔

لیکن عمر کی اس منزل پر پہنچ کر اور تجربوں کے بحرِ ذخار سے گزرنے کے بعد، اچھے برے، ناقص کامل کے پرکھنے کی جب کچھ صلاحیت پیدا ہو گئی ہے، قدروں کو پہچاننے لگی ہوں تو یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ جو چیز، جو علم مشکل سے، کوشش سے سچی لگن سے حاصل ہوتا ہے، اسی کی قدر زیادہ ہوتی ہے، اسی سے زیادہ فیض اٹھایا جا سکتا ہے، میں اور میری جیسی اور بہت سی لڑکیوں نے جو تھوڑا بہت پڑھا، اسے زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کی، علم کے سمندر سے پیاسوں کو شبنم ملی مگر اس کو موتیوں سے قیمتی سمجھ کر دل کے خزانے میں محفوظ کر لیا۔ عمر بھر طلبِ علم کی لگن رہی اور جو علم جب اور جہاں سے مل سکا، اسے حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ہمیں علم کا غرور نہیں تھا بلکہ یہ احساس تھا کہ اس بے پایاں سمندر کی جو چند بوندیں ہمارے مقدر

---

[1] پروفیسر محمد مجیب جو علی گڑھ ٹریننگ کالج کے پرنسپل ہوئے۔

Scanned by CamScanner

میں آئی ہیں، وہ ہمارے لیے سعادت ہیں۔ شاید اسی لیے میرے زمانے کی اکثر نہیں تو کچھ لڑکیوں اور عورتوں نے بہت کم علم سے بہت زیادہ فائدے اٹھائے ہیں۔

مگر اس وقت یہ سب کہاں سوچ سکتی تھی؟ میں تو جلد سے جلد میٹرک کرنے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ کالج کی طالبہ بننے کی تمنا کر رہی تھی، میری اماں بھی خوش تھیں کہ کم سے کم ایک لڑکی تو اسکول اور کالج میں پڑھ جائے گی۔

ساتھ ہی میرے لکھنے کا شوق جاری تھا، کوئی مضمون کسی بچوں یا عورتوں کے رسالے میں چھپ جاتا تھا، مگر میری منزلِ مقصود مشہور ادیب بننا نہیں کالج میں اعلیٰ تعلیم پانا تھی۔

رضیہ سجاد ظہیر

رضیہ سجاد ظہیر ۱۵ فروری ۱۹۱۷ء کو اجمیر میں پیدا ہوئیں۔ ان کی تعلیمی قابلیت ایم۔ اے تھی۔ رشید جہاں کے بعد، رضیہ سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کی روح رواں تھیں۔ وہ ہمہ وقت اشتراکی سیاست سے جڑی ہوئی تھیں۔ ان کے شوہر سجاد ظہیر آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد بھی کمیونسٹ پارٹی کے چوٹی کے رہنماؤں میں شمار کیے جاتے تھے۔

رضیہ سجاد ظہیر سیاست کے ساتھ ساتھ ادب کے محاذ پر بھی سرگرم تھیں۔ ان کی تحریروں میں طبقاتی کشمکش اور سماجی و سیاسی بے انصافی سے پیدا شدہ صورتِ حال کی تصویر کشی ملتی ہے۔ ان کی تحریروں میں ان کے سیاسی اور سماجی عقائد کا عکس نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ ان کا اندازِ بیان نہایت ہی دلچسپ ہے۔ ان کے استعارے بھی دلچسپ اور برمحل ہیں۔ اشتراکی سیاست سے وابستہ ہونے کے ناطے ان کا واسطہ سماج کے پچھڑے اور نادار طبقوں سے رہا۔ اس لیے ان کے مسائل پر ان کی گہری نظر ہے، جو ان کے ناولوں اور افسانوں میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ ان کے چار ناول 'سرِ شام'، 'کانٹے'، 'سمیتی'، 'اللہ میگھ دے' اور ایک افسانوی مجموعہ 'زرد گلاب' شایع ہوئے ہیں۔ ان کا انتقال ۱۸ دسمبر ۱۹۷۹ء کو ہوا۔

رضیہ سجاد ظہیر

زرد گلاب

ہاں یہ وہی تصویر ہے ـــــ وہی جو نہ جانے کب سے ہمارے کھانے والے کمرے میں لگی تھی ـــــ یہ وہی ہے، بڑی سی بھاری سی تصویر جو تقریباً آدھی دیوار کو گھیرے تھی، یہی فریم اس وقت بھی تھا، یہی چوڑا سنہری فریم جس میں کٹاؤ کی جالی بنی تھی۔ ویسے اس کی پالش جابجا سے گھس گئی تھی۔ لیکن خود تصویر کی رونق میں کوئی فرق نہیں آیا تھا ـــــ پس منظر میں سیاہی اور سرخی کا وہی میل تھا جیسے رات کا بڑھتا ہوا اندھیرا، سورج کی ڈوبتی ہوئی سنہری سرخی پر بڑھتا چلا آرہا ہو، سامنے رکھی میز پر گہرے سبز رنگ کا میز پوش جس کی چمک سے ظاہر ہوتا ہے کہ پلش یا مخمل کا ہے، اس پر رکھا ہوا بڑا سا کٹ گلاس کا گول پھول دان جس کے ایک حصّے پر کھڑکی سے آتی ہوئی روشنی کی ڈلک پڑ رہی تھی، اس سے لگا ہوا بڑے بڑے رنگ برنگے گلابوں کا ایک گچھا ـــــ اور پھول دان کے قریب، میز پوش پر پڑا ہوا ایک زرد گلاب!

شاید اسی لیے مصور نے اس کا رنگ زرد بنایا تھا کہ سب سے پہلے مرجھانا اس کی قسمت تھی ـــــ اپنے ساتھیوں سے چھوٹ کر، باقی سب پھولوں سے بچھڑ کر، وہ

کیسے گر پڑا تھا! کیونکر وہ اکیلا ہو گیا تھا، کتنا مجبور اور بے بس لگتا تھا وہ کچھ ایسا بھی محسوس ہوتا کہ جیسے باقی سارے گلاب اسی کو حسرت سے تک رہے ہیں۔ لیکن کچھ کر نہیں سکتے۔ ان کا بس نہیں چلتا کہ اسے اٹھالیں اسے پھر اپنے ساتھ گچھے میں ملالیں۔

میں اس تصویر کو بہت چھوٹی سی عمر سے دیکھتی آئی تھی ــــــ اسی کے نیچے آتش دان تھا اور اس کے اور آتش دان کے بیچ پتھر ــــــ وہ سنگ مرمر کا پتلا سا پتھر جس پر کئی عزیزوں کی تصویریں تھی، آتش دان میں جاڑے ہوتے تو لکڑیوں کی چٹختی چنگاریاں اڑاتی آگ سلگا کرتی تھی اور ابا مرحوم کبھی کبھی وہاں بیٹھ کر ہم لوگوں کو میر انیس کا کلام سنایا کرتے تھے۔ جب آگ کے شعلے لپکتے تو ان کی لپک اس زرد گلاب پر پڑتی، جب روشنیاں گل ہو جاتیں تو بھی وہ زرد گلاب اندھیرے میں دکھائی دیا کرتا اور صبح تڑکے جب سورج کی پہلی کرن روشن دان سے جھانکتی تو ذرا دیر کو اس گلاب میں جان سی پڑ جاتی۔

گھر میں سب سے زیادہ چہل پہل اسی کمرے میں ہوتی تھی۔ خاندان بھر کسی موقع پر اکٹھا ہوتا، پارٹیاں ہوتیں، شعر گائے جاتے، لطیفے سنائے جاتے، کبھی کبھی جب بڑے نہ ہوتے تو ہم بچے دروازے، کھڑکیاں، روشنیاں بند کر تکیہ فائٹ اور ڈارک روم کھیلتے۔ ایسے میں کبھی کبھار میری نظر ایک دم اس گلاب پر پڑ جاتی اور میں کھیلتے کھیلتے ٹھٹھک کر رہ جاتی ــــــ کیسے یہ سب سے الگ ہو گیا؟ کیا اچھا ہوتا جو یہ بھی پھول دان میں لگا رہتا، اس میں سب رنگوں کے گلاب ہیں، یہی نہیں ہے، تو اس کو کیوں نہیں لگادیا ــــــ شاید لگا تو رہا ہی ہوگا مگر ٹوٹ کر گر گیا ــــــ کیسے ٹوٹا ہوگا؟

مجھے یاد ہے کہ ایک دن میں نے چپکے سے اس زرد گلاب کو چھونے کی کوشش کی تھی، ایک چھوٹی سی میز کھسکا کے اس پر کرسی رکھ کے میں اس پر چڑھی، ہاتھ بڑھا کر میں نے اسے چُھوا، پر ایسا محسوس ہوا کہ وہ ٹھنڈا ٹھنڈا ہے اور بس، قریب سے دیکھنے میں وہ اتنا دلکش بھی نہیں لگتا جتنا دور سے، بس ایک زرد رنگ کا کھردرا سا دھبہ لگتا تھا۔

پھر ایک دن ناشتہ کرتے میں نے امّی سے پوچھا تھا: ”امّی یہ تصویر کس نے

بنائی تھی۔" میری امّی بہت کم سخن تھیں ـــــ چپ رہیں!

ابّا نے ایک بار ان کی طرف دیکھا، پھر میری طرف دیکھا اور بولے :"بیٹی، یہ تمھارے ماموں نے بنائی تھی۔"

"کون، باقر ماموں نے؟"

"نہیں ـــــ تم نے اپنے ان ماموں کو نہیں دیکھا۔ وہ تصویریں بناتے تھے اور بیمار رہتے تھے۔ یہ تصویر انھوں نے تمھاری امّی کو تحفہ دی تھی، وہ تمھاری امّی کے چچازاد بھائی تھے۔"

"مگر ابّا یہ تصویر مجھے اچھی نہیں لگتی۔" میں نے کہا۔

امّی نے چونک کر میری طرف دیکھا "کیوں جان بیٹی، تجھے کیوں اچھی نہیں لگتی؟"

"امّی یہ ماموں نے اس زرد گلاب کو گچھے سے نکال کر نیچے کیوں پھینک دیا ہے؟ وہاں کیوں نہیں لگایا، پھول دان میں؟ ابّا یہ ایک کیسے ان سب گلابوں سے الگ ہو گیا؟"

ابّا کھڑے ہو گئے، انھوں نے ایک بار مڑ کر تصویر کو دیکھا، پھر امّی کو، وہ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی تھیں، پھر ابّا نے مجھے پیار کیا اور کالج چلے گئے۔

میں کرسی پر بیٹھی تھی دلیہ کھاتے کھاتے اسے دیکھتی رہی۔

افق کا پس منظر، روشنی پر پڑتا اندھیرا، ہرے پلش کا میز پوش جیسے تازی قبر پر اگی ہوئی چمک دار مخملی گھاس، اس پر دمکتے کٹ گلاس کا پھول دان، رنگ برنگے گلابوں کا گچھا ـــــ اور سب سے الگ، سب سے دور، سب سے بچھڑا، مرجھاتا ہوا ـــــ وہ ایک زرد گلاب!

پھر وقت قطرہ قطرہ ٹپکتا رہا ـــــ اور وہاں آکر تھم گیا جہاں مجھے تار ملا کہ امّی کا انتقال ہو گیا۔ وہ چند ہی دن بیمار رہی تھیں۔ اور انھوں نے مجھ کو آنے کے لیے بھی منع لکھوا دیا تھا کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو لے کر کہاں اتنی دور کا سفر کرے گی، میں اچھی ہو جاؤں گی تو خود ہی آجاؤں گی ـــــ اس لیے میں اس وقت پہنچی جب کہ

ایک ستون گرنے سے ساری عمارت کھنڈر ہو چکی تھی۔ گھر میں صرف ایک ہی فرد کم ہوا تھا مگر وہ گھر کی ساری رونق اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

میرے ابّا نے ان کی ہدایت کے مطابق ان کے کمرے کی کنجی مجھے دی۔ ''لو بنی، غالباً ہر چیز پر لکھا ہو گا کہ اسے کیا کیا جائے۔ اس لیے تمھیں کوئی زحمت نہ ہو گی۔ یہ سب انتظام تمھاری ماں نے اس وقت کیا تھا جب وہ ایسی کچھ زیادہ بیمار بھی نہ تھیں، غالباً ان کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ بچیں گی نہیں۔''

جب میں کنجی لے کر کھانے والے کمرے سے ہو کر امّاں کے کمرے میں جانے لگی تو میں نے دیکھا کہ وہ تصویر وہاں نہیں ہے۔ آتش دان خالی تھا۔ البتہ جتنی دور تک وہ ٹنگی رہتی وہاں کچھ مٹی اور جالے کی ہلکی سی لکیر اسی کے ناپ کے مطابق ایک چوکھٹا سا بناتی ہوئی کھنچی ہوئی تھی ـــــ دل کو ایک دھچکا سا لگا ـــــ ایسا کوئی وقت یاد نہ تھا کہ جب وہاں تصویر ہی نہ ہو۔ الٹے پاؤں ابّا کے پاس بر آمدے میں آئی:

''ابّا ـــــ وہ گلاب والی تصویر آپ نے آتش دان سے کیوں اتروادی؟''

وہ بولے: ''بیٹی ـــــ وہ تمھاری امّی نے خود اتروائی تھی، اپنے کمرے میں اس کو بھی رکھوا گئی ہیں۔''

میں نے امّی کا کمرہ کھولا ـــــ

اپنے کسی مرے ہوئے پیارے کی چیزیں سنگوانے سے زیادہ سوہانِ روح کوئی دوسرا فرض نہیں۔ کبھی ان چیزوں پر پیار آتا ہے کہ اس کی تھیں، کبھی ان سے نفرت محسوس ہوتی ہے کہ اس سے وفا نہ کی تو کس سے کریں گی۔ ایک ایک چیز کے ساتھ یادوں کا ایک طوفان سا اٹھتا چلا آتا تھا کہ ـــــ کب خریدی تھی، کتنے شوق سے لی تھی، گھر پر لا کر کس چاؤ سے خوش ہو ہو کر سب کو دکھائی تھی ـــــ یہ فلاں نے دی تھی، سالگرہ پر، نئے سال پر، عید پر، شادی کی سالگرہ پر ـــــ ہر چیز پر چٹ لگی تھی ـــ کس کو دی جائے، کب دی جائے، کیوں دی جائے۔ پلنگ پر جو بستر، ریشمی لحاف اور دولائی تھی اس تک کے متعلق ہدایت تھی ـــــ پورے کمرے میں اگر اور لوبان کی خوشبو بسی تھی جس سے کچھ پُراسرار سا روحانی ماحول بھی تھا، کچھ گھٹن سی بھی تھی کہ جس

سے جی گھبراتا تھا۔

سب سامان دیکھ کر میں کمرہ بند کرنے کے لیے الٹے پاؤں دروزاہ کے پاس کھسکی تو میری کہنی اس دیوار سے ٹکرائی ـــــ کواڑ کے پاس والی دیوار سے ہی ٹکی ہوئی وہ زمین پر رکھی تھی۔ ویسے تو وہ دیوار پر لگی ہوئی بھی کافی بڑی لگتی تھی، پر اس وقت زمین پر رکھی ہوئی وہ اور بھی بڑی لگ رہی تھی، اس پر باریک بادامی کاغذ لپٹا ہوا تھا جو سُتلی سے بندھا تھا۔

ایک دم میرا دل چاہا کہ اسے دیکھوں، برسوں امّی کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے وہ ہمیشہ سامنے لگی نظر آیا کرتی تھی۔ جب بھی میکے آتی تھی تو وہ آتش دان پر دکھائی دیتی۔ اکثر اس کے نیچے کھڑے ہو کر امّی نے مجھ کو پہنچنے پر سینے سے لگایا تھا، جاتے وقت پیار کر کے خداحافظ کہا تھا ـــــ وہ تصویر جیسے امّی کے وجود کا ایک حصہ تھی۔ اسے دیکھے بغیر ایسا محسوس ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ امّی کے گھر آئی ہوں۔

میں نے اس پر بندھی سُتلی کھولی، پھر کاغذ ہٹایا، سنہری فریم کے ایک کونے میں جہاں پالش کافی ادھڑی ہوئی تھی، ایک چھوٹا سا پرزہ تہہ کیا ہوا، فریم اور تصویر کے ایک سرے کے بیچ میں اٹکا ہوا تھا ـــــ میرا دل دھڑکنے لگا ـــــ کہیں امّی نے یہ تصویر بھی تو کسی کو دینے کی وصیت کر دی ہو۔ ان کی فیّاضی سے کیا دور، کسی کو بخش گئی ہوں! لیکن یہ تو میرے سوا کوئی نہیں لے سکتا۔ میں یہ کسی کو نہیں دوں گی ـــــ ڈرتے ڈرتے میں نے تہہ کیا ہوا پُرزہ نکالا، اس پر اوپری تہہ پر میرا نام لکھا تھا!

کانپتے ہاتھوں اور بہتے آنسوؤں کے ساتھ میں نے وہ پُرزہ کھولا، آنسوؤں کے چلمن سے الفاظ دھندلے دھندلے دکھائی دے رہے تھے۔

لکھا تھا ـــــ "زرینہ بیٹی ـــــ تم نے ایک دفعہ مجھ سے پوچھا تھا کہ یہ زرد گلاب گچھے سے الگ کیسے ہو گیا۔ اس وقت تم بہت ننھی سی تھیں، میں تم سے کیا بتاتی ـــــ اور پھر بہت سی باتیں انسان کبھی اپنی زبان پر نہیں لا سکتا۔ اپنی اولاد سے بھی نہیں کہہ سکتا۔ پر وقت آج تمھیں یہ سمجھائے گا کہ کوئی کس مجبوری اور بے بسی کے ساتھ اپنے پیاروں سے الگ ہوتا ہے۔ کوئی بھی پھول گچھے کو چھوڑنا نہیں

چاہتا، مگر اسے چھوڑنا پڑتا ہے۔ یہ تصویر مجھے اپنی سب چیزوں سے زیادہ پیاری ہے۔ اس لیے یہ تمھارے واسطے ہے۔ میرا تو اب کوئی گھر نہ ہوگا مگر خدا تمھارے گھر کو سلامت رکھے۔ اسے اپنے کھانے کے کمرے میں آتش دان پر لگانا اور اس سے سدا پیار کرنا۔"

—— تمھاری امّی

ہاں تو یہ وہی تصویر ہے، شفق کا پس منظر، روشنی پر بڑھتا اندھیرا۔ ہرے پلش کا میز پوش، جیسے تازی قبر پر اگی ہوئی چمک دار مخملی گھاس، اس پر دمکتے کٹ گلاس کا پھول دان، رنگ برنگے گلابوں کا گچھا —— اور سب سے الگ، سب سے دور، سب سے بچھڑا، مرجھاتا ہوا —— وہ ایک زرد گلاب!

عصمت چغتائی

عصمت چغتائی ۱۹۱۵ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ ان کی تعلیمی قابلیت بی، اے، بی ٹی (آج کل کا بی۔ ایڈ) تھی۔ انھوں نے کچھ دیر تک سرکاری ملازمت بھی اختیار کی۔ ۱۹۴۲ء میں شادی کے بعد، ملازمت ترک کر کے بمبئی میں سکونت اختیار کی، جہاں وہ فلموں، صحافت اور ادب کے ساتھ وابستہ رہیں۔

عصمت چغتائی کی تحریریں، تانیثی اردو ادب کا وہ پہلا سنگِ میل ہے، جہاں سے مردوں کے عاید کردہ اصولوں، ضابطوں اور صدیوں سے تیار کردہ فصیلوں کے خلاف یلغار کا راستہ شروع ہوتا ہے۔ ان کی تحریریں تانیثی حسیت اور تانیثی شعور کے اظہار کا پہلا تجربہ ہیں۔

عصمت چغتائی نے ۱۹۴۰ء کے آس پاس اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ اس وقت قومی اور بین الاقوامی سطح پر ادب، سیاست اور سماج کے محاذوں پر زبردست تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ ملکی سطح پر ترقی پسند مصنفین کا ادب اور سیاست کے محاذوں پر کافی بول بالا تھا۔ عصمت چغتائی رسمی طور پر اس مکتبۂ فکر کے ساتھ کبھی وابستہ نہیں ہو سکیں۔ اس زمانے کے ترقی پسند حلقے کے ادبی دبدبے کے پیشِ نظر اس طرح کا خطرہ (risk) بہت کم ادیب ہی مول لے سکتے تھے۔

عصمت چغتائی کی تحریریں عورتوں کے تئیں تاریخی جبر کے خلاف احتجاج ہی نہیں، بلکہ برملا اس جبر کی بنیادوں پر قائم حصاروں کو توڑنے کا اعلانِ جنگ ہیں۔

عصمت چغتائی کی تحریروں میں بے باکی ہے، جن سے ان کی جرأتِ اظہار کا پتہ چلتا ہے۔

عصمت چغتائی کے موضوعات جنسی بھی ہیں، سماجی اور سیاسی بھی۔ وہ ہر موضوع پر بے باکی سے قلم اٹھاتی ہیں۔ 'لحاف' جیسے افسانے کی تخلیق سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ شجرِ ممنوعہ کو ہاتھ لگانا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ اپنے ایک انٹرویو میں (ماہنامہ شاعر بمبئی ۱۹۷۶ء جلد ۴۷ شمارہ ۳) عصمت چغتائی نے کہا تھا کہ "جنس کا موضوع گھٹے ہوئے ماحول اور پردے میں رہنے والی بیویوں کے لیے بہت اہم ہے۔ وہ اس پر بہت بات چیت کیا کرتی ہیں۔ میری افسانہ نگاری اسے گھٹے ہوئے ماحول کی عکاسی ہے۔"

عصمت چغتائی نے انگریزوں کے خلاف جدوجہدِ آزادی، دوسری جنگِ عظیم، ہندو مسلم فسادات، تقسیم ہند اور تحریکِ امنِ عالم جیسے موضوعات پر بھی بے باکی سے قلم اٹھایا۔ اس ضمن میں ہندوستان چھوڑو، جڑیں، کیڈل کورٹ، بہو بیٹیاں، یہ بچے، ان موضوعات پر لکھے گئے بہترین افسانے ہیں۔ عصمت چغتائی سماج کے پسماندہ اور نادار طبقوں سے متعلق لکھتے ہوئے نعروں کا استعمال نہیں کرتیں، ایک فن کار کی طرح پلاٹ، زبان و بیان اور کرداروں پر پوری طرح قادر رہ کر فن پارے کو جنم دیتی ہیں۔ 'چوتھی کا جوڑا' افسانہ ایسی ہی فنکاری کا ایک نہایت ہی عمدہ نمونہ ہے۔ اس افسانے میں شادی کے جوڑے سینے والی ماہر ایک عورت، ہر سال اپنی بیٹی کے لیے چوتھی کا ایک جوڑا تیار کرنے کے باوجود وہ جوڑا اپنی بیٹی کو پہنانے میں ناکام رہتی ہے۔ اس کہانی میں افسانے کی دلچسپی، تجسس اور جمالیاتی عنصروں کے ساتھ آخر تک قائم رہتی ہے، جو عصمت چغتائی کے فن پر دسترس کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

عصمت چغتائی کی زبان نسوانی احساسات، جذبات و خیالات کے اظہار کے لیے ان کا ایک دلچسپ ہتھیار ہے۔ زبان کے اس استعمال سے ان کی تحریروں میں

انفرادیت کا ایک ایسا رنگ ملتا ہے، جو صرف ان کا خاصہ ہے۔ زبان کے اس مخصوص رنگ اور لب ولہجہ کی وجہ سے ان کی کہانیوں کے دوسری زبانوں میں تراجم میں خاصی دشواریوں کی شکایتیں سننے کو ملتی ہیں۔ عصمت چغتائی کی تحریروں میں غضب کی تیر اندازی نظر آتی ہے اور یہ تیر طنز کے ہیں، جو وہ لگاتی تو بڑی معصومیت کے ساتھ ہیں، لیکن ان کا نشانہ خطا نہیں ہوتا۔ ان کی تحریروں میں طنز کے ساتھ ساتھ مزاح بھی شامل ہے، اور یہ دونوں خصوصیات قاری کو کچھ اس طرح سے گرفت میں لیتی ہیں کہ تحریر کو ختم کیے بنا چین نہیں آتا ہے۔

عصمت چغتائی اردو ادب کی ایسی افسانہ نگار ہیں جنھوں نے اپنے وقت کے حالات کو بہت گہرائی سے سمجھا اور جانا، لیکن ان حالات کے ساتھ کسی قیمت پر سمجھوتہ نہیں کیا۔

عصمت چغتائی نے اردو نثر کی ہر صنف کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا، جن میں ناول، افسانے، ڈرامے اور خاکے شامل ہیں۔ ان کے ناول ضدی، ٹیڑھی لکیر، ایک بات، معصومہ، جنگلی کبوتر، قطرۂ خون، انسان اور فرشتے اور عجیب آدمی، خاصی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ ان کا معروف ناولٹ دل کی دنیا ان کے باغیانہ خیالات کا اچھا خاصہ ترجمان ہے۔ افسانوی مجموعے، چوٹیں، چھوئی موئی، دو ہاتھ اور کلیاں بھی خاصے معروف ہیں۔ انھوں نے دو مشہور ڈرامے 'دھانی بانکیں' اور 'شیطان' بھی تحریر کیے۔ ان کے تحریر کیے ہوئے خاکے تاویل، سودائی اور دوزخی کے نام سے شایع ہوئے ہیں۔

عصمت چغتائی

چابڑے

کتنی بار قلم اٹھاتی ہوں اور رکھ دیتی ہوں۔ اس سے زیادہ نہیں لکھ پاتی کہ چابڑے کو اصل میں چچابڑے کہنا چاہیے تھا مگر لوگ جلدی میں انھیں چابڑے ہی کہتے تھے۔ ان کا اصل نام تو تمیز الدین یا امتیاز الدین یا ممتاز الدین تھا۔ غرض "الدین" ضرور لگا ہوا تھا۔ حالانکہ دین دھرم سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ نماز بھی وہ کبھی بھولے بھٹکے ہی پڑھ لیتے تھے۔ روزے جوانی میں جوانی کی وجہ سے، اور بڑھاپے میں دمے کی وجہ سے رکھ ہی نہ سکے۔ قرآن کو ہاتھ لگانے سے بھی مجبور تھے کیونکہ دمے کے ساتھ مثانے کی کمزوری کی بھی شکات تھی اس لیے وضو ٹوٹ جایا کرتا تھا۔ اور سیکڑوں لتوں کے ساتھ عورتوں کی لت بھی لگی ہوئی تھی۔ لٰہذا کمانے کے باوجود حج کی توفیق نہ ہوئی۔

شاید کبھی "چابڑے تندرست" بھی ہوں گے، مگر میں نے تو انھیں ہمیشہ چھینکتے، کھانستے، بڑی ہڑ کھاتے دیکھا اور چوبیس گھنٹوں میں چودہ گھنٹے موری پر بیٹھے دیکھا۔ جب وہ چلتے تھے تو ان کے پیچھے مکھیوں کا ایک جلوس سا چلتا تھا اور فضا سڑی ہوئی مچھلیوں کی بدبو سے بوجھل ہو جاتی تھی۔ جدھر بھینس گھوڑا اور مرغیاں رہتی ہیں

ادھر ہماری شاندار کوٹھی کے غیر ضروری کونے میں چابڑے کی کوٹھری تھی۔ پاس ہی کالی کیچڑ سے بھری ایک موری تھی جو نوکروں کے پاخانے سے گزر کر پیچھے میں رِستی تھی۔ نہ جانے چابڑے کے جسم سے کون سا تیزاب نکلتا تھا کہ جہاں سے وہ موری کالی ناگن کی طرح لہراتی ہوئی گزرتی تھی، آس پاس کی ساری ہریالی جل جاتی تھی۔

مگر سب سے زیادہ شرم کی جو بات تھی وہ یہ کہ چابڑے ہمارے بہت ہی قریب کے رشتے دار تھے۔ ان سے خون کا رشتہ تھا۔ حالانکہ خون کا رشتہ باقی نہیں رہنا چاہیے تھا کیونکہ بزرگوں کا سارا خون کالی کیچڑ بن کر موری میں بہہ چکا تھا۔ لہٰذا یہ خونی رشتہ سراسر بہتان رہ گیا۔

مگر کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں چابڑے کو عشق بھی ہوا تھا۔ عمدہ خالہ ان کی چچازاد بہن سے اپنے پھپھیرے بھائی کی منگنی ہوئی تھی۔ ان دنوں منگنی نکاح کا درجہ رکھتی تھی۔ ایک دن چچا چابڑے نے کنکیا اڑاتے وقت ممٹی پر سے عمدہ خالہ کو دھوپ میں پلنگڑی کی آڑ میں نہاتے دیکھ لیا۔ پلنگڑی کچھ ایسے زاویے سے کھڑی تھی کہ عمدہ خالہ کے دودھ جیسے پنڈے کو صرف بان کے جال کا عکس ڈھانکے ہوئے تھا۔ چابڑے کی کنکیا کٹ گئی، ڈور لٹ گئی اور وہ بے سدھ، دودھ پر تیرتے ہوئے سُرمئی جال میں الجھے غوطے کھاتے رہے۔ عمدہ خالہ جل مچھلی کی طرح اس جال میں مچلتی رہیں۔

اس وقت عمدہ خالہ کی عمر دس یا گیارہ برس تھی۔ کیا زمانہ لوٹ گیا ہے آج کل کی گیارہ برس کی لونڈیاں جانگیے پہنے لڈکڈے پھرتی ہیں۔ کوئی ان کی طرف پھر کے بھی نہیں دیکھتا، عشق تو بڑی بات ہے۔

چابڑے نے سر پٹخ دیا مگر عمدہ خالہ کے باوا نے ان کی ایک نہ سنی اور عمدہ خالہ بیاہ کر اپنی پھوپھی کے پاس چلی گئیں۔ بس جانو اسی دن سے چابڑے کا بھیجہ لوٹ گیا۔

قاعدے سے کہانی یہاں آکر ختم ہو جاتی ہے اور میرا قلم ٹھوکر کھا کر ستانے کو رک جاتا ہے۔ آگے لکھنے کو رہ ہی کیا گیا ہے۔ چابڑے نے نہایت غیر شاعرانہ حرکتیں کیں۔ نہ تو انھوں نے دشت پیمائی کی اور نہ سر میں تیشہ مار کر جان دی۔

اگر وہ بھی رانجھا، مہیوال یا پنّوں ہی بن جاتے تو آج ان کی بھی امر کہانیاں لکھی جاتیں جس کی فلمیں بنتیں اور تب مجھے اتنی دِقّت ان پر قلم اٹھاتے وقت نہ پڑتی جتنی اب پڑ رہی ہے۔

دو چار دن منہ اوندھائے پڑے رہنے کے بعد انھیں عشق کی گرد جھاڑ کر اٹھنا ہی پڑا، کیونکہ دادا ابا نے الٹی میٹم دے دیا کہ اگر وہ مجنوں بننے کا پروگرام رکھتے ہیں تو اتنے جوتے پڑیں گے کہ سارا عشق ناک کے رستے نکل جائے گا۔ وہ مثل مشہور ہے کہ مار سے بھوت بھاگتا ہے تو پھر بھلا حضرتِ عشق کی کیا مجال تھی جو دادا ابا کے نعل دار جوتے کے آگے کچھ غراد کھاتے۔ چابڑے کو انھوں نے اپنے پہلوان دوست کو سونپ دیا اور سمجھا دیا کہ ایسے گھسّے دو کہ سارا زنگ اتر جائے۔

زنگ اتر گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے چابڑے چھ فٹے پہلوان بن گئے۔ جب وہ محلے میں انگڑائی لیتے تو لوگ اپنی کنواری بیٹیوں کو کوٹھریوں میں بند کر کے تالہ لگا لیتے۔ شہر میں کوئی دنگا فساد ہوتا، جڑ میں چابڑے کا ہاتھ ہوتا۔ رنڈیوں کے کوٹھے تو اسٹیشن تھے جہاں وہ دم بھر کو رکتے اور آگے بڑھ جاتے۔ ان کا ذریعہ آمدنی کیا تھا کسی کو نہیں معلوم تھا۔ مگر وہ ہمیشہ چالیس ہزار کے لٹھے کا گھٹنا اور باریک سے باریک ولایتی تن زیب کا کرتا پہنے جگر مگر کرتی کامدار جوتی، مگر سر پر بجائے ٹوپی کے شکاری ہیٹ پہنتے۔ سفید براق کپڑوں میں ان کا سیاہ جسم آبنوس کی طرح چمکا کرتا۔ ان کی رنگت میں سیاہی اور کچھ سبزی مائل نیلاہٹ جھلکتی تھی جیسے سانپ نے ڈس لیا ہو۔ جلد کے رنگ سے ایک رنگ زیادہ گہری مونچھیں اور بال۔ دبنگ آواز جیسے نرخرے میں لاؤڈ اسپیکر لگا ہو۔ دل پر زخم کھا کر چابڑے بھری بندوق بن گئے۔

''شادی ہو جائے گی تو سنبھل جائے گا۔'' دادی بی کہتیں اور وہ رنگ برنگی لڑکیوں کے نقشے انھیں للچانے کو ان کے سامنے کھینچا کرتیں۔ مگر چابڑے وہی ایک بات کہتے۔

''شادی تو ہو سکتی ہے امّاں جی۔''

"کس سے کرنا ہے مجھے بتا تو سہی۔" وہ شوق سے پوچھتیں۔

"عمدہ خانم سے۔"

اور دادی بی سر پیٹ لیتیں۔ "ہے جوانی مرگ بیاہی عورت کو داغ لگاتا ہے، تیری زبان کو آگ لگے۔"

"تو بیوہ ہو سکتی ہے عمدہ کانم۔" چابڑے کی کالی کالی مونچھوں میں سفید دانت چمکتے اور دادی بی لرزا ٹھتیں۔ چابڑے کا کیا بھروسہ۔ ایک دن ایک رنڈی ان سے روٹھ گئی، یہ گئے تو ان کی طرف سے منہ پھیر کر اپنے نئے گاہک سے لاڈ کرنے لگی۔ چابڑے نے چوٹی پکڑ اسے اپنی طرف موڑ لیا۔ گاہک بھی الجھ پڑا۔ چابڑے نے اٹھا کر اسے دو منزلے سے نیچے پٹخ دیا۔ رنڈی نے پولیس کو کھلا پلا کر بات دبا دی۔ چابڑے نے اسے موٹی سی گالی دی۔ پھر بہت پچھتائے کہ خواہ مخواہ بے چاری گالی کی ذلت ہو گئی۔

چابڑے زیادہ گھر سے باہر رہنے لگے۔ پھر شہر سے باہر رہنے لگے۔ کبھی سال دو سال میں آجاتے۔ تین چار یار دوست یا خوشامدی ساتھ چپکے ہوتے۔ ڈھیروں روپیہ لاتے۔ سارے محلے کے لکڑی کے صندوق میں روپیہ جمع کرا دیتے۔ صبح مٹھی بھر روپیہ لے کر اس کے پیسے بھنا لیتے اور خود مسجدوں کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتے اور لونڈوں کا جمِ غفیر انھیں گھیر لیتا۔ فی پیسہ ایک چپت کے حساب سے دام چکا دیے جاتے۔ جب مارتے مارتے ہاتھ شل ہو جاتے تو موسم کا پھل اور مٹھائی منگا کر بانٹ دی جاتی۔ جو کم پڑ جاتے تو کاٹھ کے صندوق سے دوسری مٹھی نکل آتی اور جب کبھی عمدہ خانم کا نام آتا چچا دادی بی سے کہتے "عمدہ خانم سے کہو اس نامراد کو چھوڑ دو۔ ورنہ کسی دن داؤں لگ گیا تو عمدہ خانم کو پار کر دوں گا۔"

اور دادی بی بھی جوتے لے کر چابڑے پر ٹوٹ پڑتیں۔ "اے تجھے ہیضہ ہو، تجھے ڈھائی گھڑی کی سمیٹے، بال بچوں والی کو داغ لگاتا ہے۔"

اور چچا ہنستے ہوئے مٹھی بھر روپیہ لے کر بھاگ جاتے۔ جب پیسے ختم ہو جاتے تو چابڑے ایک دم غائب ہو جاتے۔ دادای بی ان کے پیسے کو ہاتھ لگانا حرام

سمجھتی تھیں۔ فقیر کو دیتے بھی کراہیت محسوس کرتیں۔ جسم کے کپڑوں کے علاوہ وہ کچھ ساتھ نہ لے جاتے۔ ان کے جانے کے بعد دادی بی ان کے کپڑے اور بستر لپیٹ کر خیرات خانہ بھجوا دیتیں۔

چابڑے کو مستقل قسم کی چیزوں سے بڑی نفرت تھی۔ ایک دفعہ جو آئے تو ایک میلی کچیلی کو بھی ساتھ لے آئے۔ کسی کو کچھ اس کے رشتے کا پتہ نہ تھا۔ ہاں رات کو وہ ان کے پاؤں دباتی تھی۔ معلوم ہوا دھوبی کی عورت لاہیا کو بھگا لائے ہیں۔ دادی بی نے ماتھا کوٹ لیا۔ ''نکال دو سالی کو۔'' چابڑے لاپرواہی سے بولے۔

مگر اس نے وہ واویلا مچایا کہ توبہ بھلی۔ اس کا میاں ایک آدھ دفعہ آیا، کہنے لگا ''اب میرے کام کی نہیں رہی'' اور کچھ روپے لے کر چلا گیا۔ اس کا ایک لڑکا بھی تھا جسے چابڑے کبھی ساتھ لیے چلے آتے۔ انگلی پکڑ کر اسے بازار کرنے لے جاتے، ڈھیر سے کھلونے دلاتے، اس کا خوب لاڈ کرتے پھرتے۔ ایک دم جی اکتا جاتا تو چپت مار کر بھگا دیتے۔ چابڑے شراب پیتے تھے اس لیے دادی بی نے ان کا چولہا الگ کر دیا۔

بدھیا ان کے لیے گوشت بھون کر پراٹھے تلتی اور آدھی رات تک بھوکی پیاسی ان کا انتظار کرتی اور جب وہ نشے میں چور رنڈی کے کوٹھے سے لوٹتے تو بھنا گوشت اور پراٹھے کھلا کر ان کے پیر دباتی۔ چابڑے اس کی خدمت گزاری سے ذرا مرعوب نہ ہوتے اور ذرا سی بات بات پر مار مار کر بھرتہ کر دیتے۔ اور ایک دن وہی ہوا جس کا دادی بی کو ڈر تھا۔ محرموں کے دن تھے۔ چابڑے سارا دن شراب پی کر ڈھول پیٹتے رہے اور تعزیے اٹھاتے رہے۔ رات کو تھکے ہارے لوٹ رہے تھے کہ انھیں ایک ہاتھ رکشا ٹوٹی ہوئی نظر آئی۔ گلی سنسان تھی اور سواری دیوار سے لگی رکشا کی مرمت کا انتظار کر رہی تھی۔ برقعہ پوش عورت چابڑے کو دیکھ کر ایک دم دیوار سے پھسل کر بیٹھ گئی۔

''کیا بات ہے؟'' چابڑے نے رکشا والے سے پوچھا۔

"حجور رکشا الٹ گئی۔" رکشا والا چابڑے کو جانتا تھا مگر ان کے گھونسے کو بھی خوب پہچانتا تھا۔

"ابے یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔"

"حجور مرجا (مرزا) صاحب کے گھر کی سواری ہے، اب انھیں کیسے پہنچاؤں۔"

"کون سے مرزا صاحب؟"

"حجور مرتجا بیگ۔"

"ہیں۔۔۔ عمدہ خانم۔" چابڑے نے گھٹے ہوئے گلے سے کہا اور ان کا نشہ ہرن ہو گیا۔ دو چار موٹی موٹی گالیاں رکشا اور اس کے مالک کو دیں اور پھر احمقوں کی طرح سر کھجانے لگے۔ ان کی زبان کو تالا لگ گیا۔

"حجور دوسرے رکشا آگے نکل گئے۔ بھیڑ میں میں پیچھے رہ گیا۔" چابڑے سر کھجاتے اور منہ ہی منہ میں گالیاں بکتے رہے۔ سوچنے لگے کہ بھلا اس وقت سواری کہاں ملے گی کہ اتنے میں ایک تانگے میں دو آدمی جاتے دکھائی دیے۔ چابڑے نے تانگہ رکوا کر ان سے کہا کہ "اترو" وہ اینٹھنے لگے تو چابڑے نے دونوں کے سر پکڑ کر ٹکرا دیے اور عمدہ خالہ سے کہا "چلو بیٹھو" عمدہ خالہ بری طرح لرزنے لگیں۔ اگر پاس کوئی کنواں کھائی ہوتی تو جان دے دیتیں۔ مگر آج تو موذی کے ہاتھوں جان کے لالے پڑ گئے۔

"سیدھی طرح تانگہ میں بیٹھ جاؤ۔ میں کھا نہیں جاؤں گا عمدہ خانم۔" چابڑے گرجے۔ درود و آیۃ الکرسی پڑھتی خالہ تانگے میں بیٹھیں۔ چچا ساتھ تانگے کے بم پکڑے چلے۔ جگہ تھی پر خود نہ بیٹھے تانگے میں۔

اور سارے راستے ان کے منہ کو لگا ہوا تالہ نہ کھلا اور عمدہ خالہ کے برقعے کی نقاب آنسوؤں میں بھیگی رہی۔ ان کی ساری دھمکیاں سارے ڈر ہوا میں تحلیل ہو چکے تھے۔ وہ تانگے کے ساتھ بھاگ رہے تھے اور آنکھیں نیچی تھیں۔ مکان سے تھوڑی دور ان کے قدم رک گئے۔ جیب سے دو روپے نکال کر انھوں نے تانگے والے کو دیے

اور جب خالہ اتر کر ڈیوڑھی میں چلی گئیں تو چابڑے سر جھکائے اپنے گھر کی جانب چل دیے۔ رات کو جب بدھیا نے ان کے پیر دبانے چاہے تو انھوں نے اس کے ایک لات رسید کی اور منہ موڑ کر پڑ رہے۔

بدھیا مستقل شے بن کر چابڑے کی جان کو چمٹ گئی۔ چابڑے نے اسے چار چوٹ کی مار دی اور نکالنا چاہا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"چاہے میری بوٹیاں کاٹ ڈالو مرزا جی، اب میں اور کہیں کی تو رہی نہیں، ذات برادری نے باہر کر دیا۔ تم نے میرا اخرابا کیا ہے۔ چھاتی پر چڑھ کر خون پی جاؤں گی، پر اس جنم میں تو نہیں چھوڑوں گی۔"

چابڑے سہم کر چپ ہو گئے۔

بدھیا کی اس دلیری کا ان پر رعب پڑ گیا۔ کچھ عمر کا تقاضا، کچھ روپے کی ریل پیل میں کمی، چابڑے اسے جھیل گئے۔ بدھیا ان کی بیوی کی طرح خدمت کرتی۔ پھٹا پرانا پہنتی۔ کبھی اسے خیال بھی نہ آتا۔ گھر کے بوڑھے بچے سب اسے بدھیا کہتے ہیں گھر کی بہو بیٹیوں سے دور وہ ہمیشہ زمین پر بیٹھتی، مگر اس کی خدمت گزاریوں میں کمی نہ آئی۔ چابڑے نے اسے مارنا بھی کم کر دیا۔ کبھی ایک آدھ جھاپڑ دھر دیتے۔ روپیہ پیسہ اسی کے ہاتھ میں رہتا۔ بڑی جھک جھک سے شام کے نشے کا خرچہ دیتی۔ چابڑے خفا ہوتے۔ لیکن کچھ نہ کر پاتے۔ بلکہ اسے زیور بھی بنوا کر دینے شروع کیے اور زبردستی پہننے کو کہتے۔ اس کا لڑکا ایک فیکٹری میں نوکر ہو گیا تھا۔ چابڑے اسے بہت چاہتے تھے۔ اپنا موروثی مکان اس کے نام کر دیا تھا اور بالکل بیٹے کی طرح سمجھتے تھے۔ ایک دن جب بڑے ترنگ میں تھے۔ بدھیا نے دہی ڈال کر گوشت بھونا اور گرم گرم پراٹھے اتارے۔ چابڑے وہیں چولہے کے پاس بیٹھ کر چٹخارے لے کر کھانے لگے۔

"بھئی واہ کمال کر دیا بدھیا آج تو تُو نے۔ بھئی واہ۔۔۔ کیا بوٹی گلائی ہے، تجھے تو انعام ملنا چاہیے۔ بول کیا مانگتی ہے۔"

"جو مانگوں سو دو گے مرزا جی۔"

"ہاں ہاں۔۔۔وہ تیرے کنگن کل آجائیں گے۔"

"وہ تو بیکار بنوا دیے۔۔۔"

"پھر کیا مانگتی ہے؟"

"مرزا جی مجھ سے نکاح کر لو۔" بدھیا نے لجا کر کہا۔ "بڑھاپے میں گناہ نہیں کیا جاتا۔"

"نکاح! گناہ!"

چابڑے کا منہ پھٹا کا پھٹا رہ گیا۔ نوالہ ہاتھ سے چھوٹ پڑا۔ ان کا سیاہ چہرہ تنور کی طرح دمک اٹھا۔ چولہے سے لکڑی کھینچ کر انھوں نے بدھیا بیگم کا پلیتھین کر دیا۔ اگر لوگ بھاگ کر بچا نہ لیتے تو شاید وہ اسے جان سے ہی مار ڈالتے۔ "گناہ کی بچی، کہتی ہے نکاح کر لو۔ سالی ہماری ہتک کرتی ہے اور ہم نے اس کمبخت کے لیے کچھ نہ کیا۔ ہم نے اس کے لڑکے کو اپنا جائز وارث بنایا۔ فیکٹری میں نوکری دلوائی۔ جو کچھ کمایا اس کی ہتھیلی پر رکھا۔ پھر بھی نکاح کی ضرورت ہے۔ ہمارے اوپر اعتبار نہیں۔ قُطّامہ کی۔ ہم سے پکے کاغذ لکھواتی ہے۔"

مرتے مر گئی پھر بدھیا نے نکاح کی تمنا نہ کی۔

وقت کی ندی اچھلتی کودتی بل کھاتی رہی بہتی رہی۔ بدھیا کے مرنے کے بعد چابڑے جیسے یتیم ہو گئے۔ کوئی ان کی دیکھ بھال بدھیا کی طرح کیسے کر سکتا۔ ننھے بچے کی طرح آنچل کی چھاؤں میں رکھتی تھی۔ ان کی گت بن گئی اور وہ ایک رشتے دار کے در سے دوسرے کے در کی ٹھوکریں کھاتے لڑھکتے پڑتے ہماری کوٹھی کے سب سے سڑاندے کونے میں پہنچ کر وہیں بس گئے۔

چابڑے کی زندگی کے آخری دن کتنے ویران اور پیار و محبت سے خالی تھے۔ کئی دن وہ اکیلے کوٹھری میں پڑے دم توڑتے رہے۔ کبھی کوئی جھانک آتا۔ کون تھا جو دن رات ان کے سرہانے بیٹھتا۔ پرانی یادوں کے جال میں الجھے چابڑے تڑپتے رہے، تلملاتے رہے۔

"عمدہ خانم سے کہلوا دو اب زیادہ انتظار کی سکت نہیں، اتنا نہ آزماؤ اب آ بھی

آجاؤ۔" حالانکہ عمدہ خالہ ان سے پانچ سال پہلے مر چکی تھیں۔ اپنے ہاتھوں سے مٹی دے کر آئے تھے۔

"بڑھیا سے کہو یہ سارے دروازے کیوں بند کر دیے۔۔۔ دم گھٹ رہا ہے۔"

دودھ جیسے پنڈے پر سُرمئی جال گہرا ہوتا گیا۔۔۔
کنکیا کٹ گئی اور ڈور لٹ گئی۔

قرۃ العین حیدر

قرۃ العین حیدر ۲۰ جنوری ۱۹۲۶ء کو علی گڑھ میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے ایم، اے تک تعلیم حاصل کی۔ ان کی پرورش ایک اعلیٰ علمی اور ادبی گھرانے میں ہوئی۔ ان کے والد سجاد حیدر یلدرم اور والدہ نذر سجاد حیدر اردو ادب میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے جو ادبی حلقوں میں 'عینی آپا' کے نام سے مشہور ہیں، اپنے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۴۴ء میں کیا۔ ان کا پہلا افسانہ 'یہ باتیں' ہمایوں (لاہور) میں اسی سن میں شایع ہوا۔ اس لحاظ سے انھوں نے اپنا ادبی سفر عصمت چغتائی کے ساتھ ساتھ ہی شروع کیا۔ ان کے افسانوں پہلا مجموعہ "ستاروں سے آگے" ۱۹۴۷ء میں شایع ہوا۔

موضوع، زبان اور بیان کے اعتبار سے عینی آپا نے اردو ناول اور افسانے کو نئی جہتوں سے ہم کنار کیا ہے۔ تقسیمِ ملک نے بلاشبہ ان کے ذہن کو بے حد متاثر کیا ہے جس کا اظہار واضح طور پر ان کی تحریروں میں نظر آتا ہے، تاہم تاریخی اور سماجیاتی جبر ان کی تخلیقات کا امتیاز ہے۔ اس جبر کو وہ نہایت فن کاری سے برتتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات کی طوالت گراں نہیں گزرتی۔ یہ تحریریں اپنے حسن اور گہرائی کے

ساتھ قاری کی دلچسپی کو آخری نقطہ تک کھینچ لاتی ہیں۔

عینی آپا اپنے ناولوں اور افسانوں میں تاریخی جبر، سماجی، ثقافتی اور معاشی تضادات، عالمی بالخصوص برصغیر میں سیاسی اور سماجی تبدیلیوں اور ان کے دُور رس اثرات کے موضوعات کو سنجیدگی اور فنکارانہ اندازِ بیان کے ساتھ قلم بند کرتی ہیں۔ ان کے شہرۂ آفاق ناول "آگ کا دریا" میں برصغیر کے عہدِ پارینہ، ویدوں اور اپنشدوں کے عہد سے ہوتے ہوئے تقسیمِ ہند کے المناک دور تک کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی ادوار کا احاطہ نہایت ہی عالمانہ اور دانشورانہ انداز میں کیا گیا ہے۔ وقت کے دھارے میں تیرتا ہوا ہر دور فلم کے ایک ایک سین کی طرح نظروں سے گزرتا ہے۔ 'آگ کا دریا' پلاٹ، زبان و بیان، علامتوں اور استعاروں کے لحاظ سے بلاشبہ اردو زبان و ادب میں ایک نئے رجحان، ایک منفرد سوچ اور ایک علیحدہ اپروچ کا آئینہ دار ہے۔

تقسیمِ ملک کے ساتھ بدلتی ہوئی سماجی اور ثقافتی قدریں عینی آپا کے مخصوص موضوعات ہیں۔ 'میرے بھی صنم خانے' اور 'آخرِ شب کے ہم سفر' ان کے دو ناول ان ہی موضوعات کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ یہی موضوعات ان کے افسانوں کے بھی ہیں۔ عینی آپا کی تحریروں میں تہذیبوں اور ثقافتوں کے عروج و زوال کی داستانیں رقم ہیں۔ تاریخ کے اس عمل سے وہ خوفزدہ یا دل برداشتہ نہیں نظر آتیں، لیکن اس بات کا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ انسانی قدروں کے زوال پر وہ افسردہ ضرور ہوتی ہیں۔

تقسیمِ ہند اور اس تقسیم کے تباہ کن دور رس اثرات عینی آپا کی تحریروں کے موضوعات تو ہیں ہی، تقسیم کے بعد، برصغیر کے سیاسی، معاشی اور سماجی حالات پر ان کی گہری نظر ہے۔ اس لحاظ سے ان کا افسانہ ہاؤسنگ سوسائٹی ایک نمائندہ حیثیت رکھتا ہے۔ یہ افسانہ ایک نو مولود اسلامی مملکت پاکستان کے ایک پورے دور کے سیاسی اور سماجی حالات کا عکاس ہے۔ مملکتِ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد اس نظام میں جن نئے سماجی اور سیاسی طبقات نے جنم لیا، اس افسانے میں ان کی خوب تصویر کشی کی گئی ہے۔

عینی آپا کی تحریروں کا ماحول صرف جاگیردارانہ نظام تک ہی محدود نہیں

ہے۔ ان کے افسانوں کے موضوعات بہت وسیع ہیں۔ ان میں صوفی سنت بھی ہیں، سیاسی سماجی اور معاشی جبر کی شکار خواتین بھی ہیں اور آمرانہ نظام کے خلاف جدو جہد کرتے ہوئے نوجوان بھی ہیں۔

عینی آپا نے اپنا ادبی سفر ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں شروع کیا، تاہم وہ اس تحریک کی سیاسی رسہ کشی سے بالکل الگ تھلگ نظر آتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ بہ حیثیت ادیبہ وہ دانشوروں کے زمرے میں بڑی شان کے ساتھ جلوہ نما ہیں۔

عینی آپا صحافت کے ساتھ بھی خاصی وابستہ رہی ہیں۔ وہ دنیا کے بیشتر ممالک کی سیاحت سے بھی لطف اندوز ہوئی ہیں۔ ان دونوں تجربوں نے ان کی معلومات کے خزانوں کو مالا مال کر دیا ہے۔

عینی آپا کا ادبی سفر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ابھی جاری ہے۔ گلوبلائزیشن (globalisation) کے اس دور میں اور بدلتی ہوئی سماجی، معاشی اور ثقافتی قدروں کے پیش نظر اردو ادب کو ان کے ردِ عمل کا بے تابی سے انتظار ہے۔

قرۃ العین حیدر

ہاؤسنگ سوسائٹی

جنوری کی برفانی صبح کا کہرا درختوں پر سے چھٹنے لگا۔ دور گومتی کے اس پار ریت کے ٹیلوں کے پیچھے سورج نکل آیا تھا اور ندی کے ساحل پر بکھری ہوئی سیپیاں چمکنے لگی تھیں۔ شبرو امشعلچی باورچی خانے کی چھولداری کے آگے، نم زمین پر اکڑوں بیٹھا سیاہ مسالے والی لمبی تختی پر نہایت فرّاٹے سے چھریاں صاف کر کر کے ایک طرف کو ڈھیر لگاتا جا رہا تھا اور سردی کم کرنے کے لیے گانے میں مصروف تھا۔

تجلّی طور کی موسیٰ کلیما بن کے نکلیں گے
محمدؐ مصطفٰے محشر میں دولھا بن کے نکلیں گے

پھر اس نے دوسری قوّالی شروع کی :

دیکھنا ساکی گھٹا گل جار پر چھائی نہ ہو

"باپ رے باپ! ـــــ اتنا بڑا جاڑا ـــــ "دوارکا پرشاد "مخادیم" نے چپراسیوں کی چھولداریوں سے نکل کر اظہارِ خیال کیا ـــــ

"آج آدھی رات تک کی دیلیل ہو بٹیے ـــــ "شبرو انے جواب دیا، اور چھریاں چمکانے میں جٹا رہا۔

امریوں کے دھند لکے میں سے دو ہیولے نمودار ہوئے۔ گہر آلود فضا میں سورج کی کرنوں کا چوڑا راستہ بن گیا جو سورج سے شروع ہو کر عین شبروا کے سر پر آن کے ختم ہو رہا تھا۔ کرنوں کی زد میں آنکھیں میچتے ہوئے اس نے آگے آگے آتے ہوئے آدمی کو ذرا بلندی سے آواز دی ــــ "بندگی ــــ سلامالےکُم ــــ "اور دوار کا پرشاد سے مخاطب ہوا ــــ "بڑے سیر سے سیر سے ڈالی لائے ہیں۔"

سیّد مظہر علی جھینگا پاسی کے سر پر مرغیوں کا جھوا اٹھوائے نزدیک آگئے ــــ خشک میوے اور تازہ پھلوں کی کنڈیاں انھوں نے خود اٹھا رکھی تھیں۔

دوار کا پرشاد انگوچھا کندھے پر ڈالتے کافی لمبا فاصلہ طے کر کے میم صاحب کے خیمے پر گئے اور باہر سے کہا ــــ "حجور ــــ کوئی جنے ڈالی لائے ہیں۔"

"واپس کر دو ــــ !" اندر سے آواز آئی۔

چند منٹ بعد دوار کا پرشاد پھر خیمے میں آگئے ــــ "میم صاحب او کہت ہیں کی ــــ "

"ٹھیک ہے ــــ ٹھیک ہے ــــ ہمار اسلام دو اور ڈالی لوٹا دو ــــ !"

دوار کا پرشاد نے واپس آکر میم صاحب کے الفاظ دہرا دیے۔

"اچھا ــــ !" سید مظہر علی نے مزید اصرار نہیں کیا اور سر جھکائے گاؤں کی سمت لوٹ گئے۔ انھوں نے سوتی اچکن پر گاڑھے کی چادر کا بکل مارا ہوا تھا اور کنٹوپ پہن رکھا تھا اور ادھوڑی کے جوتوں کے ساتھ ہاتھ سے بنے ہوئے سرخ موزے پہنے تھے جن کی ایڑیاں نکل چکی تھیں۔ ان کے پیچھے پیچھے بڑا سا جھوا سر پر اٹھائے جھینگا پاسی اچکتا اور لنگڑاتا ہوا تیز تیز چلتا شبروا کو بہت قابلِ رحم معلوم ہوا۔ دونوں آدمی بہت قابلِ رحم معلوم ہوئے۔ اس نے تختی پر پوڈر چھڑکا اور "راجا ہریش چندر" نوٹنکی کی "چیز" الاپنے میں مصروف ہو گیا :

"ہم محلن کے باسی رے پنڈت
کِت تک دور توری کاسی۔ کِت تک دور ــــ "

سورج کی روشنی تیز ہوئی۔ کیمپ میں چہل پہل شروع ہو گئی۔ آم کے باغ میں اجلاس لگ گیا۔ دور دور تک کھیت کی منڈیروں کے ساتھ ساتھ یکے اڈھے، بہلیاں اور سائکلیں کھڑی تھیں۔ اہلکار، عرضی نویس، محرّر، کسان، زمیندار، گواہ، موکل درختوں کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ دو کہار ایک ڈولی اٹھائے اجلاس کی سمت آئے۔ڈولی درخت کے نیچے رکھ دی گئی،اس کے اندر بیٹھی ہوئی عورت آہستہ آہستہ رونے لگی۔ مقدمے کی ساعت کا آغاز ہوا۔ عورت نے اپنا بیان دیا۔ پھر وہ سسکیاں بھر بھر کے رونے لگی۔

دوپہر ہو گئی ــــــ شیشم کے جھنڈ میں سے ایک ہاتھی نمودار ہوااور جھومتا جھامتا کیمپ کی جانب بڑھا۔ وسط کے بڑے خیمے کے سامنے پیادے نے نیچے اتر کر دوار کا پرشاد کو آواز دی۔ دوار کا پرشاد پھر میم صاحب کے خیمے کی طرف لپکے۔

"نواب شمس آرا بیگم کا ہاتھی آوا ہے ــــــ چھوٹی بٹیا کی کھاطر ــــــ "

"واپس کر دو ــــــ !" میم صاحب نے حسب معمول جواب دیا۔ وہ اس وقت خیمے کے عقب میں آرام کرسی پر بیٹھی اپنے بیٹے کو الہ آباد خط لکھ رہی تھیں۔ چھوٹی بٹیا دوسرے خیمے سے تیر کی طرح نکلیں "ماما ــــــ ماما ــــــ ماما ــــــ !" انھوں نے دہاڑنا شروع کیا ــــــ "ہم تو جمبو پر ضرر چڑھیں گے ــــــ ہم تو جمبو کو امرود کھلائیں گے ــــــ ماما ــــــ !" اتنا کہہ کر وہ زمین پر لوٹ گئیں۔

"اچھا ــــــ اچھا ــــــ جاؤ ــــــ مٹی میں مت لوٹو ــــــ !" میم صاحب نے جھنجھلا کر جواب دیااور خط لکھنے میں منہمک ہو گئیں۔

چھوٹی بٹیا نے جھک کر اپنی سرخ جوتیوں کے بکل بند کیے اور گود میں اٹھائے جانے کے لیے دوارا کا پرشاد کی طرف ہاتھ بڑھا دیے۔ مدار بخش خدمت گار نے جلدی سے پھول دار ریشمی چھتری لا کر دی۔ مہاوت نے ہاتھی کو گھٹنوں کے بل بٹھا دیا۔ دوار کا پرشاد بٹیا کو گود میں لے کر ہودے میں فروکش ہو گئے اور اپنی بڑی بڑی سفید مونچھوں پر بڑے وقار سے ہاتھ پھیرا۔ وہ کلکٹر صاحب کے چپراسی تھے۔ کوئی

مذاق تھوڑا ہی تھا۔ نواب شمس آرا بیگم کا پیادہ ان سے بہت مرعوب نظر آرہا تھا۔ گھسی ہوئی زربفت کی جھول اور منقش ہودے والا ہاتھی اجلاس کے سامنے گزرتا پاربتی پور کی گڑھی کی سمت روانہ ہوا۔

عدالت میں ڈولی کے اندر سے پردہ نشین بی بی کی فریاد جاری رہی۔ ڈولی کے پیچھے تین طرف چھوٹی سی قنات لگا دی گئی تھی۔ قنات کے اندر ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکی ہری چھینٹ کا تنگ پاجامہ پہنے، گلابی ململ کا دوپٹا سر سے لپیٹے زمین پر اکڑوں بیٹھی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے ڈولی کا پردہ پکڑ رکھا تھا اور دوسرے سے زمین پر لکیریں کھینچ رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ سہمی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگتی۔ باہر اجلاس میں اس کا نام بار بار لیا جارہا تھا۔ قنات کی درز میں سے جھانک کر اس نے باہر دیکھا۔ سامنے سے ہاتھی گزر رہا تھا۔ اس پر سنہرے بالوں والی ایک بہت چھوٹی سی بچی سوار تھی۔ بچی نے بالوں کی کھال ایسا بڑے بڑے بالوں والا کوٹ پہن رکھا تھا اور ایک سفید مونچھوں والے وردی پوش بڑے میاں نے رنگ برنگی چھتری سے اس پر سایہ کر رکھا تھا۔ بالکل جیسے پریوں کی کہانیوں میں ہوتا ہے۔ ڈولی کے پاس بیٹھی ہوئی لڑکی حیرت سے جھانکتی رہی، یہاں تک کہ ہاتھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ سر جھکا کر گیلی مٹی پر انگلی سے تصویریں بنانے میں دوبارہ مشغول ہو گئی۔ اب کے سے اس نے ہاتھی کی تصویر بنائی۔ اس پر ہودے کی چار لکیریں کھینچیں اور اس میں تاج پہنے ہوئے شہزادی بٹھال دی۔ اس نے اپنے آپ سے کہا ـــــ "یہ شہزادی میں خود ہوں ـــــ میں بنتی بیگم ـــــ!"

"مسماۃ ثریا سلطان عرف بنتی بیگم نابالغ ـــــ" عدالت میں اس کا نام پھر لیا جارہا تھا۔ اس نے سہم کر ڈولی کا پردہ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

ہاتھی گاؤں سے باہر نکلا۔ آبادی کے سرے پر صدیوں پرانی خانقاہ تھی اور باؤلی ـــــ اور اس سے آگے بڑھ کر مخدوم زادہ شاہ منور علی کا مکان تھا۔ ہاتھی مکان

کے برابر کی گلی میں سے گزرا۔ ہودے میں سے چھوٹی بٹیا کو مکان کا کچا آنگن نظر آیا جس میں لمبی سیاہ ڈاڑھی اور سیاہ کاکلوں والے ایک بزرگ نارنجی رنگ کی کفنی پہنے ایک گھاٹ پر بیٹھے آسمان کو تک رہے تھے ـــــ کھچڑی داڑھی اور اداس شکل والے ایک اور بزرگ مونڈھے پر بیٹھے تھے۔ امرود کے پیڑ کے پیچھے ایک لڑکی سرخ رنگ کا تنگ پاجامہ پہنے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے مسالہ پیس رہی تھی۔ اس نے چاندی کی میلی میلی چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ ہاتھی آگے بڑھ گیا۔

دھوپ تیز ہو گئی۔ اجلاس لنچ کے لیے برخاست ہوا۔ لالہ حسین بخش متصدی نے وہ مسل لپیٹی جس میں مسماۃ بوٹا بیگم مدعیہ کی درخواست منسلک تھی۔

"منکہ مسماۃ بوٹا بیگم، بالغ، قوم مسلمان، ذات سیّد، سکنہ موضع محمد گنج، تحصیل ہرونی، ضلع سلطان پور، بیوہ سیّد زوّار حسین جنت آرام گاہ، کاشت کار موضع نذا کی ہوں۔ عرصہ تین سال ہوا، فدویہ کی اکلوتی دختر ثریا سلطان عرف بنتی بیگم کے واسطے، جس کو اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے بہ طفیل جناب بتولِ پاک علیہ السلام دولتِ حسنِ صورت و سیرت و عصمت سے مالامال کیا ہے؛ نواب سکندر علی خان عرف نواب بھورے تعلقہ دار سہرولی و درگاہ کنڈ نے خواہش کتخدائی کی ظاہر کی۔ فدویہ نے پیغام نامنظور کیا۔ کس واسطے کہ نواب صاحب موصوف باوجود کثیر تعداد ازدواج منکوحہ ممنوعہ و غیر ممنوعہ ہونے کے بعمر پینسٹھ سال از حد عادی جملہ فسق و فجور و لہو لعب کے ہیں۔ بعد چند روز مؤرخہ ۲۲ فروری ۱۹۳۷ء چار گھڑی رات گئے بذریعہ پیادگان مسلح اغوا بنتی بیگم سلمہا بعمر ساڑھے تیرہ سال عمل میں آیا اور اس بانوئے معصوم و عفیفہ کو گڑھی درگاہ کنڈ میں قید کر دیا گیا۔ نواب شمس آرا بیگم تعلقہ دار پار بتی پور اس وقت تک فدویہ سے بہت موافق تھیں کس واسطے کہ ممدوحہ نے بعالم طفولیت فدویہ سے درس قرآن حکیم لیا تھا اور فدویہ گڑھی پار بتی پور میں آتوجی کے عہدے پر مدت مدید تک منصوب رہی تھی۔ علاوہ ازیں شوہر فدویہ کا گڑھی کے ذاکروں میں اسم تھا اور

وہ مرحوم اخیر ایام زندگی تک باوجود فتور بصارت امام باڑہ ممدوحہ میں سوز خوانی کرتے رہے تھے۔ لہٰذا بیگم صاحبہ دام اقبالہا نے از طرف فدویہ رجوعِ عدالت کیا اور مقدمہ فوجداری واغوا نواب بھورے پر دائر کردیا کہ مابین تعلقہ ہائے ممدوحہ و نواب صاحب پشت ہاپشت سے سلسلہ مقدمہ بازی بہ وجوہ گوناگوں جاری ہے۔

بعد چند روز بوقتِ نصفِ شب نقاب پوش ڈاکوؤں نے غریب خانہ میں کود کر فدویہ کے درِ یتیم سیّد کرار حسین سلمہٗ کو بعمر اٹھارہ سال گنڈاسوں سے شہید کر دیا اور غائب ہو گئے۔

بعد ازاں عدالت حاکم پرگنہ کے روبرو میاں نوروز صاحبزادہ نواب شمس آرا بیگم نے بیان دیا ـــــ ازبسکہ بوجہ اس شعلہ جدید ورخنہ و فتنہ ثانی کے یہ امر اب از حد نازک اور پیچیدہ ہو چکا ہے۔ بحکمِ جناب خلائق پناہ مسٹر رام سرن بھار گو حاکم پرگنہ مسماۃ بسنتی بیگم بذریعہ پولس گڑھی درگاکنڈ سے نکال کر میری تحویل میں دے دی گئی۔ مگر اب طاقت میاں نوروز کے دعوے باطل کے مقابلے کی اس اجل گرفتہ میں نہیں ہے اور فدویہ بحالت افلاس ولاچاری و بے کسی واضطرار و اندوہ شدید حضور کیواں قدر نوشیر وان وقت ہمایوں شکوہ جناب کلکٹر صاحب بہادر سے فریادی ہے کہ مزید ابواب فساد و آتش افروزی اس ضمن میں بحکم خاص بند فرماویں اور یہ امر کہ اعانت ارباب استحقاق کی منظورِ نظر فیض مظہر ہے باعثِ ثواب و حسنات اور زیادتی نام و نشان آپ کا ہووے گا۔

دیگر عرض یہ ہے کہ گواہی میں فدویہ دریں حالت پُر آشوب فقط سیّد مظہر علی کاشت کار سکنہ محمد گنج کو پیش کر سکتی ہے جو گو کہ رعیت نواب شمس آرا بیگم کی ہیں لیکن بکمال صفائے باطن ـــــ

دھوپ اب اتر کر صحن کی دیوار پر آچکی تھی۔ سیّد مظہر علی اپنے کھیتوں کا ایک چکر لگا کر پھر مونڈھے پر آن بیٹھے۔ ان کے بڑے بھائی شاہ منور علی 'مدینہ' اخبار

سے منہ ڈھانپ کر کھاٹ پر لیٹ گئے۔ سیّد مظہر علی کی بی بی نے دن بھر دھوپ میں سرخ مرچیں سکھائی تھیں جن کی دھانس سے سیّد مظہر علی کو دو تین چھینکیں آئیں۔ جھینگا پاسی کی عورت دہلیز میں بیٹھ کر منظور النساء کے سر میں جوئیں دیکھنے لگی۔ منظور النساء کے سرخ ٹول کے تنگ پاجامے کے پائینچے کیچڑ میں سنے ہوئے تھے کیونکہ وہ دن بھر اُسارے کے سامنے گیلی مٹی سے گھروندے بناتی رہی تھی۔

شاہ منور علی بے چینی سے پھر اٹھے ـــــ "اللہ غنی ـــــ !" انھوں نے زور سے نعرہ لگایا۔ مرغیاں کٹ کٹ کرنے لگیں، ڈیوڑھی کے دروازے کی کنڈی کھڑکی اور سیّد اختر علی اندر داخل ہوئے۔

"بھیالوٹ آئے تحصیل سے ـــــ "سید مظہر علی کی بی بی نے کہا۔

"السلام علیکم ـــــ !" نووارد نے اپنے دونوں بڑے بھائیوں کو ذرا زور سے مخاطب کیا۔

"وعلیکم السلام! جیتے رہو ـــــ !" سیّد مظہر علی نے کہا۔ سیّد اختر علی نے صحن کے کونے میں رکھے ہوئے مرغیوں کے جھابے پر نظر ڈالی۔

"میم صاحب نے ڈالی واپس کر دی۔" سیّد مظہر علی نے کہا۔

"پورے دس روپے اشرفی لال سے ادھار لے کر ای ڈالی لے گئے رہے تمہری خاطر ـــــ "بھاوج نے ٹاٹ پر سے مرچیں بٹورتے ہوئے فریاداً کہا۔

"ہمارے کام کا کیا ہوا ـــــ ؟" سیّد اختر علی نے ذرا ناگواری سے پوچھا۔

"ہم ٹھاکر صاحب کا سفارشی خط لے کر اجلاس سے قبل کلکٹر صاحب سے ملے تھے۔ انھوں نے کہا۔ ہمیں سفارش کی کوئی ضرورت نہیں۔ لکھنؤ درخواست بھجوا دیجیے۔ ہم جانسن صاحب سے بات کر لیں گے۔"

"جانسن صاحب شام کو پہنچیں گے۔ کل سویرے ہی شکار کے لیے چلے جائیں گے۔ ہم کیمپ سے سب معلوم کرتے آئے ہیں۔ دو روپے لالہ حسین بخش کی نذر کیے۔"

"میم صاحب انگریز ہیں نا ـــــ ؟" سیّد مظہر علی نے دریافت کیا۔

دادا انگریز تھے۔ مرزاپور میں نیل کی کاشت کرتے تھے۔ نواب صاحبِ کرم پور کی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ کلکٹر صاحب بہادر کے کسی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میم صاحب کو میکے سے زمینداری ملی ہے۔ الٰہ آباد اور مسوری میں کوٹھیاں ہیں۔ دو لڑکے ہیں ——" سید اختر علی نے جواب دیا۔

"اللہ کی شان ہے۔ وہ پاک پروردگار بعضے لوگن کو دنیا کی ہر نیامت عطا کرت ہے ——" بھاوج نے سُوپ میں ارہر کی دال پھٹکتے ہوئے قناعت سے اظہارِ خیال کیا —— خاموشی چھا گئی۔

"خداوند تعالیٰ عاشق کو بہت لمبی جائیداد عطا کرتا ہے۔ صبر کی جائیداد ——"

شاہ منور علی نے دفعتاً کہا اور اٹھ کر باہر چلے گئے اور سنسان گلی میں سے گزرتے درگاہ کی منڈیر پر جا بیٹھے۔

"بھائی صاحب نے بھی تمھارے لیے اتنے چلّے کھینچے —— کچھ نہ ہوا۔" سیّد مظہر علی نے آہستہ سے کہا —— "پچھلے چھ مہینے تک گومتی کنارے کٹی میں پڑے رہے۔ چلتے کے جاڑے تھے نمونیہ ہو گیا۔ منظوریاحقہ لے آؤ بٹیا ——!" انھوں نے لڑکی کو آواز دی۔ اس نے حقہ تازہ کر کے باپ کے سامنے لا رکھا۔ سیّد مظہر علی نے جو بڑے بھائی کے سامنے حقہ نہ پیتے تھے اب ایک کش لگایا اور بات جاری رکھی —— "ہم بہت ہاتھ پیر جوڑ کر گھر واپس لائے آج کل جناتوں کو قابو کرنے کا عمل کر رہے ہیں —— ہم نے کلکٹر صاحب سے تمھارے لیے کہا کہ ہمارا چھوٹا بھائی وکیل ہے مگر قسمت کا ہیٹا ہے۔ ضلع کچہری میں وکالت کی، وہاں نہیں چلی، کانپور میں پریکٹیس شروع کی، وہاں فاقوں کی نوبت آ گئی۔ اپنے لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتا ہے۔ سنا ہے لکھنؤ سکتر صاحب کے دفتر میں ایک ملازمت خالی ہوئی ہے۔ اگر حضور کرم گستری فرما کر اس کی سفارش کر دیں۔ وہ کہنے لگے۔ سیّد صاحب! ہم کس قابل ہیں۔ اللہ پر بھروسہ رکھیے۔ وہ دیر یا سویر سب کی سنتا ہے۔"

"اب ہم تیرہ تیزی کے مہینے میں سندیلے جائے کے شاہ مدار کے مزار پر چادر چڑھئی باچیے تم کا نوکری ملیہے ——" بھاوج نے سوپ دیوار پر ٹانگتے ہوئے کہا ——

سید اختر علی نے بیزاری سے بھاوج کو دیکھا اور گھڑونچی کی سمت نظر دوڑائی۔ بھاوج لپک کر گئیں اور جگر جگر کرتے مراد آبادی کٹورے میں گھڑے سے یخ ٹھنڈا پانی انڈیل کر دیور کو پیش کیا۔ وہ دیور سے ماں کی طرح محبت کرتی تھیں۔

سید مظہر علی نے دو پلی ٹوپی سر پر رکھی اور کھڑاؤں پہن کر عصر کی نماز کے لیے مسجد چلے گئے۔ سیّد اختر علی نے مدینہ اخبار اٹھا کر حقّے کی نَے اپنی طرف کھینچ لی کیونکہ وہ بھی بڑے بھائی کے سامنے حقّہ نہیں پیتے تھے۔ دور درگاہ کے منڈیر پر سے شاہ منور علی نے یابدّوح کا دل ہلا دینے والا نعرہ بلند کیا۔ اس وقت اس مکان میں اور اس فضا پر ایسی اداسی طاری تھی کہ کلیجہ پھٹتا تھا۔

باہر باؤلی کے نزدیک نیم تلے پھُڑ جمی تھی۔ نواب بھورے کا بھتیجہ منّن خان جو ڈاکوؤں میں مل گیا تھا بستی کے چند بے فکروں کے ساتھ بیٹھا چوسر کھیل رہا تھا اور پاسا پھینکتے ہوئے بار بار جمشید کو چڑا رہا تھا :

مرغانِ چمن دیتے ہیں جا جھیل میں انڈے
مختار لوگ دیتے ہیں تعطیل میں انڈے

جمشید علی ایک طرف کو اکڑوں بیٹھا بے دلی سے کھیل دیکھ رہا تھا جب منّن خان نے تین چار بار اس کے باپ کی بے روزگاری پر اس طرح چوٹ کی تو غم و غصّے سے بھنا کر اس نے منّن کو ایک تھپّڑ رسید کیا، بساط الٹ دی اور باؤلی کی نالیاں پھلانگ کر لمبے لمبے قدم رکھتا خانقاہ کی طرف چلا گیا۔

کھنڈر کے پیچھے چھپ کر اس نے چھنگلیا سے پلکیں خشک کیں اور سامنے دیکھنے لگا۔ نرکٹ کی باڑ کے نیچے قبرستان تھا جس میں ادھر ادھر روئی کے چند پیڑ کھڑے تھے اور روئی کے سفید سفید پھول سارے میں بکھرے ہوئے تھے۔ قبروں کے چاروں طرف اونچی اونچی گھاس تھی اور خاردار جھاڑیاں۔ اور ناگ پھنی اور کروندے اور تھوہر کے پودے۔ چھوٹے چھوٹے گہرے گہرے غار، ببول کے درخت، مٹی کی ڈھیریاں، سانپ کے بل۔ سفیدی سے لپے پتے مزار، کچی قبریں، دور کونے میں شیشم کے نیچے مجاور اور گورکن کے کچے گھر کھڑے تھے۔ گورکن کی بیوی نے رات کے کھانے کے

لیے چولھا سلگا دیا تھا اور کہرے کو لپیٹتا ہوا دھواں آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہا تھا۔ ایک گوشے میں تین چار ٹوٹے ہوئے گھڑے بکھرے پڑے تھے ــــــ ایک قبر پر کسی نے چراغ جلا دیا تھا اور اس کی لَو سے کتبے کا طاقچہ سیاہ ہو چکا تھا۔ سڑک کی رُخ والی منڈیر کے نیچے چنبیلی کی خودرو جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ دو چرواہنیں اپنی بکریوں کو ہنکا کر گھر لے جاتی ہوئی ادھر سے گزریں اور چنبیلی کے سائے میں بنی ہوئی ایک نئی قبر کو دیکھ کر ایک چرواہن نے کہا ــــ "سہاگن کی قبر ہے۔ جبھی چنبیلی رات کو ایسی مہکت ہے ــــ!" شام کے سناٹے میں سرد ہوا قبر پر جھکی بیری کی ٹہنیوں میں سرسرانے لگی۔

جمشید کو ڈر سا لگا۔ اس نے چپّل جھٹک کر تلوے کے نیچے سے ایک کنکری نکالی اور مٹی کے تودوں اور اینٹوں کو پھلانگتا کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ شاید مہاوٹیں برسنے والی تھیں۔ آسمان پر بادل چھا گئے تھے۔ جمشید بغلوں میں ہاتھ دیے سوں سوں کرتا بہت دیر تک منڈیروں پر گھومتا رہا۔ ہاتھی پاربتی پور کی گڑھی کی طرف سے واپس آرہا تھا۔ تالاب کے کنارے گولر کے نیچے کھڑے ہو کر جمشید نے بڑی دلچسپی سے ہاتھی کو دیکھا اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

چھوٹی بٹیا ہودے میں بیٹھی دوارکا پرشاد سے نل دمینتی کا قصہ سننے میں اس قدر محو تھیں کہ ان کی سرخ چھتری ان کے ہاتھ سے پھسل کر زمین پر گر گئی ــــــ ہاتھی آگے بڑھ گیا۔

جمشید نے نقرئی موٹھ والی رنگ برنگی ریشمی چھتری زمین پر سے اٹھالی اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اس نے مہاوت کو آواز دی مگر ہاتھی بڑھل کے درختوں میں غائب ہو چکا تھا۔ وہ چھتری ہاتھ میں لیے لیے گھر لوٹ آیا۔ صحن کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے چھتری بیٹھک کے ایک کونے میں کھڑی کر دی اور چکّر لگا کر ڈیوڑھی کی طرف پہنچا۔ چپلیں اتار کر ان کی گرد جھاڑی۔ ان کو دیوار پر رکھا اور پھر ایک پاؤں ناند پر ٹکا کر آنگن میں کود گیا۔

اس کے تینوں اداس شکلوں والے بزرگ، بڑے ا[illegible] [illegible] اور ا[illegible] [illegible]ن میں تخت پر حسبِ معمول سر جھکائے بیٹھے تھے۔ چچی دالان میں بگھار [illegible] [illegible] چچا ابا کی

لڑکی منظور النساء بلاوجہ اچھلتی کودتی پھر رہی تھی اور زور زور سے الاپ رہی تھی ـــــ

"ڈنڈا ہرایا گلّی رووت ہے
ڈنڈے کی ماں روٹی پووت ہے"

اتنے میں چچی باورچی خانے سے نکلیں اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور زور کا تمانچا لگایا ـــــ "جب دیکھو تب کھیل ـــــ اتنی بڑی ہو گئی ہو جب دیکھو تب لدگڑے ـــــ دونوں وقت ملت ہیں۔ اپنے ابّا کے وضو کا پانی لگا ـــــ"

منظور النساء بھائیں بھائیں کر کے رونے لگی اور پناہ لینے کے لیے باہیں پھیلا کر اپنے چچازاد بھائی کی طرف دوڑی جو اسی وقت دیوار پر سے اندر کودا تھا۔ جمشید نے بے پروائی سے اپنے چپل دیور سے اتار کر اسے تھما دیے۔

"جا انھیں کوٹھری میں رکھ آ ـــــ" اس نے لڑکی سے کہا۔ منظور النساء نے فوراً رونا بند کر دیا اور گرد آلود بڑے بڑے چپلوں کو بڑے پیار سے بانہوں میں سنبھالا۔ گویا وہ اس کی چہیتی گڑیاں تھیں اور اندر چلی گئی۔

جمشید مونڈھا کھینچ کر اپنے بزرگوں کے قریب بیٹھ گیا۔ جھنگا پاسی کی عورت سائبان میں سے گائے کھول کر ناند کی طرف لے جا رہی تھی۔ باہر گاؤں کے گھروں میں چراغ جل چکے تھے۔ سید مظہر علی کی بی بی نے دالان میں آکر روئی کے پردے چھوڑ دیے۔ مغرب کی اذان ہوئی ـــــ اندھیارا چھا گیا۔

شبروا مشعلچی نے سارے خیموں میں جا جا کر گیس کے ہنڈے، لیمپ اور لالٹینیں جمع کیں۔ ان کو باورچی خانے کی چھولداری کے سامنے لا کر ایک قطار میں رکھا۔ مدار بخش خدمت گار آئے اور اس قطار کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے اور انھوں نے جھاڑن سے شیڈ اور چمنیاں صاف کرنی شروع کیں۔ چھوٹی بٹیا ایک طرف سے اچھلتی کودتی آئیں اور اکڑوں بیٹھ کر بڑی دلچسپی سے یہ تماشا دیکھنے لگیں۔ ان کو ہر شام یہ تماشا دیکھنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔

مدار بخش نے چمنیاں صاف کرنے کے بعد بتیاں روشن کرنا شروع کیں اور ہمیشہ کی طرح پہلا لیمپ روشن کرتے ہوئے انھوں نے زیرِ لب کہا ـــــ

"چراغ روشن مراد حاصل صلوٰۃ صلوٰۃ سلام آلیکم یا منکر نکیر

دل میرا ایمان قبر میرا مکان ـــــ "

"مدار بخش تمھارا مکان قبر میں کیوں ہے؟" چھوٹی بٹیا نے ایک بار پھر حیرت سے اپنا سوال دہرایا۔

"شبیر ـــــ ! بلاقن کو بھیجو ـــــ جنم جلی نے ابھی تک استری گرم نہیں کی ہے ـــــ " دور کے خیمے سے میم صاحب کی آواز آئی۔ چھوٹی بٹیا کو استری کا تماشا بھی بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ تیر کی طرح بھاگتی ادھر پہنچیں ـــــ "ماما ـــــ ماما ـــــ بلاقن جنم جلی کیوں ہے؟" انھوں نے دریافت کیا۔

"بھاگ جاؤ یہاں سے ـــــ !"

"نہیں ـــــ بتایئے نا ـــــ ماما ـــــ !"

"ہئی وہ جنم جلی ـــــ " میم صاحب نے غصے سے جواب دیا۔ دراصل اس وقت وہ دوار کا پرشاد سے مخاطب تھیں۔

"ماں باپ کو کھا گئی۔ میاں نے دوسری عورت کرلی۔ گھر بارہ باٹ ہو گیا مگر وہ بدبختنی بھی کیا کرے۔ سب کرموں کا پھل ہے۔"

"ماما ـــــ ماما ـــــ کرموں کا پھل کیا ہوتا ہے ـــــ ؟"

"بٹیا چلیے آپ کو کمشنر صاحب یاد کرتے ہیں ـــــ !" دوسرے چپراسی نے اندر آکر کہا۔ وہ اسی تیز رفتاری سے خیمے سے باہر نکل گئیں۔

کیمپ میں اس رات بڑا بندوبست تھا۔ چاروں طرف گیس کے ہنڈے جھک جھک کر رہے تھے۔ چھوٹی بٹیا کو آج خاص طور پر اجازت مل گئی تھی کہ وہ بڑوں کے ساتھ کھانا کھائیں وہ خیمہ طعام میں اپنی اونچی کرسی پر بیٹھی "انکل جانسن" کو جمبو کی سواری اور گڑھی پاربتی پور کے پالتو ہرنوں اور بارہ سنگھوں کا قصہ سنا رہی تھیں۔ عمر کے لحاظ سے چھوٹی بٹیا کا قد بہت چھوٹا تھا اس لیے وہ اونچی کرسی پر بیٹھ کر ہی میز کے برابر

آسکتی تھیں۔ میز کے سرے پر میم صاحب سُورت کی رو پہلی "پارسی" بارڈر والی پیازی ریشمی ساری اور وائٹ ویز کلکتہ کے یہاں سے خریدا ہوا اوورکوٹ پہنے روسٹ کاٹنے میں مشغول تھیں۔ سنہری مائل کتھئی بالوں کے گُچھے مروّجہ فیشن کے مطابق ان کی پیشانی اور کانوں پر چھائے ہوئے تھے اور انھوں نے کانوں میں انگریزی وضع کے بُندے پہن رکھے تھے جن میں طلائی زنجیروں کے سرے پر دو بڑے بڑے موتی لٹک رہے تھے۔ جب میم صاحب دوران گفتگو سر ہلاتیں تو یہ بُندے گھڑیال کے پنڈولم کی طرح ہلتے۔ میم صاحب انگریز نژاد تھیں مگر انگریزی انھیں واجبی ہی آتی تھی اور شادی سے پہلے میکے میں سخت پردے میں ان کی پرورش ہوئی تھی لیکن ان کی سفید رنگت اور ذرا ولایتی چہرے مہرے کی وجہ سے نوکر چاکر انھیں 'بیگم صاحب' کے بجائے ادبدا کے میم صاحب کہنے پر مصر تھے۔

میز کے نیچے انگیٹھی دہک رہی تھی۔ پرال پر بچھی ہوئی دری پر ملازمین قابیں اٹھائے دبے پاؤں ادھر سے ادھر جارہے تھے۔ میم صاحب جانسن صاحب کو بُنتی بیگم کے اغوا کا قصہ سنانے لگیں۔ جانسن صاحب بہت نفیس اردو بولتے تھے۔

"مگر نواب بھورے بھی ایک گھاگ ہیں۔ پرانے سیار۔ ان کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ ہمیں بے چاری بوٹا بیگم پر بڑا ترس معلوم ہوتا ہے ـــــ" میم صاحب نے جانسن صاحب سے کہا۔

جنوری کی رات کی یخ بستہ ہوا تیز ہو گئی۔ خیمے کی دیواریں ہلنے لگیں۔ سن سن کرتے گیس کی روشنی ذرا مدھم پڑی تو شتر وا نے پھرتی سے اس میں ہوا بھر دی۔ مدار بخش نے لپک کر آخری کورس کے لیے پلیٹیں بدلیں۔ جب انھوں نے ایک قاب جانسن صاحب کے آگے پیش کی، جانسن صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ مدار بخش نے بڑی متانت سے ان سے کہا ـــــ "فِنش ـــــ" یعنی فِنش ـــــ یعنی یہ آخری کورس ہے۔ مدار بخش پُر تکلف دعوتوں کے موقعوں پر انگریزی مہمانوں سے ہمیشہ انگریزی بولتے تھے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے ان کے دادا پردادا صاحب لوگ کے بنگلوں پر بولتے آئے تھے۔

جانسن صاحب نے میزبان خاتون سے ڈنر سروس کی تعریف کی اور میم صاحب نے انھیں بتایا کہ یہ روسی برتن انھوں نے پشاور سے منگوائے تھے جہاں اے۔ ء کے انقلاب سے پہلے کے مشہور روسی برتنوں کی ایک دکان تھی۔ اس کے بعد جانسن صاحب نے کلکٹر صاحب سے کل کے شکار کے متعلق تبادلہ خیال کیا۔

خیمے کی ایک دیوار ذرا زور سے ہلی اور درز میں سے دو متجسس، متحیر آنکھوں نے اندر جھانکا۔

جمشید نے ایک بار پھر ہمت کی کہ اندر جا کر چھتری میم صاحب کو دیدے لیکن ایک بار پھر الف لیلوی منظر میں کھو گیا۔

اب بلوری پیالے میز پر لائے گئے جن کے پانی پر گلاب کی سرخ پنکھڑیاں تیر رہی تھیں مگر ان لوگوں نے یہ پانی پینے کے بجائے پیالوں میں اپنی اپنی انگلیاں ڈبو دیں۔

جمشید نے سنہرے بالوں والی بچی کو دیکھا جس کے عین، مغز کے اوپر بڑا سا سرخ ربن سجا تھا اسے اپنی چچازاد بہن منظور النساء یاد آئی جو کانوں کے بہت سارے سوراخوں میں چاندی کی میلی میلی بالیاں پہنتی تھی اور موٹی جھوٹی مارکین، ڈوریے اور گاڑھے کے خاک آلود کپڑوں میں بھنکتی رہتی تھی اور بڑی ہو کر اس کے پلّے بندھے گی اور وہ دونوں کانپور کی ایک تنگ و تاریک گلی میں اسی سفید پوشی اور تنگ دستی کی زندگی گزار دیں گے جیسی زندگیاں ان کے باپ اور چچا اور دادا اور پردادا نے گزاری تھیں جب کہ میم صاحب اور کلکٹر صاحب اور ان کی برادری والے اسی طرح معطر پانی کی بلوریں پیالوں میں نفاست سے اپنی انگلیاں ڈبوتے رہیں گے۔

دیوار کا پردہ ہلتا دیکھ کر مدار بخش اچانک اس طرف متوجہ ہوئے۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا۔

اندر جانسن صاحب نے سگار سلگایا۔ میزبانوں کو شب بخیر کہا۔ بچی کو پیار کیا اور کھڑکھڑاتا ہوا چمکیلا، سفید نیپکن میز پر رکھ کے کرسی سے اٹھے۔ دوارکا پرشاد نے

باہر سے لپک کر دروازے پر سے پردہ اٹھایا۔ جانسن صاحب بے حد لمبے تڑنگے انگریز تھے۔ وہ سر خم کر کے دروازے سے نکلے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے اپنے خیمے کی طرف چلے گئے۔ دوار کا پرشاد سرخ بانات کی اچکن پہنے پھر دروازے کے پاس اپنے اسٹول پر آن بیٹھے۔ انھوں نے جمشید کے پیروں کی چاپ سن لی اور آہٹ پر کان لگا دیے۔

"کون ہے ___ ؟"

انھوں نے ڈپٹ کر پوچھا۔ جمشید ہڑبڑا کر سرپٹ بھاگا۔ بھاگتے میں وہ خیموں کے رسّوں سے الجھ گیا۔ دوار کا پرشاد اور دوسرے چپراسیوں نے اسے پکڑ لیا۔ "چور ___ چور ___ وہ سب چلائے اور اس کے ہاتھ سے چھتری چھین لی۔

"چور ___ سرؤ ___ چوٹّے۔" دوار کا پرشاد نے جمشید کے منہ پر زور سے تھپڑ رسید کیا۔

"ہم چور نہیں ہیں ___ "اس نے بھنا کر کہا اور اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آ گئے ___ "ہم بٹیا کی چھتری دینے آئے تھے۔ ہمیں تالاب کے کنارے پڑی ملی تھی۔"

"سرؤ ___ ہم کا پڑھاوت ہو بے ایمان!" دوار کا پرشاد گرجے اور تین چار تمانچے اور لگا دیے۔

"مدار بخش ___ !" اندر سے میم صاحب نے آواز دی۔ مگر مدار بخش بھی موقع واردات پر پہنچ چکے تھے۔

چھوٹی بٹیا نے دروازے میں سے جھانکا ___ "ماما ___ ماما ___ ماما دوار کا پرشاد نے چور پکڑا ہے۔" انھوں نے بے حد خوش ہو کر کہا۔

"یہ کیا ہلا ہو رہا ہے ___ ؟" میم صاحب نے دروازے میں آ کر دریافت کیا۔ دفعتاً جمشید نے آنسو خشک کیے اور میم صاحب کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

"ہم چور اور بے ایمان نہیں ہیں۔ ہم سید جمشید علی ہیں۔ ہم درگاہ شریف

کے شاہ منور علی کے بھتیجے ہیں۔ ہمارے چچا سید مظہر علی صبح آپ کو سلام کرنے "پھر اس نے جلدی سے الفاظ تبدیل کیے ـــــ "آپ سے ملنے آئے تھے مگر آپ نے ان کو باہر ہی سے لوٹا دیا ـــــ!"

"شاہ منور علی ـــــ "میم صاحب نے ذرا دلچسپی سے دُہرایا ـــــ "شاہ منور علی۔ ہم نے ان کی شہرت سنی ہے۔ وہ جناتوں کو قبضے میں کرتے ہیں نا؟"

"بڑے ابا کے قبضے میں کوئی جنات نہیں ہیں۔ مسلسل افلاس اور احساسِ محرومی سے ان کے دماغ پر اثر ہو گیا ہے ـــــ "جمشید علی نے تلخی سے جواب دیا۔ سردی کی وجہ سے اس کے دانت بجنے لگے اور اس نے ایک سسکی بھری۔

"اندر آ جاؤ ـــــ باہر کیوں کھڑے ہو ـــــ؟" میم صاحب نے کہا ـــــ "مدار بخش پلیٹ لگاؤ ـــــ"

"جی نہیں۔ میں گھر سے کھا کر آیا ہوں۔"

میم صاحب نے اس کی بدلتی رنگت دیکھی۔ انھیں اپنا بیٹا سلمان یاد آ گیا جو اسی طرح غیور اور خوددار تھا۔

وہ خیمے کے اندر آ کر دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔

"بیٹا۔ جمشید بھیا کا شکریہ ادا کرو۔ یہ اتنی سردی میں تمھاری چھتری دینے آئے ہیں ـــــ!"

چھوٹی بٹیا نے چھتری سنبھال کر چھوٹی سی آواز میں "تھینک یو" کہا۔

"اب گڈ نائٹ کہو ـــــ"

"گڈ نائٹ ـــــ!" اور اس کے بعد وہ بُلاقن کے ساتھ باہر چلی گئیں۔

"تمھاری نواب شمس آرا بیگم سے قرابت داری ہے نا؟" میم صاحب نے دریافت کیا۔

"جی نہیں! ـــــ چچا ابا ان کی زمین جوتتے ہیں۔ راجاؤں اور نوابوں سے ہماری کوئی قرابت داری نہیں۔"

میم صاحب چونکیں۔ لہجے کی یہ تلخی انھیں بہت مانوس سی معلوم ہوئی۔ ان

کا لاڈلا بیٹا سلمان یونیورسٹی سے گھر آکر اپنے دوستوں کے ساتھ جانے کیا کیا اڑایا کرتا تھا۔ جاگیردار طبقہ۔ برطانوی استحصال۔ زرعی انقلاب۔ ناقابل فہم الفاظ اور اصطلاحات۔

"کہیں پڑھتے ہو ____؟"

"کانپور میں پڑھتے ہیں سیکنڈ ائر میں ____"

"شاباش!"

"اب اجازت دیجیے!"

"کافی تو پی لو۔"

کافی ____؟ کافی اس نے آج تک نہ پی تھی ____ "جی نہیں ____" اس نے مضبوطی سے جواب دیا۔ "ہمارا گھر گاؤں کے آخری سرے پر ہے۔ پہنچتے پہنچتے بہت دیر ہو جائے گی ____ اچھا آداب عرض۔" اتنا کہہ کر وہ خیمے سے نکلا اور تاریکی میں غائب ہو گیا۔

گھر پہنچ کر وہ دبے پاؤں دالان میں داخل ہوا۔ برابر چھوٹے سے دالان میں برابر چارپائیوں پر تینوں بھائی سو رہے تھے۔ چچی اماں اور منظور النساء دوسری طرف تخت پر فرخ آبادی چھاپے کے میلے میلے لحافوں سے منہ ڈھانپے خوابیدہ تھیں۔ وہ آہستہ سے جا کر اپنی کھاٹ پر گر گیا اور پتلا سا لحاف اوپر تک کھینچ لیا۔ زیادہ سردی لگی تو الگنی پر ٹنگی ہوئی لوئی بھی لحاف پر ڈال لی اور ٹانگیں سکیڑ کے کروٹ کے بل گڑی مڑی ہو کر سو گیا۔

تہجد کے وقت شاہ منور علی اٹھے۔ اندھیرے میں ٹٹولتے ٹٹولتے اس کے سرہانے آئے۔ کچھ پڑھ کر اس کے ماتھے پر دم کیا۔ اپنے تکیے کے نیچے سے نکال کر ایک تعویذ اس کے بازو پر باندھا اور پھر جا کر اپنی چارپائی پر پڑ رہے۔ اس کی آنکھ کھل گئی تھی مگر وہ دم سادھے لیٹا رہا۔ اور اس کا جی چاہا کہ خوب روئے۔ کچھ دیر بعد چچی اماں اٹھیں

اور انھوں نے لالٹین جلائی۔ منظور النسا بھی فوراً اٹھ بیٹھی۔ دونوں ماں بیٹیاں دُلائیاں سر سے اوڑھ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں اور وہاں انھوں نے جمشید کے سفر کے لیے ناشتہ تیار کرنا شروع کیا۔ پھر او نگھنے لگا۔ صبح کاذب کے وقت مرغ نے صحن کی دیوار پر جاکر اذان دی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے پاس گھڑی نہیں تھی۔ اس نے جلدی سے اندھیری گھپ کوٹھری میں جاکر اپنا ٹین کا بکس نکالا۔ دری میں بستر لپیٹا اور در میں جاکر آہستہ سے آواز دی :

"منظوریا ـــــ !ہمارے چپل کہاں ہیں؟"

منظور النسا بھاگی بھاگی آئی۔ دالان کی دیوار پر ٹنگی ہوئی تیل کی ڈبیا روشن کی۔ مچان پر سے چپل اتارے۔ اس کا کوٹ لائی۔ کھونٹی پر سے اس کا مفلر اتار کر دیا۔ منہ دھونے کے لیے گرم پانی لے کر آئی اور لوٹا اور بیسن دانی تخت کے کنارے رکھ دی۔

چچی اماں نے ناشتہ دان بھر کر تخت پر رکھا اور چائے بنانے کے لیے پھر باورچی خانے میں چلی گئیں۔

"بھیا ـــــ تمھارے لیے پوری ہم خود بناوا ہے۔" منظور النسا نے کہا۔

"اچھا ـــــ" جمشید نے جوتوں کے فیتے باندھتے ہوئے ذرا محبت سے اسے دیکھا اور اس کا دل پسیج گیا ـــــ بے چاری ـــــ بے چاری ـــــ بدنصیب لڑکی ہے۔ اس نے دل میں کہا۔

ڈیوڑھی پر آکر گوبندا نے آواز لگائی۔ اس کے باپ اور چچا جاگ اٹھے۔ چچی نے اس کے بازو پر امام ضامن باندھا۔ وہ گوبندا کے یکے پر بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔

چنے کے کھیتوں پر کہرا ڈولتا تھا اور چاند کی روشنی پھیکی پڑ چکی تھی۔ بہت دور کلکٹر صاحب کے کیمپ میں اکا دُکا روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ دریا پار سے ریل کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ آم کے باغات، خانقاہ، تالاب، ہنومان جی کا مندر، جھینگا پاسی کا جھونپڑا، بڑے ابا، چچا، چچی اماں، منظور النسا ـــــ یہ سارے ہیولے پیچھے ہٹتے ہوئے ایک

دھند لکے میں غائب ہو گئے۔ اس رات کیمپ سے واپس آ کر اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ کانپور لوٹ کر جی توڑ کر محنت کرے گا۔ فرسٹ ڈویژن لائے گا۔ مقابلے کے امتحان پاس کرے گا۔ اور ایک دن اس کے نام کے آگے لکھا جائے گا ـــــ ایس۔ جے۔ علی، آئی۔ سی۔ ایس ـــــ

پھر جب میں محمد گنج آؤں گا تو کسان کہیں گے۔ جنٹ صاحب دورے پر آئے ہیں۔ جنٹ صاحب۔ کلکٹر صاحب۔ کمشنر صاحب۔ کچے راستے پر یکے کو زور کا دھچکا لگا۔ اس نے جلدی سے یکے کا ڈنڈا پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے کوٹ کی جیب میں سے پاسنگ شو کی ڈبیا اور ماچس نکالی۔ جب اس نے ماچس جلائی تو گوبندوا نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"ای کا کرت ہو ـــــ ؟" اس نے صدمے سے کہا۔

"گھر پہ نہ بتانا گوبند چاچا ـــــ !" جمشید نے بڑی لجاجت سے درخواست کی۔ آئی۔ سی۔ ایس کے سارے خواب گوبندوا کی تیوری پر بل دیکھ کر پل کے پل میں ہوا ہو گئے۔

"اچھا۔ نہ کہیبا۔ مُل سہرن مارہ کے ای سب نہ سیکھو۔" گوبندوا نے مریل گھوڑے کو دوبارہ چابک لگایا ـــــ "چلت نہیں سسُر۔ تو ہو کا سِر گٹ چاہی؟"

جمشید نے ایک طویل کش لے کر ناک سے دھواں نکالا۔ اتنے میں سامنے سے گوبردھن چاچا آتے دکھائی دیے۔ وہ کندھے پر ہل رکھے بیلوں کی جوڑی ہنکاتے اپنے کھیت کی طرف چلے جا رہے تھے۔ جمشید نے گھبرا کر سگریٹ مٹھی میں چھپا لیا۔

گوبردھن چاچا نے اگر دیکھ لیا تو یکے سے اتار کر پچاس جوتے لگائیں گے۔ اور گنیں گے ایک نہیں!

گاؤں میں کس قدر دقیانوسیت ہے۔ اس نے شدت کی جھنجھلاہٹ کے ساتھ سوچا۔ ہندوستان کے گاؤں ـــــ ہاہاہا ـــــ ہندوستان کے گاؤں ـــــ

اسے معلوم نہ تھا کہ اس صبح وہ تقریباً آخری بار اپنے گاؤں سے جا رہا تھا۔ اس کے بعد وہ کبھی اس طرح محمد گنج نہ آئے گا۔ اس طرح گوبندوا کے یکے پر نہ بیٹھے گا۔ گوبردھن چاچا سے خائف ہونے کی ضرورت اسے پھر کبھی محسوس نہ ہو گی۔

۲

کانپور پہنچ کر وہ اپنے گھر کی سیڑھیوں پر چڑھا۔ سامنے گلی کی دیوار پر "بھابھی" اور "پکار" کے اشتہار اور کانگریس کے جلسے کے پوسٹر لگے تھے۔ بیٹھک کے دروازے پر چق پڑی تھی۔ اندر اینٹوں کے فرش پر ایک میز اور موکلوں کے لیے تین چار کرسیاں رکھی تھیں۔ کونے میں قانون کی موٹی موٹی گرد آلود کتابیں الماری کے تختوں پر چنی ہوئی تھیں۔ ایک دیوار پر سید اختر علی کی تصویر لگی ہوئی تھی جس میں وہ بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی کا گاؤن پہنے کیمرے کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ باقی دیواروں پر سر سید احمد خاں اور تاج محل کی تصاویر آویزاں تھیں۔ پنجتن پاک کے نام اور کلمے اور "فاعتبروا یااولی الابصار" فریموں میں لگے تھے اور مدینہ منورہ کا ایک کلنڈر لٹک رہا تھا۔ ایک کونے میں تذکرہ غوثیہ کی جلد اور نظام المشائخ، دین و دنیا اور مدینہ کے فائل دھرے تھے۔ سلطان الہند خواجہ غریب نوازؒ کی درگاہ کی ایک بڑی سی تصویر کارنس پر رکھی تھی۔ کئی برس قبل سید احمد علی نے اپنے حصے کے کھیت بیچ کر کان پور میں یہ مکان خریدا تھا اور پریکٹس شروع کی تھی۔ جمشید میلا ساسوتی پردہ اٹھا کر زنان خانے میں گیا۔ اندر پتلے اور لمبے کمرے کے چاروں دروازے دالان میں کھلتے تھے۔ کمرے میں اس کے تینوں چھوٹے بہن بھائیوں کی چارپائیاں بچھی تھیں۔ اس کی اپنی چارپائی کے سرہانے میز لگی تھی جس پر اس کی کتابوں کا انبار تھا جن پر اخباروں اور رسالوں کے کاغذوں کے کور چڑھے ہوئے تھے اور کڑھے ہوئے میز پوش پر سیاہی کا بڑا سا دھبا لگ گیا تھا۔ ایک کونے میں اس کی سائیکل کھڑی تھی۔ اس کی اماں سِل میں مبتلا دالان میں لیٹی تھیں۔ چھوٹی بہن عالیہ باورچی خانے میں تھی ——

جمشید نے اسباب کو ایک چارپائی پر رکھا اور دالان کے تخت پر بیٹھ کر جوتوں کے فیتے کھولنے لگا۔

"بھیا —— ! گاؤں سے روپیا لائے؟" عالیہ کی آواز پر وہ چونکا۔

"روپے؟"

"ابّا نے کہا تھا کہ چچا ابا سے لے کر روپیا بھیجیں گے۔ ان کو گئے اتنے دن ہو گئے۔ چھٹیوں میں تم بھی چلے گئے۔ یہاں سب پڑوسیوں کا قرضہ چڑھ گیا ہے۔"

"نہیں۔ ہم روپے نہیں لائے۔ مگر ابا کو جلد نوکری مل جائے گی شاید، ورنہ ہم کالج چھوڑ کر خود نوکری کر لیں گے ـــــ ارے ارے ـــــ روتی کیوں ہے گڈھیا ـــــ!" اس نے عالیہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اماں نے جو برسوں سے پلنگ پر پڑے پڑے حد سے زیادہ چڑچڑی اور بد مزاج ہو گئی تھیں، حسبِ معمول چیخنا چلانا اور کھانسنا شروع کر دیا۔ جمشید تخت کے کنارے چپ چپ بیٹھا رہا۔

الٰہ آباد سول لائنز کی ایک پرانے طرز کی کوٹھی کی برساتی میں ایک لمبی چوڑی ۳۵ء کے ماڈل کی سیلون کار تیزی سے آن کر رکی اور ایک حساس شکل اور سانولی رنگت والا نوجوان بے حد اکسائیٹڈ انداز میں کار سے اتر کر اپنے کمرے میں گیا۔ جلدی جلدی میز کی درازیں کھولیں۔ کاغذات الٹ پلٹ کر ایک پرس تلاش کیا۔ سرخ رنگ کا ایک چھوٹا سا دہرا کارڈ جیب سے نکالا۔ ایک دفعہ اس کے اندر لکھا ہوا اپنا نام پڑھا اور بڑی احتیاط سے اسے پرس میں رکھ دیا۔

ملازم ڈاک لے کر آیا۔ ماما کی لکھائی لفافے پر دیکھ کر وہ محبت سے مسکرایا اور خط پڑھنا شروع کیا ـــــ

"ہم دورہ ختم ہوتے ہی سیدھے الٰہ آباد آرہے ہیں۔ اب تمھیں آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان کی تیاری کرنا ہے۔ ہماری عدم موجودگی میں نیازی بیگم تمھارے کھانے پینے کا بالکل خیال نہیں رکھتیں۔ اب تم ماشاء اللہ سے ـــــ"

خط ختم کر کے اس نے واپس لفافے میں رکھ دیا اور اداسی سے مسکرایا۔ پھر وہ دریچے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ اور سگریٹ جلا کر سوچنے لگا ـــــ ہم بابا اور ماما کو یہ اطلاع کیسے دیں کہ ہم ان کی ساری درخشاں امیدوں پر پانی پھیرنے والے ہیں۔

محمد گنج کی خانقاہ کی منڈیر پر بیٹھ کر سید مظہر علی نے خطِ شکست میں پوسٹ کارڈ لکھنا شروع کیا ــــــ

برخوردار سعادت آثار راحت جان عزیزی جمشید میاں طولعمرہٗ واضح ہو کہ تمھارے ابا نے متعدد درخواستیں لکھ کر سکتر صاحب کے دفتر بمقام لکھنؤ روانہ کر دی ہیں۔ اللہ بہتری کرے گا۔ دیگر احوال یہ یہ کہ بوٹا بیگم کے مقدمے کی پیشی ملتوی ہوئی ہے۔ کلکٹر صاحب نے بہ کمال مہربانی ان کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا ہے اور دوران مقدمہ بوٹا بیگم مع اپنی لڑکی کے شہر الٰہ آباد میں کلکٹر صاحب کی سرپرستی میں رہیں گی۔ نواب شمس آرا بیگم نے حرف ہائے خلافِ نامعقول اس ضمن میں سب سے کہے ہیں۔ نیز تمھارے ابا کہتے ہیں کہ اپنی سیکل فروخت کر دو ــــــ

چھے مہینے بعد جمشید کو ایک اور پوسٹ کارڈ ملا۔

برخوردار نور چشمی سلمہٗ تعالیٰ۔ یہ معلوم کر کے یک گونہ اطمینان ہوا کہ تم نے ٹیوشن شروع کر دیے ہیں۔ تمھارے ابا کے روزگار کی ہنوز صورت نہیں نکلی۔ اب وہ دن بھر خانقاہ میں بیٹھے رہتے ہیں۔ ہم کو فکر شدید اس امر کی ہے کہ خدانہ خواستہ ان کا خطرہ نہ ٹل جاوے کیونکہ کل شب وہ ہم سے کہتے تھے کہ ان کو بشارتیں ہو رہی ہیں۔ بھائی صاحب قبلہ کو بھی ان کی طرف سے از حد تشویش لاحق ہے۔ اللہ سے دعا کرتے رہو۔ وہ مسبب الاسباب ہے۔

دو سال بعد پوسٹ کارڈ آیا:

ــــــ نور چشمی منظور النسا سلمہا اب اس لائق ہو چکی ہے کہ اسے اس کے گھر بھیج دیا جاوے۔ لہٰذا عید کے چاند اسے رخصت کرا کے لے جاؤ۔ تمھارے ابا اب مستقل ندی کے کنارے کٹی میں رہتے ہیں۔

دو روپے گز والی سرخ ساٹن کے غرارے اور ریشمی ململ کے سرخ دوپٹے قمیض میں ملبوس، گلے میں چاندی کا طوق، ملکہ وکٹوریہ کے روپوں والی "حمیل" اور کانوں میں چاندی کے بالی پتے پہنے، لانبی چوٹی میں گوٹے کا موباف ڈالے، لمبا سا گھونگھٹ کاڑھے منظور النساد لہن بنی برقعے میں لپٹی تانگے سے اتری۔ اس کے جوڑے پر جھوٹا لچکا ٹکا تھا۔ اس نے ہاتھوں میں فیروز آباد کی سرخ ریشمی چوڑیاں اور چاندی کی پہونچیاں پہن رکھی تھیں۔ انگلیوں میں چاندی کے چھلے تھے۔ ہتھیلیوں میں تیز سرخ مہندی رچی تھی۔ بازوؤں پر چاندی کے جوشن بندھے تھے، سرخ ریشمی موزوں اور انگریزی گرگابی والے پیروں میں چھڑے اور چھاگل چھن چھن کر رہے تھے۔ تین موتیوں والی بڑی سی نتھ اس کا واحد طلائی زیور تھا۔ یہ سارے گہنے اس کی ماں کے جہیز کے تھے۔ صرف اس کے سات جوڑے، دولھا کا ریشمی اچکن کا جوڑا اور تانبے کے چار برتن اور مراد آبادی پان دان سید مظہر علی اشرفی لال مہاجن سے ادھار لے کر بنوا سکے تھے۔ تانبے کے باقی سات برتنوں پر جو ان کی بیوی نے منظور النسا کی پیدائش کے وقت سے سینت کر پچھلی کوٹھری میں چن رکھے تھے دوبارہ قلعی کروادی گئی تھی۔ نیم تلے شادی کا کھانا ہوا تھا۔ آلو گوشت کا شوربا، تنوری روٹیاں اور زردہ مٹی کے کونڈوں رکابیوں اور سکوریوں میں نکال کر مہمانوں کے سامنے رکھا گیا تھا۔ تام چینی کی پھول دار رکابیاں صرف دولھا اور مولوی صاحب اور چند اور خاص خاص مہمانوں کے لیے تھیں۔ ہندو احباب کے لیے کچھ فاصلے پر پنڈت کچھمی نارائن نے برگد تلے اپنی نگرانی میں بھوجن بنوایا تھا جو کیلے کے پتوں پر پروسا گیا تھا۔ شہنائی بجی تھی۔ مہمانوں کو محظوظ کرنے کے فرائض چپاتی بھانڈ کے سپرد تھے۔ شادی کے خرچے میں سید مظہر علی کا بال بال قرضے سے بندھ گیا تھا۔ منظور النسا ان کی اکلوتی اولاد تھی اور وہ اس کی صورت دیکھ کر جیتے تھے۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ اشرفی لال کی سود در سود کی پروانہ کرتے ہوئے اپنی لاڈلی بچی کے بیاہ میں دل کے سارے ارمان نکالیں، مگر قدم قدم پر ان کے افلاس کا بھوت سامنے آ کھڑا ہوتا اور وہ جی مسوس کر رہ جاتے۔ جب رخصتی کا وقت قریب آیا تو وہ گھر سے چلے گئے تھے اور درگاہ کی منڈیر پر جا کر چپ چاپ بیٹھ گئے تھے۔ بیٹی کی سرخ

پالکی نیم تلے رکھی گئی تو اسے وداع کرتے ہوئے انھوں نے بھرائی ہوئی آواز میں جمشید سے کہا تھا ــــــ "بھیّا یہ بڑی بے زبان اور غریب بچّی ہے۔ تمھاری کنیز بن کر رہے گی۔ اس کا دل کبھی نہ دکھانا۔"

سرخ رنگ کی سوتی چادر اوڑھے جس پر ابرق کے بڑے بڑے پھول چھپے تھے، منظور النسا پالکی میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ پھر اس کی پالکی اسٹیشن روانہ ہو گئی تھی۔ جھینگا پاسی اور اس کے لڑکوں نے جہیز کے ٹرنک اپنے سروں پر اٹھا رکھے تھے اور سب سے آگے جامہ پہنے، سہرا باندھے، ہاتھ میں سرخ رومال لیے جمشید دولھا بنا گوبندوا کے یکّے پر بیٹھا تھا۔

تانگے سے اتر کر منظور النسا اپنے گھر میں داخل ہوئی۔ شہر کی پروردہ عالیہ نے اسے ناقدانہ نگاہوں سے دیکھا اور ذرا منہ بنا کر آواز دی ــــــ "اماں۔ دلھن بھابی آ گئیں" منظور النسا کو دالان کے برابر والی کوٹھری میں بٹھال دیا گیا جو اس کا حجلۂ عروسی تھا۔ یہاں محلّہ والوں کے سامنے اس کی منہ دکھائی ہوئی جو ایک ایک روپیا، دو دو روپے اس کے سامنے بچھے ہوئے سرخ رومال میں ڈالتی گئیں۔ ایک ہفتے تک وہ دن دن بھر بغیر ہلے جلے پلنگ پر سرنگوں بیٹھی رہی اور جب کوئی محلے والی اس کا گھونگھٹ اٹھاتی تو وہ دستور کے مطابق فوراً آنکھیں بند کر لیتی۔

اس کے بعد منظور النسا نے آنکھیں کھولیں اور اپنے گھر کو دیکھا۔ یہ چھوٹا سا مکان اس کے لیے محل کے برابر تھا۔ اس میں برقی روشنی تھی۔ میز کرسیاں تھیں۔ چینی کے برتن تھے۔ کاغذی پھولوں سے سجے ہوئے نیلی کانچ کے گلدان طاقچوں میں رکھے تھے اور اس کی بجلی بسنت نند عالیہ اسکول میں انگریزی پڑھتی تھی۔

جمشید اب ایم۔ اے۔ میں تھا اور رات گئے تک ٹیوشن کر کے گھر کا خرچ چلاتا تھا۔ اس نے بیٹھک کا کمرہ بھی کرایہ پر اٹھا دیا تھا اور کفایت کے خیال سے سگریٹ پینے چھوڑ دیے تھے۔ بائیس تئیس سال کی عمر میں وہ تلخ مزاج، قنوطی اور ذہنی اور جذباتی طور پر بوڑھا ہو چکا تھا۔

منظور النسا نے گھر کا سارا کام مشین کی طرح سنبھال لیا۔ وہ دونوں وقت کھانا

پکاتی۔ بڑی لگن سے ساس کی تیمارداری کرتی۔ ان کی جھڑکیاں اور طعنے سنتی، دیوروں کی خاطر کرتی اور عالیہ سے مرعوب رہتی۔ جمشید اس سے سیدھے منہ بات نہ کرتا۔ مگر اسے اس کا بھی کوئی غم نہ تھا۔ اس کا فرض اپنے شوہر کی خدمت کرنا تھا اور وہ اپنے شوہر کی پرستش کرتی تھی۔

لیکن جب وہ پہلوٹی کے بچے کی پیدائش کے لیے محمد گنج گئی تو اس کے بعد جمشید نے اسے کان پور واپس نہ بلایا۔ اس نے سید مظہر علی کے تشویش ناک اور بعد میں المناک خطوں کا جواب دینا بھی چھوڑ دیا۔

جنگ شروع ہوئے تین سال گزر چکے تھے۔ وہ ملٹری اسٹورز کے محکمہ میں حوالدار کلرک ہو گیا۔ سال بھر میں اسے ترقی مل گئی اور وہ شہر کا مکان کرایے پر اٹھا کر گھر والوں سمیت چھاؤنی کے ایک کشادہ اور ہوادار کوارٹر میں منتقل ہو گیا۔ اب وہ چار سو روپے ماہوار پاتا تھا اور گھر میں کنٹین کے سامان کی ریل پیل تھی۔ آنکھوں کی کمزوری کی وجہ سے وہ ایمرجنسی کمیشن میں درخواست نہ دے سکتا تھا جس کا اسے بے حد افسوس تھا۔ اسی زمانے میں اس نے سگریٹ کا پورا ڈبہ رات بھر میں پھونک ڈالنے کے بعد منظور النسا کو طلاق لکھ بھیجی تھی۔

جب منظور النسا کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی تو سید اختر علی کو ان کی کٹی سے پکڑ کر منگوایا گیا تھا اور انھوں نے پوتی کے کان میں اذان دی تھی۔ شاہ منور علی نے اَن گِنت دعائیں پڑھ کر بچّی پر پھونکی تھیں۔ محلّے کی عورتوں نے چاول کے کھم بنا کر اور گلگلے تل کے خدائی رات منائی تھی۔ نیم تلے چپاتی بھانڈ نے نقلیں دکھائی تھیں اور گاؤں کی البیلی پاتر حشمت ٹھمکی لگا لگا کر ـــــ "کھسکے ڈیل ـــــ کھسکے ڈیل ـــــ" الاپتی سید مظہر علی کے نزدیک پہنچی تھی جو احباب کے ساتھ کھاٹ پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے اور نواسی کی پیدائش کی خوشی میں انھوں نے بڑے رومال کی گرہ میں سے دو روپے نکال کر اسے دیے تھے۔ اندر صحن میں جھینگا پاسی کی عورت گھونگھٹ کاڑھ کے

اور کمر پر ہاتھ رکھ کے ناچی تھی۔ حیدری ڈومنی اور اس کی بہنوں نے "بچّہ گیریاں" گائی تھیں اور چونکہ منظور النسا بچی کی پیدائش میں مرتے مرتے بچی تھیں اس لیے چند روز بعد شکرانے کے طور پر بی بیؒ کی صحنک بھی کی گئی تھی۔

جب بچی کا عقیقہ ہوا تو نانا نے اس کا نام فرحت النسا بیگم رکھا۔ شاہ منور علی نے اسے گنڈے تعویذوں سے لاد دیا۔ صحن میں ڈھولک رکھی گئی اور منظور النسا "آنکھ کے نشے" کا فالسئی جوڑا پہنے بچی کو گود میں لیے چارپائی پر بیٹھی سہیلیوں کو حسب معمول کان پور شہر کے حیرت ناک قصے سناتی رہی۔ "سڑکوں پر ٹن ٹن کرتی ریلیں چلت ہیں۔ یہ بڑے بڑے کارخانے رات کو آنگن میں سوؤ صبح کو دھواں دھار اٹھو۔ ایک دفعے ہم ان کے ساتھ سنیما بھی گئے رہے۔"

اسی وقت سمھو دادا جو گاؤں کے ڈاکیے بھی تھے رجسٹری خط لے کر آئے۔

سید مظہر علی کی بیوی گم صم بیٹھی پالنے کی ڈوری ہلایا کیں۔ گاؤں بھر کی عورتیں صحن میں جمع ہو گئیں۔ نوزائیدہ بچی جس کے ماتھے پر نظر کا ٹیکہ لگا تھا اور کلائی میں سیاہ ڈوری بندھی تھی، اسی طرح ہنس ہنس کر کلکاریاں مارتی رہی۔ باہر نیم تلے توقیر میاں، گوبر چاچا، لالہ مجلس رائے، شیخ رمضان علی، مولوی محمد حسن، پنڈت کچھی نارائن، گوسائیں کاکا اور گوبندوا سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ شاہ منور علی خانقاہ کے اندر خاموش بیٹھے رہے۔ انھوں نے صرف ایک نعرہ لگایا ــــــ "بڑی لمبی جا اید اد اس نے عطا کی ہے ــــــ شکر ہے ــــــ شکر ہے ــــــ شکر ہے ــــــ!"

سید اختر علی گومتی کے ساحل پر مراقبے میں مصروف رہے۔ ان کو کسی نے یہ اطلاع نہیں دی۔

کئی برس گزر گئے بچی کو اس کی نانی پال رہی تھیں۔ منظور النسا پکا نے رینڈ ھنے کے بعد زیادہ تر خاموش بیٹھی آسمان کو تکا کرتی۔ صبح صبح وضو کے لیے اٹھتی تو کھیرنی کے درخت کے نیچے پٹرے پر بیٹھ کر مناجاتیں پڑھتی :

توئی سروری اور توئی اکبری
مری باری کیوں دیر اتنی کری

کبھی وہ میلاد اکبر کھول کر بیٹھ جاتی اور چپکے چپکے ہونٹ ہلاتی :

جب باغ جہاں کے مالی نے کی دیکھا بھالی پھولوں کی
اک پھول اس میں سے چھانٹ لیا تھی جتنی ڈالی پھولوں کی

گرمیوں کی طویل دوپہروں کے سناٹوں میں، جاڑوں کی رات کے سرد اندھیرے میں، برسات کی بھیگی دوپہروں میں اس کی آواز اس چھوٹے سے مکان میں گونجا کرتی :

تری ذات پاک ہے اے خدا تری شان جل جلالہٗ
ترا نام عادل کبریا، تری شان جل جلالہٗ
جسے چاہے جیسا بنادیا، تری شان جل جلالہٗ

اکثر وہ روٹیاں بیلتے بیلتے، فرحت النسا کی چٹیا کرتے کرتے، دھان پھٹکتے پھٹکتے وہ شعر گنگناتی، جو اس نے مولوی محمد حسن کی بی بی سے سنا تھا :

دو پھول ساتھ پھولے قسمت جدا جدا ہے
اک قبر پہ چڑھا ہے اک سہرے میں گندھا ہے

اس کے دل میں برچھی سی اتر جاتی اور وہ سوچتی۔ ان کے سہرے میں جانے اب کون سا پھول گندھے گا۔ روز وہ اس انتظار میں رہتی کہ اب شہر سے اطلاع آئے گی کہ جمشید نے کسی بی۔ اے پاس لڑکی سے شادی کر لی۔ مگر دن گزرتے گئے اور کچھ نہ ہوا۔ تب وہ یہ آس لگاتی کہ شاید جمشید اس سے رجوع کر لے۔ بیس برس کی عمر میں وہ چالیس سالہ دکھی عورت معلوم ہوتی تھی۔

سلمان مرزا کو بمبئی گئے عرصہ ہو چکا تھا۔ کبھی کبھار وہ الہ آباد آتا اور چند روز بعد پھر غائب ہو جاتا۔ قصر سلمان کے ایک سائڈ روم میں بوٹا بیگم مع اپنی لڑکی بسنتی کے گزشتہ چند برس سے رہ رہی تھیں۔ ان کا کیس چیف کورٹ تک گیا تھا اور وہ مقدمہ

جیت کر نواب شمس آرا بیگم اور نواب بھورے دونوں کو نیچا دکھا چکی تھیں۔ اور دعائیں مانگتی تھیں کہ کسی شریف معمولی حیثیت کے برسر روزگار نوجوان سے بسنتی بیگم کا نکاح ہو جائے۔ قصر سلمان میں ان کی حیثیت ہاؤس کیپر کی تھی۔ وہ جمعرات کے روز مجلس بھی پڑھتی تھیں اور جب چھوٹی بٹیا مسوری کانونٹ سے چھٹیوں میں گھر آتیں تو ان کے ملبوسات کی دیکھ بھال بھی بوٹا بیگم کے ذمے تھی۔ وہ اٹھتے بیٹھتے کلکٹر صاحب کو دعائیں دیا کرتی تھیں۔ کلکٹر صاحب ریٹائر ہو چکے تھے اور اپنے کمرے میں آرام کرسی پر نیم دراز تصوف کی کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ بسنتی بیگم اسکول جاتی تھی اور واپس آکر سائڈ روم میں بیٹھی آبی رنگوں سے تصویریں بناتی رہتی تھی۔

جس روز اسکول کی سالانہ نمائش میں اسے نقد سو روپے آرٹ کا پہلا انعام ملا، بوٹا بیگم سجدے میں گر کر دیر تک رویا کیں۔ مدتوں بعد پہلی مرتبہ ان کے ہاتھ میں سو روپے آئے تھے۔ ان کا چھوٹا موٹا زیور، گاؤں کی تین بیگھا زمین، محمد گنج کا آبائی مکان، سارا اثاثہ مقدمے کی نذر ہو چکا تھا۔ اب میم صاحب ان کو بیس روپے ماہوار تنخواہ دیتی تھیں۔ پان تمباکو کا خرچہ، بسنتی بیگم کے اسکول کی فیس، کتابیں، اس کے کپڑے لتے یہ سب بھی میم صاحب نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ دونوں وقت کا کھانا بوٹا بیگم، بسنتی اور سلمان کی بوڑھی انّا نیازی بوا کے لیے پچھلے برآمدے کے تخت پر چن دیا جاتا تھا۔

عشا کی نماز کے بعد اکثر بوٹا بیگم اپنے جواں مرگ بیٹے کو یاد کر کے تڑپا کرتیں اور آنسوؤں سے ان کی سجدہ گاہ تربتر ہو جاتی۔ محرم کے دنوں میں وہ علموں کی بلائیں لیتیں۔ ضریحوں اور تعزیوں کی دھول آنکھوں سے لگاتیں اور جنابِ علی اصغر کے گہوارے اور ذوالجناح کے سامنے کھڑے ہو کر بلک بلک کر دعائیں مانگتی: ''یا مولا ـــــ یا مشکل کشا ـــــ یا سید الشہدا ـــــ یا امام مظلوم بسنتی کا نصیبہ کھول دیجیے۔ بسنتی کو عزت و آبرو کے ساتھ کہیں ٹھکانے لگا دیجیے۔''

اس وقت سو روپے کا نوٹ بسنتی نے ان کو لا کر دیا تو انھیں پھریری سی چڑھی۔ یہ کثیر رقم ان کی دکھیاری بٹی کی صلاحیت اور محنت کا صلہ تھا ـــــ ''یاالٰہی اس کا مقدر اچھا کرنا ـــــ !''

آنند موہن گھوش، اسکول کی ہیڈ مسٹریس کا چھوٹا بھائی تھا۔ نمائش میں بسنتی بیگم کی تصاویر دیکھنے کے بعد اس نے ایل۔ ایم سین کو لکھا ــــــ "اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ میں نے ایک تقریباً جینیس کو ڈسکور کیا ہے تو آپ کو یقین نہ آئے گا۔"

اگلی مرتبہ لکھنؤ آرٹ اسکول کے پرنسپل ایل۔ ایم سین جب الٰہ آباد آئے تو مس ریبا گھوش نے اپنی ہونہار طالب علم کو ان سے ملوایا۔

آئندہ سال میٹرک کے بعد بسنتی بیگم سرکاری وظیفے پر لکھنؤ آرٹ اسکول میں داخل ہو گئی۔ ابھی وہ تھرڈ ایر میں تھی کہ بوٹا بیگم سخت بیمار پڑیں اور اسے الٰہ آباد واپس آنا پڑا یہاں وہ کالج میں داخل ہو گئی اور اس نے اپنے آپ کو بسنتی بیگم کہلوانا ترک کیا، کیوں کہ یہ نام اس کے شدید دکھی بچپن کی یادگار تھا۔ الیف۔ اے کے بعد وہ اپنے پرانے اسکول میں ڈرائنگ ٹیچر ہو گئی۔ اس نے بوٹا بیگم سے کہا ــــــ

"میں تیرہ برس کی عمر سے دھکے کھا رہی ہوں۔ سات سال سے ہم لوگ اس محل میں رہ رہے ہیں۔ مجھے مفت کے ٹکڑے توڑتے اب شرم آتی ہے۔ مجھے سوا سو ماہوار کی نوکری مل گئی ہے۔ شام کے وقت میں ٹیوشن بھی کروں گی اور شہر میں مکان لے کر رہوں گی۔ سامان باندھ لیجیے ــــــ!"

"ــــــ اکیلی بٹیا کیسے رہیو ــــــ؟" بوٹا بیگم نے بھونچکی ہو کر پوچھا۔

"اماں ــــــ!" اس نے اکتا کر بحث قطعی طور پر ختم کرتے ہوئے جواب دیا۔ "میں وہ بسنتی بیگم نہیں ہوں جسے نواب بھورے کے سپاہی اٹھا کر لے گئے تھے۔ اور دوسری بات یہ کہ میں اکیلی نہیں ہوں۔ ملک کے سارے عوام، سارا محنت کش طبقہ میرے ساتھ ہے۔" اس نے آنند موہن گھوش کے الفاظ دہرائے جس نے اس سے بے حد جوشیلے انداز میں کہا تھا۔

"سُوریہ ــــــ دیش کی ساری جنتا، سارا ورکنگ کلاس تمھارے ساتھ ہے۔" بوٹا بیگم کے پلے کچھ نہ پڑا کہ یہ نئی، حیرت انگیز بسنتی کیا کہہ رہی ہے۔ انھوں نے جا کر میم صاحب سے کہا ــــــ

"میں سمجھتی ہوں۔" میم صاحب نے آہستہ سے جوب دیا ــــــ "میرا بیٹا

اسی طرح گھر کا عیش آرام چھوڑ کر گلیوں کی خاک چھاننے نکل گیا۔ یہ آج کل کی اولاد ہے ان کو سمجھانا لاحاصل ہے۔ یہ ہمیشہ اپنی من مانی کریں گے ـــــ جمعرات کی جمعرات تو آتی رہیے گا نا ـــــ ؟ میں موٹر بھیج دیا کروں گی۔"

بوٹا بیگم رونے لگیں۔

سلمان ایک روز الٰہ آباد آیا تو آنند موہن گھوش نے اس سے ثریا حسین کا ذکر کیا جو صحیح معنوں میں عوامی فن کار بن سکتی تھی، کیونکہ خود ایک کسان گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ شام کو آنند موہن گھوش سلمان کو پرانے کٹڑے کے ایک چھوٹے سے مکان پر لے گیا اور دروازے پر دستک دی۔ بوٹا بیگم نے اندر سے جھانکا۔ "مس حسین ہیں؟" ـــــ آنند موہن گھوش نے پوچھا۔

"کو ـــــ ؟"

"مس حسین ـــــ "

بوٹا بیگم کی سمجھ میں نہ آیا ـــــ "بنتی ـــــ " انھوں نے آواز دی۔ وہ دروازے پر آئی۔

"ارے بنتی بیگم!" ـــــ سلمان نے حیرت اور مسرت سے کہا۔ "تم اتنی پُراسرار بن گئیں! میں یہاں مس حسین کے رعب میں کھڑا تھر تھر کانپ رہا ہوں!!"

ثریا نے خوش دلی سے قہقہہ لگایا ـــــ "آیئے، آیئے، اندر آجایئے۔" بوٹا بیگم سر پر دوپٹا رکھ کر جلدی سے اندر دبک گئیں۔ ثریا دونوں لڑکوں کو ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئی جو اس کا اسٹوڈیو بھی تھا۔ سلمان نے چاروں طرف دیکھا۔ "حد ہے ـــــ !کمال ہو گیا ـــــ !!" اس نے قصر سلمان میں ثریا کو آتو جی کی لڑکی بنتی کی حیثیت سے دیکھا تھا، جو اس سے کانا پر دا کرتی تھی اور عموماً ادھر ادھر دبکی رہتی تھی۔ اس وقت وہ ہونہار آرٹسٹ ثریا حسین کے نگار خانے میں کھڑا تھا۔ اس وقت اس

نے ثریا کو پہلی مرتبہ غور سے اور توجہ سے دیکھا اور اسے تعجب ہوا کہ وہ اب تک کہاں چھپی ہوئی تھی۔

سلمان اب پھر الٰہ آباد بھیج دیا گیا تھا۔ وہ ثریا کو اپنے ساتھ جلسوں، تقریبوں اور سیاسی اور ادبی محفلوں میں لے جانے لگا اور وہ اس کے دوستوں کے حلقے میں شامل ہو گئی۔

ثریا اس طبقے سے آئی تھی جو ان نوجوانوں کے لیے مشعلِ راہ تھا۔ وہ خود اس بھیانک طریقے سے فیوڈل نظام کا شکار رہ چکی تھی۔ وہ سب اس سے درگا کنڈ کی گڑھی کے واقعات سنتے جہاں اسے چھ مہینے تک قید رکھا گیا تھا۔ وہ اس قیامت خیز رات کا ذکر کرتی جب ڈھاٹے باندھے ہوئے بدمعاشوں نے اس کے اکلوتے بھائی کو گنڈاسوں سے ہلاک کیا تھا۔ وہ اپنے اندھے اور عسرت زدہ باپ کو یاد کرتی جو ایسی درد بھری آواز میں مرثیے اور سوز پڑھتے تھے کہ سننے والوں کا کلیجہ دہل جاتا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے لیے ہیروئن اور سلمان کے لیے اس کا آدرش بن گئی۔ اسی زمانے میں اس نے پرائیویٹ طور پر بی۔ اے بھی کر لیا۔

چھوٹی بٹیا اب کراسویٹ کالج میں تھی۔ بوٹا بیگم ہر جمعرات کو قصر سلمان جا کر مجلسیں پڑھتیں مگر ثریا ان کے ساتھ بہت کم جاتی تھی۔ اس کی اور سلمان کی دوستی کے متعلق خیال کر کے بوٹا بیگم کا دل ہلا جاتا تھا ـــــ "صاحب میم صاحب مجھے کتنا نمک حرام سمجھیں گے" ـــــ وہ لرز لرز کر سوچتیں۔ ثریا سے کچھ کہنے کی ان کو ہمت نہ پڑتی تھی مگر قصر سلمان سے وہ جھینپی جھینپی آتیں۔ میم صاحب نے اس سلسلے میں کبھی کوئی ذکر ان سے نہ چھیڑا۔

۴۷ء کے اپریل میں چھوٹی بٹیا نے ایف۔ اے کا امتحان دیا اور اسی مہینے والدین کے ہمراہ حسب معمول مسوری چلی گئیں۔ سلمان الٰہ آباد ہی میں تھا جب تقسیم ہند کا اعلان کیا گیا۔

جنگ کے بعد وہ محکمہ ٹوٹ گیا جس میں جمشید ملازم تھا۔ وہ عمر بڑھ جانے کی وجہ سے آئی۔ سی۔ ایس اور پی۔ سی۔ ایس کے امتحانوں میں نہ بیٹھ سکتا تھا۔ تقسیم کے فوراً بعد وہ قسمت آزمانے کراچی روانہ ہو گیا۔

دن بھر جھڑی لگی رہی تھی۔ برساتی کا کالر اونچا کیے تیز تیز قدم رکھتا سلمان مرزا ثریا کے گھر پہنچا۔ شام ہو چکی تھی۔ گلی میں مینڈک ٹرا رہے تھے۔ پڑوس میں ریڈیو بج رہا تھا اور پنجاب اور دہلی سے نکلنے والے پناہ گزینوں اور شرنارتھیوں کے پتے ان کے عزیزوں کو سنائے جا رہے تھے۔ فضا پر عجیب سی نحوست اور ویرانی طاری تھی۔ سلمان کے قدموں کی آہٹ پر ثریا نے سلاخوں والی کھڑکی میں سے جھانکا۔ وہ اندر آ گیا۔ ثریا نے اس کے لیے کرسی کھڑکی کے نزدیک کھینچ دی ـــــ ایک دم حبس ہو گیا ہے" ـــــ "اس نے خالی خالی آواز میں کہا۔

سلمان نے کرسی پر ٹک کر گھڑی پر نظر ڈالی اور سگریٹ جلایا۔

"وقت بہت کم ہے ـــــ "اس نے متوازن آواز میں کہا ـــــ "اور ہمیں معلوم ہے کہ کسی کرائسس میں تمھارے قدم کبھی نہ لڑکھڑائیں گے۔ تم ہمیشہ ہمارا ساتھ دو گی ـــــ ٹھیک ہے نا ثریا ـــــ ؟" دفعتاً اس کی آواز میں بچّوں کا سا لہجہ عود کر آیا۔ چھوٹی بٹیا کا سا لہجہ ـــــ !

"تقریر مت جھاڑو ـــــ !" ثریا نے اکتاہٹ کے ساتھ جواب دیا ـــــ "میں اتنے برسوں سے متواتر تمھاری تقریریں سن رہی ہوں کرائسس ـــــ آدرش ـــــ اصول ـــــ اقتدار ـــــ !"

"تم بھی ہمیں مایوس کر رہی ہو لڑکی ـــــ ؟ ہمیں مایوس نہ کرنا ـــــ " سلمان نے بھونچکا ہو کر بڑے کرب سے کہا۔

"مایوس! تم انسانوں کی طرف سے اب تک خوش فہمی میں مبتلا ہو ___ !"

گلی میں ریڈیو کی آواز گونجی ___ "شری نواب چند کھنہ کا خاندان ڈیکوٹا کے ذریعے پشاور سے امرت سر پہنچ رہا ہے ___ جناب فضل دین وکیل کا خاندان خیریت کے ساتھ ہوشیار پور سے لاہور پہنچ چکا ہے ___ چودھری ٹیکا رام اور ان کے خاندان کے لیے ایک ڈیکوٹا جہلم بھیجا جارہا ہے ___ ایک بار پھر سن لیجیے ___ !"

ثریا نے کھڑکی بند کر دی۔

"ثریا ___ !" سلمان نے اسی کرب کے ساتھ کہا ___ "تم تجریدی تصویریں بناتے بناتے حقیقت سے بالکل کٹ گئیں ___ "

"ایک اور مفروضہ! اور سلمان مرزا۔ میں تم سے آرٹ پر بحث کرنا نہیں چاہتی۔ یہ تمھارا میدان نہیں ___ !"

ہوا کے جھونکے سے کھڑکی کے پٹ زور سے کھل گئے۔

"میں یہاں بیٹھ کر روز شام کو خبریں سنتی ہوں مگر تمھارے گھر والوں کی خیریت اب تک نہیں سنی ___ "اس کی آواز میں خفیف سی بے رحمی تھی۔

"ایک بار سن لیجیے: ___ جناب قمرالدین مرزا۔ بیگم مرزا اور مس مرزا ___ "

سلمان نے سانس روک لیا اور اس کا رنگ سفید پڑ گیا۔

" ___ اتوار کے روز فوجی کونوائے کے ساتھ مسوری سے لاہور روانہ ہو گئے۔ ڈاکٹر ہری رام ملہوترہ، سردار خوش حال سنگھ اور لالہ گلاب چند ___ "

کچھ دیر کمرے میں مکمل سکوت طاری رہا۔ سلمان اسی طرح ساکت و سامت بیٹھا تھا۔ ثریا نے فکرمندی سے اسے دیکھا۔ اسے اپنے کمینے پن پر پشیمانی ہوئی۔ وہ جلدی سے اس کے لیے چائے بنا کر لے آئی۔

"ماما کا خط چند روز ہوئے آیا تھا" ___ سلمان نے چائے میں شکر گھولتے ہوئے آہستہ سے کہا ___ "جس دن ان کی مسوری کی کوٹھی جلائی گئی اس کے اگلے روز انھوں نے لکھا تھا۔ وہ چھوٹی بٹیا کی وجہ سے بے حد پریشان تھیں۔ اب تک سیکڑوں نوجوان لڑکیوں کو اغوا کیا جا چکا ہے۔"

"گھبراؤمت ــــ!" ثریا نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا ــــ "وہ لوگ خیریت سے پہنچ جائیں گے۔"

کمرے کی بجلی فیل ہو گئی۔

"ہمیں ایک سگریٹ جلادو۔"

ثریا نے فرش پر ٹٹول کر سگریٹ اور ماچس تلاش کی اور اس کے ہاتھ میں دے دی۔ سلمان نے سگریٹ جلایا۔ ثریا مونڈھے پر چپ چاپ بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد سلمان نے آہستہ آہستہ کہا ــــ "بابا بہار کے ایک قحط زدہ گاؤں میں ایک خانقاہ کے سایے میں فقر و فاقے سے مانوس صوفیوں کے ایک گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ پی۔ سی۔ ایس میں نامزد ہوئے اور بااقتدار متوسط طبقے میں شامل ہو گئے۔ مگر ذہنی لحاظ سے وہ ہمیشہ فقیر رہے ــــ مجھے ماما اور چھوٹی بٹیا کی فکر ہے۔ انھیں بڑے شدید جذباتی صدموں کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

"تمھاری مسوری والی کوٹھی جلادی گئی ــــ؟" ثریا نے پوچھا۔

"ہاں ــــ!" اندھیرے میں سلمان کی آواز آئی ــــ "جس نظام نے اس مذہبی عصبیت کو جنم دیا اسی نظام کے ہاتھوں اس سماج کے محل جلادیے گئے۔ مگر ثریا محض اسی وجہ سے آج ان بنیادی تضادوں کو مزید تقویت حاصل ہوئی ہے۔ ماضی کی محل سرائیں جل کر راکھ ہو ئیں۔ مگر ابھی اس ملبے کی بنیادوں پر دونوں ملکوں میں نئی بورژوازی کے نئے محل کھڑے ہوں گے ــــ کل کے جاگیردار کی جگہ آج کا سرمایہ دار حاصل کرلے گا۔ ہماری اصل جدوجہد کا آغاز آج سے ہو رہا ہے ــــ!"

اس نے ماچس جلا کر گھڑی دیکھی اور دفعتاً اٹھ کھڑا ہوا ــــ "ثریا مجھے سرحد پار بھیجا جارہا ہے ــــ میرا ساتھ دوگی؟"

وہ خاموش رہی۔

"میرے ساتھ تمھیں زندگی بھر تکلیفیں اٹھانا پڑیں گی اور خدا جانتا ہے تم زندگی میں تھوڑے سے آرام، تھوڑی سی آسائش کی مستحق ہو، مگر میرے ساتھ تم کو دل کا چین ملے گا اور ذہنی سکون ــــ اور میری اتھاہ محبت ــــ!"

"تم وہاں جا کر جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرو گے۔ میں کہاں رہوں گی؟"

"تم سپاہی آدمی ہو ثریا! جنگ جاری ہے۔ صرف محاذ بدل جائیں گے۔"

وہ خاموش رہی۔

"ثریا ___ !"

وہ خاموش رہی۔

وہ دیوار سے ٹک گیا ___ "ثریا ___ !" اس نے آخری بار کہا۔

وہ پھر بھی چپ رہی۔

کسی نے مقابل کے مکان میں لالٹین جلائی۔ اس کی مدھم سے روشنی کھڑکی میں سے آ کر کمرے میں پڑنے لگی۔ سلمان نے ثریا پر نظر ڈالی اور یک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ گویا آخری بار اس کی تصویر اپنے دل میں محفوظ کر لینا چاہتا ہو۔ وہ سیدھا کھڑا ہو گیا اور اس نے بڑی نارمل آواز میں کہا ___ "اچھا بھئی ثریا ___ ! اب ہم جاتے ہیں۔ صبح سویرے سفر پر روانہ ہونا ہے ___ ع زندگی منتظر ہے منہ پھاڑے، وغیرہ وغیرہ۔" اس نے ذرا ہنس کر اضافہ کیا ___ "خدا حافظ" اس نے ہاتھ آگے بڑھایا ___

COME ON, SHAKE HAND LIKE A MAN

وہ اسی طرح چپ چاپ بیٹھی رہی۔

پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور دفعتاً اس سے لپٹ گئی۔

"سلمان ___ سلمان ___ سلمان ___ !" اس نے سلمان کے شانوں سے اپنا چہرہ رگڑتے ہوئے کہا ___ "میں وقتی طور پر قنوطی اور بزدل ہو گئی تھی۔ میں تمھارے ساتھ ہوں۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمھاری ساتھی ہوں۔ مجھ پر بھروسہ رکھو۔ میں تمھیں کبھی مایوس نہ کروں گی ___ میں تمھیں کبھی دھوکا نہیں دے سکتی ___ !"

سلمان نے اسے اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے کر اس کے گھنگھریالے

بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ پھر اس نے بہت آہستہ سے پوچھا۔

"وعدہ ــــــ ؟"

"وعدہ ــــــ "ثریا نے آنسوؤں سے بھری آواز میں دہرایا۔

"ملاؤ ہاتھ ــــــ !"سلمان نے کہا۔

But not like a man ثریا نے بیک وقت روتے اور ہنستے ہوئے جواب دیا۔ اس کے دل میں مادرانہ شفقت کا سیلاب امنڈ آیا جو ہر لڑکی اپنے محبوب کے لیے محسوس کرتی ہے۔

"صلح ــــــ ؟"سلمان نے دوبارہ پوچھا۔

"صلح ــــــ ! سلمان۔ کریک داس! کیا میرے وقتی ڈپریشن سے تم اتنا ڈر گئے؟ تمھیں معلوم ہے میں کتنی موڈی ہوں؟"

"کیا کہنے ہیں آپ کے! اپکاسو کی خالہ نہیں تو ــــــ !! ــــــ اچھا یہ بتاؤ کہ کب تک آسکو گی ــــــ ؟"

"جیسے ہی اسکول نے استعفا منظور کیا۔ مجھے اپنی خیریت کی اطلاع پہنچتے ہی بھجوا دینا سلمان!"

وہ دروازے میں جا کر چند لمحوں تک نیم تاریک کمرے میں کھڑی اس تنہا باہمت لڑکی کو دیکھتا رہا اور جلدی سے گلی میں اتر گیا۔

گلی کے موڑ پر پہنچ کر وہ ٹھٹھکا اور آخری مرتبہ اس چھوٹے سے مکان پر نظر ڈالی جسے اتنے برسوں تک اس نے اپنی جدوجہد کا سمبل اور اپنی آرزوؤں کا مرکز بنا رکھا تھا ــــــ یہاں کتنی شامیں اس نے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر جدلیاتی، مادیت اور انقلاب پر بحث کرتے گزاری تھیں۔ ثریا کو اپنی پسندیدہ کتابیں لا کر دیں۔ ٹالسٹائی۔ گورکی۔ رومن رولاں۔ جواہر لال نہرو۔ کرسٹفر کاڈویل۔ ہاورڈ فاسٹ (جن میں سے بیش تر کتابیں ثریا نے ابتدائی صفحوں سے آگے نہیں پڑھیں) اس نے ثریا کو اہم مضامین اور اسپین کی خانہ جنگی کے واقعات پڑھ کر سنائے تھے۔ وہ پڑھتا جاتا تھا اور وہ ایزل کے سامنے کھڑی تصویریں بناتی رہتی۔ بعض مرتبہ وہ جھنجھلا کر کہتا :

"ثریا ـــــ ثریا ـــــ تم تو بالکل اسپ جہالت پر سوار ہو۔ سنو لینن کا نظریہ آرٹ کے متعلق کیا ہے ـــــ ؟"

"ثریا ـــــ !احمق نہ بنو۔ بالزاک پڑھا کرو ـــــ "

"ثریا ـــــ اب کی ٹرم یونی ورسٹی جوائن کر لو ـــــ !"

"ساری دنیا میری یونیورسٹی ہے!" وہ آنکھیں گھما کر بڑے ڈرامائی طریقے سے گورکی کا جملہ دہراتی۔ پھر وہ دونوں خوب ہنستے۔ ایک رات اس نے ثریا کو جیولیس فیوچک پڑھ کر سنایا تھا اور کتاب ختم کرنے کے بعد رونے لگا تھا۔

مکمل ذہنی رفاقت، مکمل جذباتی ہم آہنگی ـــــ کس قدر خوب صورت اور مکمل ترین دوستی ان دونوں کی تھی ـــــ ثریا حسین اور سلمان مرزا ـــــ ساتھیوں کے حلقے میں کتنے احترام سے ان کا نام لیا جاتا تھا۔ اس نرم و نازک، ذہین، دلکش، بہادر کسان لڑکی میں سلمان کو اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی تھی۔ مستقبل کی عورت، آنے والے سماج کی ہیروئن جو محبوبہ، بہن، بیوی اور ماں، عورت کے ہر روپ میں مکمل ثابت ہو سکتی تھی۔ اسے کسی خاندانی جاہ و جلال کے چھننے، کسی محل سرا کے جلنے کا غیر شعوری تاسف بھی نہ ہو سکتا تھا، کیونکہ وہ اس طبقے کی ایک فرد تھی جسے اپنی زنجیروں کے سوا اور کچھ نہیں کھونا۔

اس کے پاس ریشمی ساری ایک نہ تھی۔ زیورات کے نام سے نا آشنا تھی۔ پاؤڈر، لپ اسٹک سے اسے کراہت محسوس ہوتی تھی۔ فیشن ایبل سوسائٹی کے ڈنر پارٹیوں کا تذکرہ اس کے لیے وحشت خیز تھا۔ وہ چھوٹی بٹیا کو خاص قابلِ رحم ہستی سمجھتی اور ہمدردی کے ساتھ اکثر سوچا کرتی ـــــ یااللہ ـــــ یہ بے چاری اپنی ساری زندگی موٹر میں سوار ہو کر ایک پارٹی سے دوسری پارٹی میں جاتے اور سوئمنگ اور رولر اسکیٹنگ کرتے گزار دیں گی۔

سلمان اکثر اپنی بہن سے کہتا ـــــ "بٹیا چلو آج تمھیں ثریا کے یہاں لے چلیں۔ ڈھنگ کی چار باتیں ذرا تمھارے کان میں پڑیں گی ـــــ !"

"ہرگز نہیں ـــــ !" چھوٹی بٹیا جواب دیتیں ـــــ "ایک بات تو یہ کہ

آج ہمارے کالج میں فینسی ڈریس ہے۔ دوسرے یہ کہ ثریاباجی اس قدر بلندی سے ہم سے بات کرتی ہیں کہ ہمیں رونا آجاتا ہے ـــــ قسم سے!"

"ثریا کو تم سمجھنا ہی نہیں چاہتیں اور تم بھی کیا کرو۔ اپنے طبقے کی نمائندہ لڑکی ہو!" وہ ہنس کر کہتا۔

اسی سال ثریا کی تصویریں آل انڈیا نمائش میں دہلی بھیجی گئیں۔ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے زیرِ اہتمام اس کا "ون مین شو" الٰہ آباد میں منعقد ہوا۔ اور ایم ایل سین نے لکھنؤ سے آکر اس کا افتتاح کیا۔ بڑے بڑے ادیب اور دانشور اس خستہ حال مکان میں اس سے ملنے آتے جس کا سارا فرنیچر چند مونڈھوں اور دو تین کرسیوں پر مشتمل تھا۔

سلمان کو اس ثریا پر کتنا فخر تھا۔ یہ اس کا جی ہی جانتا تھا۔ آج وہ اس ثریا کو ایک انجانی مدت کے لیے تنہا چھوڑ کر بہت دور جارہا تھا۔

ثریا کے کمرے کی کھڑکی بند ہو گئی۔ اس نے دوسرا سگریٹ جلایا اور تیز تیز قدم رکھتا گھپ اندھیری رات میں گلی کے باہر نکل گیا۔

نئے ملک میں پہنچ کر سلمان سال بھر تک روپوش رہا۔ اسے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کے گھر والے کہاں ہیں۔ ممکن ہے وہ لوگ بیاس عبور کرتے وقت ہی مار ڈالے گئے ہوں لیکن ایک رات اسے اطلاع ملی کہ اس کے والدین اور چھوٹی بہن لاڑکانہ میں مقیم ہیں۔ اپنے لیے حالات سازگار ہوتے ہی وہ لاڑکانہ پہنچا۔ پُر شور گرد آلود بازار سے گزرتا سندھی عاملوں کے ان سارے مکانوں پر نظر ڈالتا، جن میں اب یو۔ پی کے مہاجر آباد تھے، وہ بالآخر اس پتے پر پہنچ گیا جو اسے اطلاع میں بتلایا گیا تھا۔

یہ کسی ہندو بنیے کا مکان تھا۔ دروازے پر ہنومان جی، لکشمی اور گنیش کی مورتیاں نصب تھیں، سیڑھیوں پر رنگ برنگے نقش و نگار بنے تھے۔ اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے اندر جھانکا۔ ماما صحن میں انگیٹھی رکھے کھانا پکانے میں مصروف تھیں۔ بابا پلنگ پر لیٹے کچھ پڑھ رہے تھے۔

وہ دبے پاؤں اندر آ گیا۔

"بھیا ــــــ !" بابا نے دیوانِ حافظ ایک طرف رکھ کر تکیے کے سہارے بیٹھتے ہوئے کہا ــــــ "ہم تمھارے استقبال کے لیے اٹھ نہیں سکتے، کیونکہ ہمارے پاؤں مفلوج ہو گئے ہیں۔"

"بھیا ــــــ !" کچھ دیر بعد ماما نے اس کے آگے کھانے چنتے ہوئے کہا۔ "اگر ممکن ہو تو کراچی میں مکان لے کر ہم لوگوں کو وہاں بلا لو۔ یہاں ان کے علاج کی بڑی دقت ہے۔ دنیا بھر کی بیماریوں نے انھیں آن گھیرا ہے ــــــ "

"پروونشل سروس والوں کی پنشن کے کاغذات ابھی سرکاری دفتروں میں اٹکے پڑے ہیں۔ قصرِ سلمان متروکہ جایداد قرار دے دیا گیا۔ الٰہ آباد بنک نے اطلاع دی ہے کہ اکاؤنٹس انھوں نے منجمد کر لیے ہیں تاوقتیکہ دونوں ملکوں میں مووایبل پراپرٹی کے سلسلے میں کوئی معاہدہ نہیں ہو جاتا۔ تمھاری ماما کی زمینیں زمینداری کے خاتمے کے ساتھ چلی گئیں وغیرہ وغیرہ۔" بابا نے بڑے اطمینان سے بتایا ــــــ انھوں نے اضافہ کیا۔

نہ عیش، نہ دکھ درد، نہ آرام رہے گا
آخر وہی اللہ اک کا نام رہے گا

چھوٹی بٹیا اسکول پڑھا کر لوٹیں۔ انھوں نے سلمان کو ہکا بکا ہو کر دیکھا۔ وہ بہت دبلا اور کالا ہو گیا تھا۔ چھوٹی بٹیا کی رنگت بھی صحرا کی دھوپ میں کمھلا چکی تھی۔ دونوں بھائی بہن ایک دوسرے سے لپٹ کر بچّوں کی طرح رونے لگے۔

دوسرے روز چھوٹی بٹیا نے بھی سلمان سے کہا۔

"بھیا ــــــ !اگر ہو سکے تو ہمیں کراچی لے چلو۔ ہماری پڑھائی کا دوسرا سال برباد جا رہا ہے۔"

"کوئی جگہ وہاں سنا ہے الٰہی بخش کولونی کہلاتی ہے۔ وہاں کوارٹروں کے کرائے سستے ہیں۔ وہیں انتظام کر لو۔ ہم سے پیسے لیتے جاؤ۔" ماما نے کہا۔

"پیسے ہیں ــــــ ؟" سلمان نے دریافت کیا۔

"مسوری سے نکلتے وقت جو گہنے ساتھ تھے وہی اب تک فروخت ہو رہے ہیں۔ چھوٹی بٹیا گریجویٹ نہیں ہیں اس لیے ان کی تنخواہ بہت کم ہے ـــــ" ماما نے جواب دیا۔

"بٹیا کو بی۔اے۔بی۔ٹی کر لینا چاہیے۔" بابا نے کہا۔

"بھیا جاتے ہی مکان ڈھونڈنا۔" ماما نے کہا۔

"جی اچھا۔"

"چائے پی لو۔"

"جی اچھا۔"

"کراچی میں اپنے کھانے پینے کا خیال رکھو۔"

"جی اچھا۔"

وہ مدتوں سے اس طرح کی اوائی توائی اور خطرناک زندگی گزار رہا تھا۔ میم صاحب بظاہر اس کی عادی ہو چکی تھیں مگر دل میں بری طرح کڑھا کرتیں۔ ان کے چاند سے بیٹے نے برسوں سے کیسی بھگل گانٹھ رکھی تھی، یہ دیکھ کر ان کا دل خون ہو جاتا۔ ان کے کیسے کیسے ارمان خاک میں مل گئے۔ وطن میں تھیں تو سارے ہم چشم دُر دُر پھٹ پھٹ کرتے۔ خاندان کی بیبیاں الاہنا دیتیں ـــــ "انجمن آرا کا اکلوتا پوت ـــــ آوارہ نکل گیا۔ روز دوڑ آتی ہے۔ تین بار چھ چھ مہینے کی کاٹ چکا ہے۔ ایسے لڑکے کو کون اپنی بٹیا دے گا؟"

وہ خود ثریا سے بیاہ کرنا چاہتا تھا۔ بے چاری بوٹا بیگم خود تو اللہ کا جی تھیں۔ لڑکی بڑی ہو کر ایسی بے تکی نکلی ـــــ بھیا کو تو ایسی لڑکی چاہیے جو انٹلکچوئیل، سوشلسٹ، آرٹسٹ، وارنٹ کچھ نہ ہو بلکہ ان کے آرام اور کھانے پینے کا خیال رکھے۔ میم صاحب نے ایک دفعہ اظہارِ خیال کیا تھا۔

"خیر ثریا باجی ایسی لمبی چوڑی انٹلکچوئیل بھی نہیں ہیں ـــــ" چھوٹی بٹیا نے ذرا جل کر جواب دیا تھا۔

"بے چاری ثریا کے متعلق تم یہ خالص نندوں والی جلی کٹی باتیں نہ کرو گی تو

اور کون کرے گا ـــــ "سلمان نے قہقہہ لگا کر کہا تھا۔

"ثریا باجی آ گئیں ـــــ ؟" چھوٹی بٹیا نے بیٹھے بیٹھے دفعتاً سوال کیا۔

"معلوم نہیں ـــــ "سلمان نے جواب دیا۔ پھر گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا "ہم دوپہر کی ٹرین پکڑ لیں تو اچھا ہے۔ پرسوں صبح ایک اخبار کی ملازمت کا انٹرویو ہے۔ اتنی مایوس نہ ہو بٹیا۔ حالات اتنے خراب نہیں ہیں" ـــــ اس نے بہن کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور ماں باپ سے رخصت ہوا۔

باہر جھکڑ چل رہا تھا۔ زرد رنگ کی جلتی جلتی ریت آنکھوں میں گھسی جاتی تھی۔ تارکِ وطن ہندوؤں کے رنگ برنگے ٹائیلوں والے مکانوں کی چھت پر بادگیر کے جنگل کھڑے تھے، اور گرم ہوا بادگیر کے سوراخوں میں منڈلا منڈلا کر سیٹیاں بجا رہی تھی۔ گلیوں میں مہاجر چل پھر رہے تھے۔ روزانہ کھوکھراپار عبور کر کے راجستھان، دلی اور یو۔پی کا ایک نیا پریشان حال قافلہ ان محلّوں میں چھاؤنی چھاتا۔ کیسی کیسی مصیبتیں اٹھا کر لوگ ہندوستان سے نکلے تھے اور یہاں ان کو کیسی کیسی مصیبتیں اٹھانا تھیں ـــــ سلمان نے اسٹیشن کے راستے پر چلنا شروع کیا۔ سرخ رنگ کی عبائیں پہنے سندھی عورتیں خچروں پر بیٹھی سامنے سے گزر گئیں۔ چائے خانوں میں ثریا اور شمشاد بیگم کے ریکارڈ چیخ رہے تھے۔ ایک غلیظ سے ریستوراں کے آگے جس پر "کیفے ڈی پیرس" کا بورڈ لگا تھا، رام پور کے چند مہاجر ٹین کی کرسیوں پر بیٹھے زور زور سے باتیں کرنے میں منہمک تھے۔

"ابے چنّن خاں۔ میں نے کہا ــــ اکیلے اکیلے مکان الاٹ کرالیا ــــ یاروں کو ہوا بھی نہ لگنے دی۔ میاں اگر تم نے اُڑائی ہیں تو ہم نے بھون بھون کر کھائی ہیں۔ ہمیں بتا بتاتے ہو ـــــ چھمّن میاں سے نہ کہہ دیا ہو تو ـــــ "

"ایں جاؤ یار ـــــ ! یہاں ریاضت حسین خاں بھی کسی سے ہٹے نئیں ہیں۔ اپنی بات کروا لینی ـــــ !"

"کھال میں رہو کھال میں ـــــ میں نے کیا ـــــ "

وہ آگے بڑھتا گیا۔ بازار میں چوطرفہ غل مچا تھا۔ بھانت بھانت کی بولیاں،

رنگارنگ لہجے، رنگ برنگ لباس، خوانچے والوں کی صدائیں۔ ہر شخص نئی سرزمین پر زندہ رہنے کے لیے ازسرِنو زندگی شروع کرنے کے لیے بری طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ سلمان نے سامنے کے منظر کو دیکھا اور سر اٹھا کر تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔

اسٹیشن پر بھی مہاجروں کی ریل پیل تھی۔ سلمان ان کو دیکھ کر سوچا کیا۔ یہ جانے کون کون لوگ ہوں گے۔ کہاں کہاں سے آئے ہوں گے۔ پورب اور بہار کے باشندے، جن کے چہروں پر اَمِٹ اداسی تھی، گول مخملی ٹوپیوں اور مخملی واسکٹوں والے رام پور اور بریلی کے بانکے۔ مراد آباد کے برتن فروش۔ علی گڑھ کے قفل گر۔ فیروز آباد کے چوڑی والے۔ فرخ آباد کے رنگ ریز۔ لکھنؤ کے زردوز اور شاعر۔ دلّی کے کرخندار۔ اعظم گڑھ اور بنارس کے جولاہے۔ مرزاپور کے قالین باف۔ ان کی برقع پوش عورتیں اور بچّے۔

ٹرین آنے میں ابھی دیر تھی۔ وہ پلیٹ فارم پر بیٹھ کر اس گھمسان کا نظارہ کرتا رہا۔ وقت گزارنے کے لیے (بک اسٹال سے کوئی رسالہ خریدنے کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں تھے) اس نے سندھی کی تیسری کتاب نکال لی۔

پیر الٰہی بخش کولونی کے اس دو کمروں کے مکان میں دونوں طرف کیچڑ اور گڑھے تھے۔ صحن کے پچھواڑے کوڑے کرکٹ کا ڈھیر لگا تھا۔ کمروں کی دیواریں بے حد میلی تھیں اور کواڑوں میں شیشے کی جگہ اخبار کے کاغذ اور گتے چپکا دیے گئے تھے۔ آس پاس بھی زیادہ تر مہاجر آباد تھے جو زیادہ تر سرکاری ملازم تھے۔ ان کی زندگیاں خاصی بے آرام تھیں مگر ایک عجیب و غریب ولولہ اور قومی جوش سارے میں طاری تھا۔

چھوٹی بٹیا بی۔اے کے لیے کالج میں داخل ہو گئیں۔ سلمان کو ان کی طرف سے بہت فکر تھی۔ اپنے ڈی کلاس، ہونے پر کڑھتے کڑھتے انھوں نے اپنی صحت خراب کر لی تھی۔

ایک روز کالج سے لوٹ کر انھوں نے کہا :

"ماما ـــــ ماما! ہمیں ایک کالا برقع بنوا دیجیے۔"

"کیا ـــــ ؟" سلمان نے چونک کر پوچھا جو پلنگ پر لیٹا پاؤں ہلا ہلا کر اخبار پڑھ رہا تھا۔

"بس میں سب لوگ ہمیں بری طرح گھورتے ہیں، ہمیں سخت شرم آتی ہے۔ بس اسٹاپ پر کھڑے ہوتے ہیں تو جی چاہتا ہے کہ زمین پھٹ جائے اور ہم اس میں سما جائیں۔ سب کی نظریں تیر کی ایسی ہمیں چبھتی ہیں۔ برقعے میں کسی کو پتہ نہ چلے گا کہ کون جا رہا ہے۔" اتنا کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی۔

سلمان اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"اور ایسی ایسی بسیں جن کو دیکھنے سے دل ہلتا ہے۔" چھوٹی بٹیا نے پلکیں خشک کرتے ہوئے کہا۔

"ان بسوں میں تمھارے جیسے انسان ہی سوار ہوتے ہیں۔ بٹیا! تم اور انسانوں سے قطعی مختلف نہیں ہو ـــــ" سلمان نے کہا۔

"بٹیا ـــــ!" بابا نے اپنی چارپائی سے کہا ـــــ "یہ تمھارا خیال ہے۔ تمھیں 'چھوٹی بٹیا' سمجھ کر کوئی نہیں دیکھتا۔ لوگوں کو تمھاری اتنی پرواہ نہیں ہے۔ انھیں اپنے ہی غم بہتیرے ہیں۔"

"لیکن بابا! پرانے شناساؤں کے سامنے کتنی بے عزتی ہوتی ہے۔ ہماری رضیہ باجی وغیرہ ہمیں روز بس اسٹاپ پر کھڑا دیکھتی ہیں اور زن سے کار میں نکل جاتی ہیں ـــــ اور آج ـــــ!"

"آج ـــــ ؟" سلمان نے پوچھا۔

"آج ہم گھنٹہ بھر انتظار کرنے کے بعد پیدل صدر کی طرف آ رہے تھے تو وہ ٹیبل ٹینس چیمپین نہیں ہیں عالیہ سیّد ـــــ انھوں نے کار روک لی اور کہنے لگیں "دھوپ بہت تیز ہے ـــــ آیئے میں آپ کو لفٹ دے دوں ـــــ یہ شکر ہے کہ وہ ہمیں جانتی نہیں ـــــ" اتنا کہہ کر وہ سوں سوں کرتی منہ دھونے کے لیے

غسل خانے کی طرف چلی گئیں۔

کراچی پہنچ کر جمشید نے چند روز کی بھاگ دوڑ کے بعد ایک دوست کے اشتراک سے ایکسپورٹ امپورٹ کا کاروبار شروع کر دیا اور میکلوڈ روڈ پر ایک متروکہ دفتر حاصل کر لیا۔ وہ ہندو تاجروں کے انخلا کا زمانہ تھا۔ اس لیے اسے اپنا کاروبار جمانے میں بہت آسانی رہی۔ جنوری ۴۸ء کے بلوے کے بعد ایک دو منزلہ کوٹھی عامل کولونی نمبر ۲ میں خالی ہوئی تو اس نے اپنے نام الاٹ کروالی۔ اس نے بڑی محنت اور توجہ سے اپنا کاروبار پھیلایا اور ڈیڑھ سال کے اندر اندر کراچی کی نئی دنیا میں اس کے قدم مضبوطی سے جم گئے۔

دوسرے سال وہ کانپور گیا اور اپنی ماں سے کہا۔

"اصغر اور انور کے امتحان ختم ہو جائیں تو ان کو ساتھ لے کر چلی آیئے ورنہ عالیہ اور آپ میرے ساتھ ہی چلی چلیے۔ یہ لوگ بعد میں آ جائیں گے۔ میں نے ایک بہت اچھے سنے ٹوریم میں آپ کے داخلے کے انتظام کر دیا ہے۔"

"اور فرحت بٹیا کو دیکھے محمد گنج نہ جُھیُو ____ ؟"

"میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میں مصروف آدمی ہوں۔ آپ لوگ فوراً میرے ہمراہ چلیے، ورنہ بعد میں آ جایئے گا۔"

اگلے ہفتے وہ اپنی ماں اور بہن کو لے کر کراچی آ گیا۔ عالیہ کانپور سے بی۔ اے کر چکی تھی۔ یہاں آ کر اس نے ایم۔ اے میں داخلہ لے لیا۔ وہ کانپور کالج میں ٹیبل ٹینس کے کئی مقابلے جیت چکی تھی۔ یہاں وہ بہت جلد یونیورسٹی چیمپین بن گئی۔

جمشید نے نوعمری میں آئی۔ سی۔ ایس کہلانے کے جو خواب دیکھے تھے وہ اس کو اب تک نہ بھولے تھے۔ وہ لاکھوں میں کھیل رہا تھا مگر جانتا تھا کہ بڑے افسر کی شان ہی دوسری ہوتی ہے۔ اس نے طے کر لیا کہ چھوٹے بھائیوں کو، سی۔ ایس۔ پی کے امتحانات دلوائے گا۔ بزنس مین کا ایک بھائی اعلیٰ عہدیدار بھی ہو تو اس سے اچھی بات

اور کیا ہو سکتی ہے؟

اپنی بیٹی فرحت النسا کو اس نے آج تک نہ دیکھا تھا۔ کچھ دنوں سے اس کے خیال نے جمشید کو بری طرح ستانا شروع کر دیا۔ اس کی بچی جو بہت دور، کسی دوسری دنیا میں، ایک پسماندہ گاؤں کے ایک غربت زدہ کچے گھر میں پروان چڑھ رہی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے چچا ابا کو خط لکھا۔ ویزا بنوایا اور ہندوستان روانہ ہو گیا۔

گیارہ برس کے طویل عرصے کے بعد جمشید محمد گنج پہنچا۔ (وہ ۱۹۴۱ء میں منظور النسا کو بیاہ لے جانے کے لیے آخری بار یہاں آیا تھا)۔ اسٹیشن پر اتر کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ گوبندوا یکہ لیے اسی طرح اس کا منتظر ہے گویا وہ دسہرے کی چھٹیوں میں اسکول سے گھر آیا ہو۔

"بھیا آئے گئین ـــــ!" گوبندوا نے آگے بڑھ کر کہا۔

"گوبند ـــــ چاچا ـــــ؟" اس نے ذرا جھجکتے ہوئے چاچا کے لفظ کا اضافہ کیا ـــــ "تم کیسے آئے ـــــ؟"

"چھوٹے ساہ جی بتائے رہن کی آج کی گاڑی سے آوت ہو۔"

جمشید نے یکے پر چڑھتے ہوئے دقّت محسوس کی اور ذرا جھینپ کر اپنی قیمتی پتلون کی کریز پر نظر ڈالی۔

سیّد مظہر علی کے مکان پر تقریباً سارا گاؤں جمع تھا ـــــ شمبھو دادا۔ شیخ رمضان۔ مولوی محمد حسن۔ توقیر میاں۔ پنڈت لچھمی نرائن۔ گوبردھن چاچا۔ رحمت بھیا۔ گوسائیں کاکا۔ اور جانے کون کون ـــــ بچے جوان ہو گئے تھے، جوان ادھیڑ ہو چلے تھے اور بوڑھے قبروں میں پاؤں لٹکائے تھے۔ گوبند چاچا نے اسے گلے لگایا اور بھوں بھوں کر کے روئے۔ جھینگاپاسی کی خوشی کے مارے باچھیں کھلی جا رہی تھیں اور وہ احمقوں کی طرح منہ کھولے بھیا کو تک رہا تھا۔ ساری بستی میں اودھم مچی ہوئی تھی ـــــ "جمشید بھیا پاکستان سے آئے ہیں ـــــ بڑے رھیس ہو گئے ہیں ـــــ یہ بڑی سونے کی گھڑی لگائے ہیں ـــــ بالکل جنٹ صاحب معلوم پڑتے ہیں۔"

جمشید کی نظروں نے بہت سے مانوس چہروں کو تلاش کیا، جو اب موجود نہ تھے۔ چپاتی بھانڈ مر چکا تھا۔ سلامو ہبوڑن مر چکی تھی جو ٹنکو پر سگریٹ پان بیچا کرتی تھی۔ نواب متن خاں اب بھی ڈاکے ڈالتے تھے اور ان دنوں جیل گئے ہوئے تھے۔

منظور النسا کو جب سے معلوم ہوا تھا کہ جمشید آنے والے ہیں وہ جلے پاؤں کی بلی کی طرح سارے گھر میں پھرتی رہی تھی۔ اس نے دالان اور کھڑکیوں کی تندہی سے صفائی کی تھی۔ گھر کے سارے برتن مانجھ مانجھ کر چمکا دیے تھے۔ جھنگا پاسی کی عورت کے ساتھ مل کر دالان اور اُسارا لیپا تھا۔ پلاؤ اور فیرنی کے لیے چاول صاف کیے تھے۔ آدھی رات سے اٹھ کر صبح کا ناشتہ تیار کیا تھا۔ اس کے ماں ماں باپ اس کی یہ سرگرمی اور مصروفیت دیکھتے اور الم سے نظریں جھکا لیتے۔ فرحت النسا کے لیے اس نے تین دن اندھیرا پڑے تک صحن میں بیٹھ کر ہاتھ سے نیا جوڑا سیا تھا۔

ٹرین کے آنے کا وقت ہوا تو منظور النسا نے لڑکی کو نہلا دھلا کر گوٹے لچکے کا نیا جوڑا پہنایا۔ اس کے بالوں کی تیل لگا کر مینڈھیاں گوندھیں۔ ناشتے کا سامان تخت پر چنا اور خود اسی طرح بکھرے بالوں کو میلے دوپٹے میں سمیٹتی چہرے کا پسینا خشک کرتی کوٹھے پر چلی گئی۔ وہاں وہ چھت کی منڈیرے سے لگ کر بیٹھ گئی اور پرنالے کے موکھے میں سے اسٹیشن کی طرف آنے والی سڑک کو تکتی رہی۔ جب جمشید یکّے سے اترا تو منظور النسا نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھا اور لرزتی رہی۔ جمشید نے سیّد مظہر علی کو جھک کر سلام کیا ـــــ گاؤں والوں کے گلے لگا اور اندر جا کر اپنی بیٹی کو لپٹا لیا۔

شاہ منور علی خانقاہ کے حجرے میں سے نکل آئے۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا مگر منہ سے کچھ نہ بولے اور پھر خانقاہ واپس چلے گئے۔ سیّد اختر علی کو بلانے کے لیے بہت سے آدمی دوڑے، مگر گومتی کے کنارے ان کی جھونپڑی خالی پڑی تھی۔ وہ غائب ہو چکے تھے۔

جمشید ہفتہ بھر وہاں رہا اور سارے وقت اس نے سیّد مظہر علی اور ان کے احباب کو کراچی کی ایسی ایسی محیر العقول داستانیں سنائیں کہ ان لوگوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ بڑی مشکل اور محنت سے اس نے ان بوڑھوں کو ایکسپورٹ، امپورٹ،

بلیک مارکیٹ، پگڑی، لائسنس، پرمٹ اور الاٹ منٹ کے معنی سمجھائے۔

"سمجھ گئے۔ پگڑی تو یوں جانو جیس ہم پنچ کے یہاں صاحب لوگ کی ڈالی ہوت رہی ـــــ "شمھو دادا نے سر ہلا کر کہا ـــــ "نجر بھینٹ نہ کہو، پگڑی کہہ لیو۔"

"ای سب تو ہم ہُو جانت ہیں" ـــــ پنڈت بچھمی نرائن مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ اس پوری محفل میں محض وہی واقفِ اَسرار تھے، کیونکہ ان کا انگریزی داں بھانجا کئی برس سے دہلی میں ٹھیکے لے رہا تھا اور اب اس نے بمبئی میں بزنس اور ایکسپورٹ امپورٹ شروع کر دی تھی۔ اور ایک مرتبہ اس نے محمدؐ گنج آ کر اپنے ماما کو دہلی اور بمبئی کی بے انتہا محیر العقول داستانیں سنائی تھیں ـــــ

"ہمرے گاؤں سے خالی دوئی ٹھو منئ ہُوتے قابل نکسے ہَن۔" توقیر میاں نے فخریہ کہا ـــــ "ایک تمہر امھگیو اور ایک ای جمشید وا۔"

"اسلامی دارالخلافہ ہے۔ کراچی میں مساجد تو ایک سے ایک شان دار بن گئی ہوں گی۔" مولوی محمدؐ حسن نے کہا۔

"جی ـــــ!" جمشید نے مختصر جواب دیا۔

"انگریزوں کو بڑی دِقّت پڑتی ہو گی۔ تمھارے کے یہاں۔" مولوی صاحب نے مزید اظہار خیال کیا۔

"کیوں ـــــ؟" جمشید نے پوچھا۔

"ارے ام الخبائث جو ممنوع ہو گی۔ ماشاءاللہ سے اسلامی ملک ہے۔"

جمشید نے دل میں سوچا کہ اگر اِن بیچاروں کو معلوم ہو جائے کہ ان کا عزیز بھتیجا کراچی جم خانہ میں روز شام کو گھڑوں وہسکی لنڈھاتا ہے ـــــ "جی نہیں ابھی تو ممنوع نہیں ہوئی ـــــ "جمشید نے ذرا بے تعلقی سے جواب دیا۔

"ہمارے کے ہاں تو لگ گئی ہے پابندی۔" مولوی صاحب نے کہا۔ "پابندی کیا ہوت ہو ـــــ "پنڈت بچھمی نرائن نے جو واقفِ اسرار تھے، کہا ـــــ "بھیگو بتاوت رہا کہ لوگ اب لُک چھپ کے اور جیاستی پیت ہیں دارو۔"

پابندی کیا شے ہے۔ جمشید نے فلسفیانہ انداز میں سوچا ـــــ اخلاقی، سیاسی، مذہبی پابندیاں ـــــ گزر گیا اب وہ دورِ ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے ـــــ بنے گا سارا جہان میخانہ ہر کوئی بادہ خوار ہوگا ـــــ اس نے دل میں دہرایا۔ مگر اب اس کا دماغ جانے کہاں سے کہاں نکل گیا تھا۔ وہ پھر محمد گنج کی درگاہ کے نیم تلے واپس لوٹا۔

"بھیا تنِک ای تو بتاؤ تمھارے کے ہاں قومی پہناوا کیا ہے ـــــ ؟" توقیر میاں نے سوال کیا ـــــ "ہمارے کے ہاں تو افسران کو حکم مل گیا ہے، ولایت جائیں تو قومی پہناوا پہنیں۔" وہ مدینہ (بجنور) اور قومی آواز (لکھنؤ) باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔

"پاکستان میں مستورات پردے میں رہتی ہوں گی۔ اسلامی ملک ہے۔" مولوی صاحب نے کہا ـــــ "ہمارے کے ہاں تو آزادی کی ہوا بہت چل گئی ہے" ـــــ

شیخ رمضان اور توقیر میاں اور دوسرے مسلمان بوڑھے پاکستان کی باتوں کو بے حد عقیدت سے سن رہے تھے۔

"فرحت النسا کیا پڑھ رہی ہے؟" جمشید نے موضوعِ گفتگو تبدیل کرنے کے لیے اپنے چچا سے استفسار کیا۔

"ہم خود پڑھاتے ہیں۔ اردو اور قران شریف۔ شمبھو بھیا انگریزی بھی پڑھا دیتے ہیں۔ اے۔ بی۔ سی۔ ڈی ـــــ گوسائیں بھیا اسے ہندی پڑھا رہے ہیں" ـــــ سیّد مظہر علی نے فخر سے بتایا۔ جمشید کو ایسا محسوس ہوا جیسے گاؤں کے لوگ اس کی بیٹی کو اپنی ذاتی ذمّے دار سمجھتے تھے۔ وہ یہ کہنے والا تھا کہ اس کا ارادہ ہے کہ کراچی لے جانے کے کچھ عرصے بعد وہ فرحت النسا کو تعلیم کے لیے سوئٹزرلینڈ بھیج دے مگر اب چچا ابا اور شمبھو دادا اور گوسائیں کاکا کو یہ بتاتے ہوئے اسے بے حد شرم آئی، جیسے وہ ان افلاس زدہ لوگوں کا مذاق اڑانے والا ہو۔ اپنی پستی اور ان معصوم لوگوں کی بلندی کا اسے شدّت سے احساس ہوا۔ وہ سر جھکا کر چبوترے پر نیم کے تنکے سے لکیریں کھینچنے لگا۔

منظور النسا کا اس سے پردہ تھا مگر جب تک وہ یہاں رہا وہ کواڑوں کی درزوں میں سے چھپ چھپ کر متواترا اسے دیکھا کی۔ ایک بار اس کی ماں نے اسے اس طرح جھانکتے پایا تو وہ اس پر برس پڑیں ــــــ "اری جم جلی! بھیا اب تیرے لیے نامحرم آئیں۔ تیرا اسامنا ہو گوا تو گناہ ہوئیہے ــــــ پاپ ہوئیہے ــــــ !"

"نامحرم آئیں۔ ہمرے چچا کے پوت تو ہوں" ــــــ منظور النسا نے غم و غصے سے کھولتے ہوئے دبی زبان سے کہا۔

"بے حیا ــــــ بے شرم ــــــ بے غیرت ــــــ !" سید مظہر علی کی بی بی بکتی جھکتی مہمان کے لیے پلاؤ دم کرنے باورچی خانے میں چلی گئیں۔ منظور النسا وہیں کواڑ سے لگ کر زمین پر بیٹھ گئی اور بلک بلک کر آہستہ آہستہ روتی رہی۔

جمشید فرحت النسا کو محمد گنج سے اپنے ساتھ کراچی لے آیا۔ وہاں پہنچتے ہی اس کے لیے ایک اینگلو انڈین گورنس مقرر کی اور اسے ایک اعلیٰ درجے کے پرائیویٹ اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ عالیہ نے بھتیجی کی تعلیم و تربیت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اب وہ گھر پہ اور اسکول میں فیری کہلاتی تھی اور چند سال کے اندر اندر بڑی اسمارٹ اور تیز و طرار teen ager بن چکی تھی جو تنگ موریوں کی شلوار، بغیر آستین کی نہایت چست قمیص پہنتی تھی اور دوپٹے کے بجائے ایک قسم کا پٹا کندھے پر ہلگائے رہتی تھی، اور راک این رول کی ماہر تھی۔ اپنے نانا کے آنگن کو اُس نے کبھی بھولے سے بھی یاد نہیں کیا۔

عالیہ گاہے بہ گاہے سیّد مظہر علی کو یہاں کی خیر خبر سے مطلع کرتی رہی۔

ــــــ آج بھیا نے نئی کار خرید لی۔ ماشاءاللہ سے چالیس ہزار کی آئی ہے۔

ــــــ کل بھیا کاروبار کے سلسلے میں یورپ روانہ ہو گئے۔ یہ بھیا کا یورپ کا چوتھا سفر ہے!

ــــــ میں اگلے مہینے نیویارک جا رہی ہوں (یہ امریکہ میں ایک بہت بڑا شہر ہے)۔

ــــــ فیری بٹیا اسکول کی لڑکیوں کے ساتھ مری گئی ہیں (یہ مغربی

پاکستان میں ایک پہاڑی مقام ہے)۔

"______ میں یہ سطریں پُر سکون اور ہرے بھرے سلہٹ کے ریسٹ ہاؤس میں بیٹھی لکھ رہی ہوں۔ سامنے ڈھلوان پر سُر ماندی بہہ رہی ہے۔ عقب میں درختوں سے گھری ایک بہت بڑی جھیل ہے۔ پہلو میں ندی کے سرخ رنگ کے عظیم الشان اور بلند و بالا آہنی پُل پر سے راہ گیروں، سائیکل رکشاؤں اور اگادگا موٹروں کا لامتناہی جلوس گزر رہا ہے۔ میں کھڑکی کے پاس پلنگ پر بیٹھ کر تم کو دن بھر یہ "خط" لکھتی رہوں گی اور پھر اسے اپنے ٹرنک کی تہہ میں چھپادوں گی۔ پچھلے برسوں میں، میں نے اس طرح کتنے ان گنت مفصّل 'خط' لکھ لکھ کر بکس میں مقفل کردیے ہیں یا تلف کردیے ہیں۔ ان مختصر اگادگا سطور میں جو ہم دونوں فرضی ناموں سے ایک دوسرے کو بھیجتے ہیں ان کے رمز و کنایے، مبہم الفاظ، تلمیحات اور محتاط استعاروں میں تم سے باتیں کرنے کی کوشش کے بعد جب میرا دم گھٹنے لگتا ہے تو میں بیٹھ کر بے حد لمبے چوڑے کھرّے خط تمھیں لکھتی ہوں۔ جب بھی تم سے "بلا کم و کاست" اور مفصّل باتیں اور گپ شپ کرنے کو بے طرح جی چاہتا ہے تو میں کاغذ قلم لے کر بیٹھ جاتی ہوں اور سوچتی ہوں، کاش یہ پلندے تم تک پہنچ سکتے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا، جب میں سارے طولانی دفتر تمھیں پڑھنے کو دوں گی تاکہ retrospect میں تم سے ہم کلام ہو سکوں۔

ابھی سرکٹ ہاؤس کا چھدری ڈاڑھی اور لمبے لمبے دانتوں والا شفیق بوڑھا بیرا میرے لیے چائے لے کر آیا ہے، وہ مجھے اپنے گاؤں کے اور سلہٹ کے اولیاء کے بڑے دلآویز قصے سنایا کرتا ہے۔

رات کو سلہٹ کے بازار میں دور دور تک شمعیں جلتی ہیں۔ بڑا عجیب، غیر حقیقی پرستان کا ایسا نظارہ ہوتا ہے۔ سرکٹ ہاؤس کے پہلو میں غدر کے وقت کے کسی انگریز فوجی افسر کی قبر ہے۔ اس کے چاروں طرف سبز گھاس پر ایک گائے دن بھر چرا

کرتی ہے۔ یہاں پر کس قدر امت سکون ہے۔ کل میں نے چائے کے باغوں میں گھوم کر دن بھر اسکیچ بنائے۔

آج مجھے مشرقی پاکستان آئے پورے چھ سال ہو گئے۔ لیکن ایسا لگتا ہے، جیسے کل کی بات ہو۔ ۴۹ء کے آخر میں مجھے تمھارے متعلق اطلاع ملی تھی تم مشرقی پاکستان میں ہو۔ اس مبہم سی خبر کے بھروسے پر میں نے اسکول سے استعفیٰ دیا اور ڈھاکے آ گئی۔ یہاں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ اطلاع غلط تھی۔ یہاں میں نے وہی جدو جہد اور محنت کی زندگی بسر کرنا شروع کر دی جس کی وجہ سے تم کو مجھ پر اتنا فخر ہے اور جس سے میں اب بری طرح تھک چکی ہوں۔ میرے کانوں میں تمھاری آواز گونجتی ہے ـــــ ''خدا جانتا ہے ثریا، تم زندگی میں تھوڑے سے آرام، تھوڑی سی آسائش کی مستحق ہو'' ـــــ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ جب پدما کے گہرے پانیوں میں میری کشتی پہنچتی ہے تو بے اختیار میرا جی چاہا ہے کہ ندی میں کود کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لوں ـــــ لیکن پھر تمھاری آواز میرے دل کے کانوں میں آتی ہے ـــــ ''تم بھی ہمیں مایوس کر رہی ہو لڑکی! ـــــ ہمیں مایوس نہ کرنا ـــــ بہادر لڑکی ـــــ سپاہی لڑکی ـــــ''

بعض اوقات میں سوچتی ہوں کہ یہ سب بکواس ہے، تمھارا دماغ خراب ہے، تم جھک مار رہے ہو۔ میرا دماغ خراب ہے، میں بھی جھک مار رہی ہوں۔ مگر پھر مستقبل کا بھروسہ آڑے آتا ہے۔ خود کو یقین دلاتی ہوں کہ ایک نہ ایک روز مجھے ضرور ہی زندگی میں خوشی ملے گی ـــــ ''امید'' بھی کیا چیز ہے ـــــ اگر نہ ہو یہ فریب پیہم، تو دم نکل جائے آدمی کا۔

آج کل اسکول میں چھٹیاں ہیں، جہاں میں آرٹ ٹیچر ہوں۔ میں اپنی ایک سہیلی کے ہمراہ سلہٹ آئی ہوئی ہوں۔ اس کا شوہر یہاں دورے پر آیا ہے۔ وہ دونوں کل سے مولوی بازار گئے ہوئے ہیں اور میں آج دن بھر تم سے باتیں کرتی رہوں گی۔

مشرقی بنگال کتنا خوبصورت ہے۔ یہاں کے لوگ کتنے پیارے ہیں۔ کبھی ایسا ہوگا کہ تم میرے ساتھ ہوگے اور میں تمھاری موجودگی میں ان جنگلوں اور ان ندیوں

کی تصویریں بناؤں گی؟

تم نے اخباروں میں پڑھا ہوگا۔ یار لوگوں نے اُڑادیا ہے کہ میرے فن کا "بنگالی پیریڈ" شروع ہوگیا ہے۔ بکواس! میں تو اپنی زندگی کا اہم ترین، خوب صورت ترین، پیریڈ شروع کرنا چاہتی ہوں اور تمھیں خوب معلوم ہے اس پیریڈ کا نام کیا ہوگا؟ ڈھاکے میں میری دو نمایشیں ہو چکی ہیں۔ تمھارے بغیر یہ سارا گورکھ دھندا مجھے کاٹنے کو دوڑتا ہے۔

آج میری اکتیسویں سال گرہ ہے یعنی آج سے اکتیس برس قبل میں اس "آنسوؤں کی وادی" میں روتی چلاتی داخل ہوئی تھی۔ جس ماحول میں میں نے آنکھیں کھولیں وہاں چاندی کے شمع دانوں کے بجائے شکستہ لالٹینیں تھیں۔ "ہیپّی برتھ ڈے" کے سروں کے بجائے گائے بیلوں کی گھنٹیاں تھیں اور چاکلیٹ کیک کے بجائے اوپلے تھے۔ میری اس دنیا میں سال گرہ کے جشن نہیں منائے جاتے تھے۔ تم جس طلسماتی دنیا میں پیدا ہوئے وہاں تمھاری "برتھ ڈے" پر قصر سلمان میں دھوم کی فینسی ڈریس پارٹی منعقد کی جاتی تھی ـــــ! بہر حال آج میں اس وقت پہلی بار اپنی سال گرہ منا رہی ہوں اور سال گرہ منانے کا طریقہ میں نے یہ سوچا ہے کہ میں تم کو اکتیس صفحے کا خط لکھوں گی اور اس کے بعد اڑتیس صفحات کا اس میں مزید اضافہ کروں گی جو تمھاری عمر کے اعداد ہیں۔ اس حساب سے ہم دونوں کی مجموعی عمر انہتر برس کی ہے یعنی تم اور میں ہم دونوں نے انہتر برس اکٹھے گزارے ہیں۔ جوانی کے خواب اور ولولے اور جنون خیزیاں ـــــ پختہ سالی کا جذباتی توازن، بڑھاپا، آرام اور سکون اور رفاقت اور دردمندی ـــــ

Calm of mind all passion spent

پچھلے ہفتے یہاں آکر جب میں "قمر جہاں بیگم" کو ایک مختصر سا خط پوسٹ کرنے گئی تو مجھے ڈاک خانے کا راستہ معلوم نہ تھا اور سڑک پر چلتی ہوئی ایک سرکاری بنگلے میں داخل ہوگئی جسے دور سے میں ڈاک خانہ سمجھی تھی۔ میں سیدھے کمرے میں چلی گئی اور وہاں ایک شکستہ سا گاؤن پہنے ایک بنگالی وکیل مجسٹریٹ کے سامنے کھڑا جرح

کر رہا تھا۔ میں جرح کی عدالت میں گھس گئی تھی۔ اس وقت مجھے دفعتاً خیال آیا کہ میرا اور تمھارا ـــــ ہم دونوں کا ـــــ عدالتوں سے کتنا تعلق رہا ہے!

تمھارا آخری خط مجھے چھے مہینے ہوئے ملا تھا جس میں تم نے صرف اتنا لکھا تھا ـــــ "پرسوں رات بابا کا انتقال ہو گیا۔ اگر تم اس وقت ہمارے پاس ہوتیں تو ہم اپنی آنکھیں تمھارے ہاتھوں میں چھپا لیتے اور خوب روتے ـــــ بابا نے کبھی اس کا شکوہ نہ کیا کہ اگر ان کا بیٹا کہیں افسری کر رہا ہوتا تو ان کو یہ مصائب نہ جھیلنے پڑتے ـــــ "

اس کے بعد تم بالکل خاموش ہو۔ نظر بندی کی گزشتہ مدّتوں میں تم مجھے برابر لکھتے رہے ہو۔ میں سوچ سوچ کر باؤلی ہوتی جا رہی ہوں۔

اب سُرما ندی پر شفق کی سرخی پھیل گئی ہے اور بازار میں موم بتیاں جھلملانے لگی ہیں ـــــ "

جمشید اپنے ڈرائنگ روم میں چند مہمانوں کے لیے کاک ٹیل تیار کر رہا تھا جب نوکر نے آکر اطلاع دی ـــــ

"صاحب! کوئی بڑے میاں آئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ آپ کے والد ہیں۔"

"میرے والد ـــــ ؟" جمشید جلدی سے باہر گیا۔

نارنجی کفنی میں ملبوس سیّد اختر علی موٹر رکشا میں بیٹھے تھے۔ چھوٹا سا ٹین کا بکس، دری میں لپٹا ہوا بستر اور لوٹا ان کے قدموں میں رکھا تھا۔ انھوں نے آنکھیں اٹھا کر جمشید کو دیکھا اور مسکرائے۔

"ہمیں بشارت ہوئی تھی کہ پاکستان چلے آئیں۔"

"میں یہ اہم اطلاع تمھیں بھجوا رہی ہوں کہ میں عنقریب کراچی پہنچنے والی ہوں۔ یہ چند سطریں میں تم کو نرائن گنج جاتے ہوئے لانچ میں لکھ رہی ہوں۔ میں نے

اتنا روپیہ جمع کر لیا ہے کہ کراچی پہنچ سکوں اور جب تک وہاں کام نہ ملے میں ـــــ "

ایک روز چھوٹی بٹیا اسکول پڑھا کر لوٹیں تو انھوں نے چائے پیتے ہوئے حسبِ معمول صبح کے اخبار میں "ضرورت ہے" کا کالم پڑھنا شروع کیا ـــــ ایک بڑی فرم میں ری سپشنٹ کی جگہ خالی تھی۔

دوسری صبح اسکول سے چھٹی لے کر وہ اس پتے پر ویسٹ وہارف کی ایک نئی عمارت پر پہنچیں۔ تیسری فلور کی گیلری میں ایک اینگلو پاکستانی لڑکی نے ان سے پوچھا ـــــ "یس پلیز ـــــ ؟"

چھوٹی بٹیا نے بہت گھبراتے ہوئے بیگ سے اخبار کا تراشا نکالا۔ "امیدواروں کا انٹرویو کون کرتا ہے ـــــ ؟"

" ـــــ مینیجنگ ڈائرکٹر خود ـــــ آپ کا ان سے اپوائنٹ منٹ ہے؟"

"نہیں!"

"اپنی درخواست مجھے دید یجیے!"

"درخواست تو میں نے لکھی نہیں ـــــ "

لڑکی کو چھوٹی بٹیا کی گھبراہٹ اور پریشانی دیکھ کر ترس آگیا۔

"آپ یہیں ٹھہریے۔ میں بوس سے کہتی ہوں۔"

چند منٹ بعد وہ واپس آئی اور چھوٹی بٹیا اس کے ساتھ ساتھ ایک اور خشک اور نیم تاریک جھل مل کرتی گیلری میں سے گزرتی ایک وسیع ایرکنڈیشنڈ کمرے میں داخل ہوئیں، جس میں بہت بڑا سبز رنگ کا قالین بچھا تھا اور ہلکی سبزی مائل سفید جھلملیوں والے طویل دریچے کے نیچے اور ایک طویل وعریض میز کے اس پار مینیجنگ ڈائرکٹر گھومنے والی کرسی پر بیٹھا کاغذات پر دستخط کرنے میں مصروف تھا۔ وہ سانولی رنگت کا خاصا خوش شکل آدمی تھا۔ اُن کی عمر چالیس بیالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔

آنکھوں میں سنجیدگی اور ایک نوع کی سوچ تھی۔ دستخط کرنے کے بعد اس نے ڈکٹافون پر کچھ کہا اور پھر لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ اینگلو پاکستانی لڑکی چھوٹی بٹیا کو اندر پہنچا کر جا چکی تھی۔ وہ میز کے قریب جا کر کھڑی ہو گئیں مگر مینیجنگ ڈائرکٹر اسی طرح کاغذات میں منہمک رہا۔ (یہی اس کی خاص تکنیک تھی تاکہ نووارد پر ظاہر ہو سکے کہ اس کا ایک ایک منٹ کتنا قیمتی ہے)۔

فائل بند کرنے کے بعد اس نے سر اٹھایا۔

"سلام علیکم!" ـــــ چھوٹی بٹیا نے کہا۔

"سلام علیکم! ـــــ فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"آپ کے یہاں ایک جگہ خالی ہے۔"

"جی ہاں! ـــــ جی ہاں!! تشریف رکھیے۔" اس نے امیدوار کا ماہرانہ نظروں سے جائزہ لیا۔ لڑکی میں شدّت کی سیکس اپیل تھی۔ چھوٹا سا قد، بہت سفید رنگت، چھوٹی چھوٹی شربتی آنکھیں، سنہری بال، بالکل جاپانی گڑیا جیسی۔ بالوں کی اس نے خوب موٹی سی ایک چوٹی گوندھ رکھی تھی جو تراشیدہ بالوں کے مروّجہ فیشن کے مقابلے میں بہت انوکھی اور بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

"آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟" اس نے دل میں فوری فیصلہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"سلمیٰ مرزا۔"

اس نے کاغذ پر نام لکھ لیا۔

"کوالی فی کیشنز؟"

"بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔"

"پہلے کبھی کام کیا ہے؟"

"جی نہیں ـــــ جی ہاں! ـــــ جی ہمارا مطلب ہے ہم نے کسی دفتر میں کام نہیں کیا۔ ہم اسکول ٹیچر ہیں۔"

مینیجنگ ڈائرکٹر لڑکی کے اس "ہم" کہنے کے انداز پر زیرِ لب مسکرایا۔ پھر

تھوڑے سے وقفے کے بعد اس نے کہا۔

"بہت خوب! دیکھیے ہمارے یہاں صرف یہ کام ہے کہ یہاں دفتر میں آپ کو ہمارے غیر ملکی کلائنٹس کو ریسیو کرنا ہو گا۔ علاوہ ازیں جب کبھی میں غیر ملکی تاجروں، اعلیٰ افسروں وغیرہ کو میٹروپول یا جم خانہ وغیرہ میں مدعو کروں تو ان کو انٹرٹین کرنے کے سلسلے میں بھی آپ میرا ہاتھ بٹائیں گی۔"

"مگر ــــــ" چھوٹی بٹیا نے کہنا چاہا۔

مینجنگ ڈائرکٹر نے ان کی سنی اَن سنی کرتے ہوئے بات جاری رکھی ــــــ آپ یقیناً آج کل کے مغربی طور طریقوں سے واقف ہوں گی اور ڈانس بھی کر سکتی ہوں گی۔ معاف کیجیے گا، یہ سوال میں اس لیے کر رہا ہوں کہ میں نے پچھلے دنوں ایک پاکستانی لڑکی کا اسی کام پر تقرر کیا مگر وہ پارٹیوں میں بات کرتے ہوئے گھبراتی تھی اور ٹیبل مینرز (table-manners) سے اچھی طرح واقف نہ تھی۔ تو میرا مطلب ہے کہ آج کل اعلیٰ پیمانے کے کاروبار میں پبلک ریلیشنز کی اہمیت بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ میں کسی یورپین لڑکی کو بآسانی اس جگہ پر رکھ سکتا ہوں مگر آپ جانتی ہیں آج کل یورپین اور امریکن حضرات مشرقی خواتین سے کس قدر متاثر ہیں۔"

"جی ــــــ لیکن ــــــ ہم ــــــ"

مینجنگ ڈائرکٹر فوراً بھانپ گیا کہ امیدوار یہ عہدہ قبول کرتے ہوئے جھجھک رہی ہے۔ مگر وہ جانتا تھا کہ ایسی غیر معمولی دلکش اور سیکس اپیل کی مالک لڑکی اسے آسانی سے دستیاب نہ ہو گی۔ اور اسے اپنا "آئیڈیا" سیل کرنا بھی خوب آتا تھا۔ اس نے لڑکی کو سمجھانا شروع کیا ــــــ چند منٹ اِدھر اُدھر باتیں کرتے کرتے وہ پھر اپنے موضوع کی طرف لوٹا ــــــ "مثال کے طور پر یہ دیکھیے کہ مغربی ممالک کی مشہور ایرلائینز اپنی ایئر ہوسٹس لڑکیوں کو ساریاں اور کیمونو پہنا رہی ہیں۔ محض اس لیے کہ مسافروں کو ــــــ"

"جی ــــــ مگر ــــــ"

"نیویارک کی اقوام متحدہ میں خود دیکھ کر آیا ہوں جو گائڈ لڑکیاں مشرقی

ممالک کی ہیں ان کے پیچھے سیاحوں کا جم غفیر چلتا ہے۔ یہ کوئی ایسی پریشان کن بات نہیں ہے تو پھر طے ہے ـــــ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ بڑی مکمل سکریٹری ثابت ہوں گی۔ پہلی مارچ سے میں آپ کا تقرر کیے لیتا ہوں۔ آپ کی تنخواہ ساڑھے سات سو روپے ماہوار ہوگی ـــــ "اس نے کن انکھیوں سے امیدوار لڑکی کا رد عمل دیکھا اور گھنٹی بجائی۔ دبیز پردوں میں سے ایک سیاہ فام گوانی کلرک جن کی طرح نمودار ہوا۔

"مسٹر پیٹرک! ـــــ آپ مس مرزا ہیں۔ ان کو میں اپنا سوشل سکریٹری مقرر کر رہا ہوں۔ ان کا ذاتی فائل تیار کیجیے!"

"لیس سر ـــــ!"

پندرہ منٹ کے اندر اندر ساڑھے سات سو روپے ماہوار پر اس کا تقرر ہو گیا۔ یہ بات چھوٹی بٹیا کو بہت عجیب لگی۔

"لیکن ہم سمجھتے تھے کہ یہ اشتہار آفس ریسپشن اسٹ کے لیے تھا۔" انھوں نے ایک بار پھر احتجاج کیا۔

"جی ہاں! مگر آپ کو دیکھ کر میں نے اپنا خیال بدل دیا۔" مینجنگ ڈائرکٹر نے کرسی کا رخ گھمایا اور لڑکی کی بڑھتی ہوئی گھبراہٹ دیکھ کر دل میں سوچا ـــــ بہت بھولی اور ذرا بے وقوف بھی ہے اور بے حد ضرورت مند، اور ناتجربہ کار تو یقیناً ہے!

"دوسری بات یہ ہے" ـــــ اس نے بآواز بلند کہا ـــــ "کہ آپ رہتی کہاں ہیں؟"

چھوٹی بٹیا نے اپنا پتا بتلایا۔

"اوہ ـــــ!" مینجنگ ڈائرکٹر کے منہ سے نکلا۔

چھوٹی بٹیا ساری کا پلو سنبھال کر اٹھیں۔

"آپ کو یہ ملازمت منظور نہیں ہے؟"

چھوٹی بٹیا نے لحظہ بھر کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

بابا کے انتقال اور بھیا کے چلے جانے کے بعد وہ اسی طرح لشٹم پشٹم ایک

پرائیویٹ اسکول میں پونے دوسو روپے ماہوار پر پڑھاتی رہی تھیں۔ وہ ہر اتوار بھیا کے لیے اچھے اچھے پھل اور ان کے پسندیدہ سگریٹ اور نئی نئی کتابیں اور رسالے لے جانا چاہتی تھیں مگر وہ اس تنخواہ میں ممکن نہ تھا۔ پھر بھیا یہاں سے بہت دور بھیج دیے گئے تھے اور اسے بہاول پور کے ایک گرلز اسکول میں سکنڈ مسٹریس کی جگہ مل گئی تھی۔ کولونی کا مکان انھوں نے بہار سے آئے ہوئے ایک دَدھیالی رشتے دار کے حوالے کیا تھا اور ماما کو ساتھ لے کر بہاول پور چلی گئی تھیں۔ وہاں زندگی کے مزید پانچ جھلسے ہوئے برس انھوں نے تپتے ہوئے ریگستان کے وسط میں ایک دور افتادہ، گمنام تحصیل میں لڑکیاں پڑھاتے گزارے تھے، وہاں ماما پر دل کے دورے پڑنے لگے تھے۔ اس تحصیل میں ان کا علاج ناممکن تھا۔ اس لیے وہ ماما کو ساتھ لے کر پھر کراچی آگئی تھیں۔ پچھلے ایک برس سے وہ پھر کولونی کے اسی مکان کے ایک کمرے میں رہ رہی تھیں جس پر اب دَدھیالی رشتے دار نے قبضہ کر لیا تھا اور اسی پرائیویٹ اسکول میں پڑھا رہی تھیں۔ اس ایک برس میں کلیم (claim) کے دفتر کے چکر لگاتے لگاتے ان کی ٹانگیں تھک چکی تھیں۔ ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے لیے اور ڈاکٹروں اور ہسپتالوں کی دوڑ بھاگ میں بسوں اور سائیکل رکشاؤں اور پیدل شہر کی خاک چھانتے چھانتے اب ان میں سکت نہیں تھی مگر بھیا کا کبھی کبھار جو خط آتا تھا وہ اس میں کتنے پیارے الفاظ میں ان کی ہمت بندھاتے تھے ـــــ اور وہ پھر سر اٹھا کے زندہ رہنے کی جدوجہد میں مصروف ہو جاتی تھیں ـــــ وقت کتنی تیزی سے گزر رہا تھا۔ بابا کو مَرے بھیا کو گھر سے گئے کتنی مدت گزر گئی تھی۔ ۱۹۶۱ء آچکا تھا۔ پچھلے پندرہ برس میں ایک دن ایک رات ایسی نہ آئی تھی جب وہ فکروں، پریشانیوں اور غم والم سے ایک لمحے کے لیے آزاد ہوئی ہوں۔ جب انھیں روزی کمانے کے لیے جی توڑ کر محنت و تگ و دو نہ کرنی پڑی ہو۔ ساڑھے سات سو روپے ماہوار ـــــ ساڑھے سات سو روپے ماہوار ـــــ ناقابلِ یقین ـــــ اور دنیا کی لڑکیاں دفتروں میں کام کر رہی تھیں۔ دفتروں میں سکریٹری کا کام کرنا قطعاً کوئی گھٹیا بات نہ تھی۔ ـــــ بھیا نے ان کو کتنی بار سمجھایا تھا ـــــ "بٹیا تم دوسرے انسانوں سے بالکل مختلف نہیں ہو" ـــــ اور پچھلے پندرہ برسوں

میں انھوں نے بھیا پر ثابت کر دیا تھا کہ وہ دنیا کے عام انسانوں سے مختلف نہیں تھیں اور بھیا کو ان پر کتنا بے پناہ فخر تھا ـــــ میری بہادر بہن! ـــــ میری سپاہی بہن!

انھوں نے فیصلہ کر لیا ـــــ

"جی ہاں!"

"گڈ ـــــ پہلی تاریخ کو ساڑھے آٹھ بجے صبح ہماری مائیکرو بس آپ کو پک اَپ کرنے آجائے گی ـــــ" دفعتاً چھوٹی بٹیا ایک بار پھر گھبرا گئیں ـــــ "مگر ہمیں شارٹ ہینڈ اور ٹائپ تو آتا ہی نہیں!"

"نیور مائنڈ ـــــ ہمارے یہاں آدھے درجن ٹائپسٹ لڑکیاں موجود ہیں۔ پہلی تاریخ ساڑھے آٹھ بجے ـــــ خدا حافظ، مس مرزا ـــــ!"

گھر میں داخل ہو کر چھوٹی بٹیا نے پھولے ہوئے سانس سے آواز دی ـــــ "ماما ـــــ ماما ـــــ ہمیں ساڑھے سات سو کی نوکری مل گئی ـــــ ایک دم ساڑھے سات سو ـــــ اور آنے جانے کے لیے موٹر۔"

"اچھا!" ماما نے مختصر جواب دیا۔ انھوں نے کلکٹر صاحب کی موت کو برداشت کر لیا تھا۔ مگر سلمان کے جانے کے بعد سے انھیں چپ لگ گئی تھی۔

دہلیز پر اکڑوں بیٹھ کر لوٹے سے منہ پر چھپکے مارتے ہوئے اور اس کے بعد کھانا کھاتے ہوئے چھوٹی بٹیا سوچا کیں ـــــ مینجنگ ڈائرکٹر آدمی تو خاصا معقول نظر آتا تھا۔ اس کے فوراً بعد بوس اور سکریٹری کے تعلقات کی مخصوص نوعیت، اس سے متعلق لطیفے اور کہانیاں ان کے ذہن میں گھوم گئیں۔ لوگ ہمیں کیا سمجھیں گے؟ سستی، گھٹیا سکریٹری! لوگ کیا کہیں گے ـــــ "بٹیا! یہ تمھارا خیال ہے۔ لوگوں کو تمھاری اتنی پرواہ نہیں۔ انھیں اپنے ہی غم بہتیرے ہیں" ـــــ انھیں بابا کے الفاظ یاد آئے مگر یکم مارچ سے وہ اس مشتبہ ملازمت پر جانے والی تھیں۔ انھوں نے فوراً ساڑھے سات سو روپے کا تصور کیا۔ ساڑھے سات سو روپے ماہوار ایک مشت ـــــ فنٹاسٹک ـــــ اتنی بڑی رقم انھوں نے مدتوں سے نہ دیکھی تھی۔ انھوں نے پہلی تنخواہ کا بجٹ بنایا۔ سب سے پہلے تو بھیا کے لیے ڈھیر ساری چیزیں خریدیں گے۔ سب سے

پہلے ایک عمدہ سا شیونگ سیٹ۔ بھیا کا شیونگ سیٹ اب تک کتنا خستہ حال ہو چکا ہوگا۔ نئے پاجامے اور قمیص بنوائیں گے۔ بہت سارے چاکلیٹ کے ڈبے اور سگریٹ کے ٹین لیں گے۔ بھیا نے پچھلی مرتبہ ایک کتاب کے لیے لکھا تھا جو وہ پڑھنا چاہتے تھے اور طامس اینڈ طامس میں جا کر دیکھا تو اس کی قیمت پچیس روپے نکلی۔ اب ان کے یے پچیس پچیس روپے کی کتابیں خریدنا کیا مشکل ہے۔ ہمارے پاس ساریاں بالکل ختم ہو چکی ہیں۔ اس مہینے تو صرف سو روپے کی ساریاں خریدیں گے اور ایک جوڑا نئی سینڈلس، سیاہ رنگ کی، جو ہر ساری کے ساتھ چل جائیں اور مینیجنگ ڈائرکٹر کہہ رہا تھا کہ اس کی پارٹیوں میں جانا ہوگا۔ اس کے لیے کیا ہوگا؟ اس کے لیے تو بہت عمدہ ساریاں خریدنی پڑیں گی ـــــ اور ایک میک اَپ کا سامان ـــــ خیر میک اَپ تو میں کبھی نہ کروں گی ـــــ بھیا کو پاؤڈر، لپ اسٹک والی لڑکیوں سے کتنی نفرت ہے!

اچھا اور دوسری بات یہ ہے کہ اس آدمی نے کوئی ذرا سی بھی بدتمیزی کی تو ہم فوراً استعفا دیں گے۔ یہ طے کر کے ان کو یک گونہ سکون ہوا اور وہ کھانے کے برتن سمیٹ کر باورچی خانے کی سمت چلی گئیں۔

سیّد اختر علی کا کمرہ جمشید کی کوٹھی کی دوسری منزل پر تھا جہاں وہ مسہری پر دن بھر چپ چاپ لیٹے رہتے۔ ان کی بیوی سینے ٹوریم سے صحت یاب ہو کر آچکی تھیں۔ مگر ان سے شوہر کی ملاقات کم ہوتی۔ سیّد اختر علی کی زندگی میں پہلی بار آرام، آسائش اور سکون نصیب ہوا تھا۔ وہ پیٹ بھر کر اچھے سے اچھا کھانا کھاتے اور سوتے رہتے۔ ایک ملازم محض ان کی خدمت پر مامور تھا ـــــ مکمل اطمینان اور سکون کی وجہ سے ان کی دماغی حالت رفتہ رفتہ نارمل ہونے لگی۔ اور جب ان کے دماغ نے دوبارہ باقاعدگی سے کام کرنا شروع کیا تو وہ اس مسلسل بے کاری سے اکتا گئے ـــــ "ابّا ـــــ!" جمشید نے ان سے کہا، جس کا بیسیوں نارمل اور "اب نارمل" ہر طرح کے انسانوں سے سابقہ پڑتا تھا اور جو اچھا خاصا ماہر نفسیات ہو چکا تھا ـــــ "کمپنی

لا کی کتابوں پر ایک نظر ڈال لیا کیجیے۔ آپ کی قانون دانی میری فرم کے کام آئے گی ــــ"
چنانچہ سیّد اختر علی بے حد ذوق و شوق سے قانون میں کھو گئے۔ تقریباً اٹھارہ سال بعد انھوں نے اپنے ایل۔ ایل۔ بی کے علم کو دوبارہ بروئے کار لانا شروع کیا۔ کبھی کبھی وہ جمشید کے دفتر بھی جانے لگے اور اس کے بعد آہستہ آہستہ بیٹے کے کاروباری معاملات میں گھل مل گئے۔

ثریا کراچی پہنچ کر ناظم آباد میں اپنی ایک سہیلی کے ہاں اتری جو چند برس قبل ڈھاکہ اسکول میں اسٹاف پر اس کے ساتھ رہ چکی تھی۔ اس نے دبی دبی زبان سے سلمان کے متعلق پوچھ گچھ شروع کی۔ مگر جن لوگوں سے اس نے استفسار کیا، انھوں نے اسے ذرا عجیب سی اور مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ چند روز بعد اسے پتہ چلا کہ سلمان کو کراچی سے بہت دور کسی نامعلوم جگہ پر ایک نامعلوم مدت کے لیے منتقل کر دیا گیا ہے۔
اس نے چھوٹی بٹیا کی تلاش شروع کی۔ سلمان نے اپنے خطوں میں احتیاط کی وجہ سے کبھی چھوٹی بٹیا کا تذکرہ نہ کیا تھا۔ نہ کبھی ان کا پتا تحریر کیا تھا۔ اتنے بڑے شہر میں چھوٹی بٹیا جیسی گمنام اور مختصر ہستی کو ڈھونڈنا آسان نہیں تھا لیکن ایک روز ثریا کو معلوم ہوا کہ وہ بھی اب کراچی میں نہیں ہیں اور کسی غیر معروف دور افتادہ اسکول میں کام کر رہی ہیں۔ ان کا پتا بھی کسی کو معلوم نہ تھا۔ ثریا خاصی مشہور آرٹسٹ تھی۔ اسے ایک گرلز کالج میں آرٹ کی لکچرر شپ مل گئی۔
اسٹاف کی چار پانچ لڑکیوں نے ناظم آباد اور پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس میں تین تین سو چار چار سو گز کے پلاٹ خرید لیے تھے اور ان پر اپنے مکان بنوا رہی تھیں۔ انھوں نے ثریا سے اصرار کیا۔ کراچی میں مکان کرائے پر لے کر رہو گی تو دیوالہ نکل جائے گا، تم بھی قرضہ لے کر اپنا مکان تعمیر کروالو۔ ثریا نے "سوسائٹی" میں چار سو گز زمین قسطوں پر خریدی ــــ مکان کی تعمیر کے لیے قرضہ لیا اور چھ مہینے میں بیس ہزار کے صرفے سے اس کی خوبصورت کاٹج تیار ہو گئی۔ بوٹا بیگم نے اس کا باورچی خانہ

اپنی پسند کا بنوایا۔ چونکہ دونوں ماں بیٹیاں سمندری راستے سے مشرقی پاکستان سے آئی تھیں، بوتا بیگم ڈھاکے سے باورچی خانے کا رتی رتی سامان، پتیلیاں، کرچھے، ڈوئیاں، توا، چمٹا، سل بٹہ، ہاون دستہ، ایک بڑی سی بوری میں بھر کے ساتھ لیتی آئی تھیں۔ لیکن فرنیچر خریدنے کے لیے ثریا کے پاس پیسہ نہیں بچا تھا۔ وہ اپنی ساری تصویریں ڈھاکے سے لے آئی تھی۔ مگر ابھی وہ ان آرٹسٹوں میں نہیں تھی جن کی تصاویر دھڑا دھڑ فروخت ہوتی ہیں۔ یوں بھی کراچی میں پینٹنگز کے خریدار بہت زیادہ نہیں تھے۔ اس نے ناظم آباد والی سہیلی سے ادھار لے کر دو سکنڈ ہینڈ کرسیاں، دو میزیں اور دو نواڑی پلنگ خریدے۔ غسل خانے کی چوکی، ایک اسٹول، بوتا بیگم کے لیے نماز کا چھوٹا سا تخت اور ایک پیڑھی ناظم آباد والی سہیلی نے اسے مستعار دی تھی۔

بوتا بیگم مدتوں پہلے جب محمد گنج میں رہتی تھیں تو ڈولی میں بیٹھ کر نکلتی تھیں۔ قصر سلمان میں بھی انھوں نے اپنا پردہ قائم رکھا۔ کلکٹر صاحب سے ان کا کانا پردہ رہا۔ پرانے کٹڑے کے مکان میں البتہ وہ ثریا کے تین چار دوستوں کے سامنے آگئیں۔ وہ سب انھیں بڑے پیار سے "لماں ـــــ لماں" کہتے اور کرید کرید کر بے حد دلچسپی سے ان سے گاؤں اور گڑھی کے قصے سنا کرتے تھے۔ ڈھاکے آکر بوتا بیگم نے کبھی کبھی ساری پہننا شروع کر دی، گو برقع ترک نہ کیا مگر کراچی میدانِ حشر تھا۔ یہاں ان کا پردہ زیادہ عرصہ نہ چل سکتا تھا۔ کاٹج انھوں نے اپنی نگرانی میں بنوائی، اس لیے ٹھیکیدار اور راج مزدوروں کے سامنے آنا پڑا۔ اس کے بعد گھر جمانے کی ساری بھاگ دوڑ انھوں نے خود کی۔ انھوں نے برقع اتارا اور بسوں اور سائیکل رکشاؤں میں بیٹھ کر مختلف کاموں کے لیے سارے شہر کے چکر لگانے شروع کیے۔ پڑوس کی کوٹھیوں کی "یو۔ پی والی" بیبیوں سے ان کی ملاقات ہو گئی۔ اب وہ بیگم حسین کہلاتیں اور ساری پہنے بڑی متانت کے ساتھ آنچل سے سر ڈھکے، براؤن پلاسٹک کا بیگ اور گلابی پلاسٹک کا جالی دار تھیلا ہاتھ میں سنبھالے، سائیکل رکشا پر بیٹھی بوری بازار جاتی نظر آتیں۔

ثریا دن بھر اپنی مصروفیتوں میں لگی رہتی اور سلمان کو بھلائے رکھنے کی کوشش کرتی۔ رات کے سناٹے میں سلمان کی فکر اور یاد اسے کھا جاتی۔ مگر کتابوں،

رسالوں، سیاست، دنیا کی ہر چیز کے ساتھ ساتھ اپنی مصوری سے سلمان کی یاد سب سے زیادہ وابستہ تھی۔

ان دنوں اسے پیسوں کی بہت سخت ضرورت تھی۔ تنخواہ کا زیادہ حصہ زمین اور مکان کے قرضے کی قسطوں میں کٹ جاتا۔ بوٹا بیگم کا دمے کا پرانا مرض عود کر آیا تھا۔ اس کا علاج ہو رہا تھا۔ اس کے پاس نئے کپڑے بھی نہیں تھے اور وہ ڈھاکے میں خریدی ہوئی ساریوں ہی سے کام چلا رہی تھی۔ وہ تصویر بناتے وقت بھی ننانوے کے پھیر میں پڑی رہتی۔

ایک روز وہ ڈھنڈار کمرے میں ایزل کے سامنے کھڑی اپنی تازہ تصویر مکمل کر رہی تھی کہ باہر ایک چمکیلی شیورلے آن کر رُکی اور تنگ موریوں کے سلیکس میں ملبوس ایک بے حد اسمارٹ لڑکی اندر آئی۔ اس کے ساتھ دو امریکن خواتین تھیں۔

"میں عالیہ سیّد ہوں ــــــ!" لڑکی نے کہا ــــــ "آپ کا پتا مجھے آپ کے کالج سے معلوم ہوا۔ یہ میری دوستیں کچھ پاکستانی پینٹنگز خریدنا چاہتی ہیں۔"

نوواردوں نے چاروں طرف دیکھا اور بیٹھنے کو کوئی چیز نہ ملی تو فرش پر گھٹنے ٹیک کر تصاویر دیکھنے لگیں۔ دونوں سکنڈ ہینڈ کرسیاں پچھلے برآمدے میں رکھی تھیں۔ ان پر بوٹا بیگم نے کپڑے دھو کر پھیلا دیے تھے۔ اسٹول باورچی خانے میں تھا ثریا کو اس وقت شدت کی کوفت ہوئی ــــــ تصویروں کے خریداروں کو بٹھانے کے لیے کمرے میں ایک صوفہ سیٹ اشد ضروری تھا۔

امریکن عورتوں نے تین تین سو روپے میں سلہٹ کے دو مناظر فوراً خرید لیے۔ ثریا نے عالیہ سیّد کا شکریہ ادا کیا۔ عالیہ سیّد نے اسے اپنا ٹیلی فون نمبر دیا اور اسے بتایا کہ اسے اتنی بڑی آرٹسٹ سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے ثریا کو اپنے گھر مدعو بھی کیا۔

اسی روز شہر جا کر ثریا نے ایک صوفہ سیٹ، ایک چھوٹا سا بک شیلف اور ایک ٹیبل لیمپ خریدا۔ اور یہ سامان بڑے کمرے میں سجا کر سوچنے لگی کہ اگر ایک خوش رنگ سا قالین اور پردے بھی ہوں تو کمرہ جگمگا اٹھے۔

لیکن یہ فرنیچر خریدنے کے لیے اس نے پچاس روپے گھر کے خرچ میں سے بھی ڈال دیے تھے اور ہر مہینے قرضہ بڑھتا جا رہا تھا۔

چند روز بعد اسے معلوم ہوا کہ ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں میں آرٹسٹوں کو بہت اچھی تنخواہیں ملتی ہیں۔ اسے عالیہ سیّد کا خیال آیا جو بہت بارسوخ معلوم ہوتی تھی۔ اس نے کالج سے اسے فون کیا۔

دوسرے سرے پر فون کا ریسیور عالیہ کے بھائی جمشید علی سیّد نے اٹھایا اور جب اسے معلوم ہوا کہ مشہور فن کار ثریا حسین بات کر رہی ہیں تو اس نے کہا ـــــ "کمال ہو گیا ـــــ ! مجھ سے عالیہ نے کل ہی آپ کا ذکر کیا تھا۔ میرے چند امریکن دوست بھی تصویریں خریدنا چاہتے ہیں۔ کسی روز آپ میرے ساتھ لنچ کھانا پسند کریں گی ـــــ؟"

چنانچہ اتوار کے روز ثریا حسین موٹر رکشا میں بیٹھ کر کراچی جم خانہ گئی ـــــ جمشید ٹینس کورٹ کے رخ والے بڑے کمرے میں اس کا منتظر تھا۔ تھوڑی دیر میں ٹینس کھیل کر عالیہ بھی آ گئی۔

باتوں باتوں میں عالیہ نے بڑے بے تکلف اور دوستانہ لہجے میں اس سے پوچھا ـــــ

"ثریا ـــــ تم تو ریڈ ہونا ـــــ ؟"

"ریڈ ـــــ ؟" ثریا چونک پڑی اور ذرا گھبرا کر اس نے کہا ـــــ "نہیں تو ـــــ کیوں ـــــ ؟"

"ارے کچھ نہیں ـــــ میں نے سنا تھا ـــــ" عالیہ نے بے پروائی سے کہا۔

جمشید زور سے ہنسا ـــــ کالج کے زمانے میں رہی ہوں گی ـــــ "

لیکن ثریا کی گھبراہٹ دیکھ کر اس نے سنجیدگی سے کہا ـــــ مس حسین آپ کے لیے کسی بھی ایڈورٹائزنگ فرم میں جگہ نکل سکتی ہے۔ اس کی فکر نہ کیجیے ـــــ مگر اپنے خیالات ـــــ اگر وہ اس قسم کے ہیں ـــــ تو ذرا ان کو ـــــ میرا مطلب

ہے ــــــ ان کا اظہار نہ کیجیے گا ــــــ علاوہ ازیں، زیادہ تر امریکن ٹورسٹ ہی ہمارے مصوروں کی تصاویر خریدتے ہیں اور بہت اچھے دام دیتے ہیں۔ اور میرا مطلب ہے آپ کی تصویریں امریکنوں کے ہاتھ خوب بک سکتی ہیں اگر ــــــ ان کو یہ خیال نہ ہو جائے کہ آپ یعنی کہ ــــــ"

وہ کھوکھلی سی ہنسی ہنسی۔ عالیہ کو کہیں اور جانا تھا۔ وہ ان دونوں کو لنچ کھاتا چھوڑ کر باہر چلی گئی۔

اگلے مہینوں میں ثریا کی کئی تصویریں عالیہ اور جمشید کے ذریعہ بک گئیں۔ اس نے نشست کے کمرے کے لیے کھدر کے خوبصورت پردے خریدے جن پر موہن جوداڑو کے نقش و نگار چھپے تھے۔ رنگین جُوٹ کی بڑی آرٹسٹک سی چٹائی خریدی اور ٹیلی فون لگوانے کی درخواست دے دی۔ اس کے آیندہ مہینے میں اس کی ایک بڑی تصویر خود جمشید نے اپنی دفتر کے لیے سات سو روپے میں خریدی اور ایک اور تصویر کے لیے ایک امریکن سیاح نے پورے ایک ہزار روپے دیے۔ ثریا نے اس مرتبہ ایک چھوٹا سا فریجڈیر بھی خرید لیا۔ کھانے کے کمرے کا فرنیچر اور اپنی سنگھار میز اس نے کچھ عرصہ بعد سینٹرل جیل سے بہت واجبی قیمت پر بنوالی۔ ٹیلی فون بھی لگ گیا اور اب اس کا کاٹج منہ سے بولنے لگا۔ بڑے سے بڑا آدمی اس سے ملنے آجائے اسے کوفت نہیں ہوتی تھی۔

لیکن اس کا خرچ بڑھتا جارہا تھا۔ ٹیلی فون کا بل، بوٹا بیگم کے ڈاکٹر کا بل، دکانوں کے بل۔ کالج جانے کے لیے اسے روزانہ ایک نئی ساری چاہیے تھی۔ وہ ایک ہی ساری کلاس میں دو دن نہیں پہن سکتی تھی۔ اس کی طالبات ایک سے ایک فیشن ایبل تھیں۔ اس کا حلقۂ احباب وسیع ہوتا جارہا تھا۔ روز شام کو کہیں نہ کہیں باہر جانا ہوتا تھا اور یہاں کے فیشن ایبل ماحول کے مطابق معقول ساریاں درکار تھیں۔ ڈھاکے میں تو چھے سات سوتی ساریوں میں سارا سال گزر جاتا تھا ــــــ اور یوں بھی وہ ایک "شخصیت" میں تبدیل ہو چکی تھی اور معمولی کپڑے پہن کر ادھر ادھر نہ گھوم سکتی تھی۔ اس کا معیار زندگی روز بروز اونچا اور مہنگا ہوتا چلا گیا۔ لیکن خوش قسمتی سے ایک

ایڈورٹائزنگ فرم میں نو سو روپے ماہوار کی ملازمت مل گئی۔ یہ ایجنسی جمشید کے کاروبار کی ساری پبلسٹی سنبھالتی تھی۔ اس معقول مشاہرے کی وجہ سے ثریا کی بیشتر مالی الجھنیں حل ہو گئیں۔

اس ایجنسی میں ابھی اس نے سال بھر ہی کام کیا ہوگا کہ ایک بے حد نفیس اے۔ کالرشپ اسے پیش کیا گیا۔ اس نے بوتا بیگم کو اپنی سہیلی کے وہاں ناظم آباد منتقل کیا۔ کاٹج چار سو روپے ماہوار کرائے پر اٹھادی اور دو سال کے لیے پیرس چلی گئی۔ مارچ ۶۱ء میں وہ کراچی واپس آئی اور لوٹتے میں جرمنی سے اپنی لیے ایک فوکس ویگن بھی خریدتی لائی ـــــ !

چھوٹی بٹیا کے تقرر کو ابھی ایک مہینہ ہی گزرا تھا کہ بوس نے بیچ لکشری میں ایک بہت بڑی پارٹی دی اور اپنی سوشل سکریٹری سے ڈکٹافون پر کہا کہ وہ سات بجے شام کو تیار رہے۔ وہ خود آکر اسے پک اپ کرلیں گے۔

چھوٹی بٹیا نے پہلی تنخواہ ملنے پر الفنسٹن اسٹریٹ سے ایک انڈین ساری اصل سے دوگنی قیمت پر خریدلی تھی اور دفتر میں مس ڈی سوزا نے اصرار کیا تھا کہ کم از کم شام کے وقت میک اَپ کرنا بہت لازمی ہے ورنہ چہرہ پھیکا پھیکا اور بے جان لگتا ہے۔ چنانچہ چھوٹی بٹیا نے ایک ہلکے رنگ کا لپ اسٹک بھی خریدلیا تھا۔

اندھیرا پڑ گیا تھا اور وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی میک اَپ کررہی تھیں۔ وہ کھڑکی ہمیشہ بند رکھتی تھیں کیونکہ اس میں سے گلی کا سامنا ہوتا تھا ـــــ اس وقت انھوں نے اس کا ایک پٹ کھول کر آئینہ کھڑکی کی گرد آلود جالی میں اٹکا دیا تھا اور پلنگ کے کنارے بیٹھی ناخنوں پر کیوٹکس لگارہی تھیں

چہرے پر فاؤنڈیشن کریم ملتے ملتے یک لخت ان کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ انھیں دفعتاً یہ احساس ہوا کہ آج وہ پہلی مرتبہ اپنی اس ڈیوٹی پر جارہی تھیں جس کے لیے ان کو ملازم رکھا گیا تھا۔ انھیں بوس کے غیر ملکی دوستوں کو "انٹرٹین" کرنا تھا۔ وہ اس پارٹی کی "ہوسٹس" تھیں اور انھیں لامحالہ بوس کی "مسٹریس" بھی سمجھا جائے گا۔ "اللہ میاں ـــــ اللہ میاں ـــــ ہم مر کیوں نہیں جاتے ـــــ ہم

____ "انھوں نے نقاہت سے دیوار کا سہارا لیا ____ یا اللہ ہمیں موت کیوں نہیں آجاتی ____"

باہر ایک سرخ رنگ کی طویل کرائسلر آکر رکی اور بڑا دبیز سا ہارن بجا۔ انھوں نے جلدی سے کھڑکی بند کی۔ لپ اسٹک لگایا اور بیگ اٹھا کر دوسرے کمرے میں گئیں۔

"ماما ____ ماما! ہم پارٹی میں جارہے ہیں۔ رات کو دس گیارہ بجے تک لوٹیں گے۔"

"اچھا ____!"

برآمدے کے بالکل برابر کار کھڑی کر کے جمشید اسٹیرنگ وہیل پر بازو رکھے الٰہی بخش کولونی کے اُداس ماحول کو دیکھ رہا تھا جسے جھٹپٹے کی نیم تاریکی نے زیادہ المناک بنادیا تھا۔ 'دنیا میں زیادہ تر انسان کس قدر بے رنگ زندگیاں گزارتے ہیں'۔ اس نے سوچا ____ اتنے میں مس مرزا باہر نکلیں۔اس نے دروازہ کھولا اور اس کے برابر آبیٹھیں۔

کرائسلر گلیوں کی دھول اور کیچڑ اور گڈھوں پر سے نہایت وقار کے ساتھ گزر کر باہر کی سڑک پر آگئی۔ جمشید نے مڑ کر اپنی دلکش سکریٹری کو دیکھا اور مسکرا کر اخلاق سے دریافت کیا ____

"سو ____ ہاؤ آر یو دس ایوننگ مس مرزا ____؟"

"فائن ____ تھینک یو ____!"

کار اب چوراہے کے بھیڑ بھڑکے کو چیرتی ہوئی نکل رہی تھی ____ گھڑ گھڑ کرتی بسیں دھواں چھوڑتیں ایک ایک کر کے برابر کے میدان میں جا کر کھڑی ہو رہی تھیں۔لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ دفتروں سے لوٹ رہے تھے۔ حلوائیوں اور چائے والوں کی دکانیں تیز نیون لائٹس سے چمک رہی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے مکانوں کے برآمدوں پر جافریاں چڑھی تھیں اور ناموں کی چھوٹی چھوٹی تختیاں لگی تھیں۔ ان سب ناموں کے پیچھے کتنی کہانیاں چھپی تھیں۔ دیواروں پر بڑے بڑے حروف میں

ہومیو پیتھک ڈاکٹروں، پانی بجلی اور بھاپ کے اصل جرمنی علاج اور پرائیویٹ کالجوں کے اشتہار لکھے ہوئے تھے۔

جمشید نے ایک گہرا سانس لیا اور پھر پہلو میں بیٹھی ہوئی لڑکی پر نظر ڈالی۔ وہ اپنے اسٹاف کے دکھ سکھ میں ذاتی دلچسپی لیتا تھا اور ان سے بڑی دردمندی سے پیش آتا تھا۔

"آپ کو دفتر کا کام کیسا لگ رہا ہے مس مرزا ــــــ ؟"

"اِٹس آل رائٹ" ــــــ جواب ملا۔

اب کرائسلر سینٹرل جیل کی دیوار کے نیچے سے گزر رہی تھی۔ دفعتاً جمشید نے دیکھا کہ اس کی سکریٹری کا رنگ پیلا پڑ گیا اور وہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں میچ کر آنسو پینے کی کوشش کر رہی ہے!

"مس مرزا ــــــ مس مرزا ــــــ کیا بات ہے؟" اس نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

"کچھ نہیں ــــــ" چھوٹی بٹیا نے گھبرا کر چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"کیا ہوا ــــــ بتلائیے تو ــــــ !"

"کچھ بھی تو نہیں ــــــ"

وہ خاموش ہو گیا ــــــ بہت شریف لڑکی ہے۔ مگر بے حد نروس طبیعت کی مالک ہے۔ خیر ٹھیک ہو جائے گی۔

"اگر آپ پارٹی میں بھی اسی طرح رہیں تو میری بزنس ہو چکی"۔ کچھ دیر بعد جمشید نے ذرا خوش دلی کی سعی کرتے ہوئے کہا۔

وہ دل پر جبر کر کے اخلاقاً ہنسی۔ جمشید نے سگریٹ جلایا۔

"آپ اسموک نہیں کرتیں ــــــ ؟"

"جی نہیں ــــــ !"

اس لڑکی کے بے بس سے وقار نے اسے اتنا مرعوب کر دیا کہ مزید ذاتی سوال کرنے کی اسے ہمت نہ پڑی۔ اس نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔

پارٹی کے اختتام پر جمشید اپنی سکریٹری کے قریب آیا اور بڑی گرم جوشی اور طمانیت سے اس کا چھوٹا سا سفید ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"ـــــ مس مرزا! ـــــ آپ تو فرنچ بولنا بھی جانتی ہیں۔ چھپی رستم نکلیں آپ تو ـــــ آپ نے اتنی خوبصورتی سے میزبانی کے فرائض انجام دیے ـــــ یہ لوگ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ اگر اس ملک میں اتنی چارمنگ، اور پرفیکٹ سکریٹریز ہوتی ہیں تو ہم اپنا سارا کاروبار یہاں منتقل کرنے کو تیار ہیں۔"

"اب ہمیں گھر پہنچا دیجیے ـــــ!"

"یقیناً ـــــ لیکن مس مرزا ـــــ آپ عموماً اس قدر خاموش رہتی ہیں اور آج شام اتنی ڈپیریسڈ معلوم ہو رہی تھیں لیکن مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے پارٹی انجوائے کی۔ آج میں نے آپ کو پہلی مرتبہ ہنستے ہوئے دیکھا۔ اور آپ نے شیری چکھنے میں اتنا تکلف کیوں کیا؟ پڑھی لکھی لڑکی ہو کر اتنی دقیانوسیت! ـــــ خوش رہیے ـــــ زندگی سے جی بھر کر محظوظ ہوجیے۔ لوگ اس دنیا میں بار بار پیدا نہ ہوں گے ـــــ ہنسیے ـــــ ہنسیے ـــــ ڈیم اٹ ـــــ میں نے بہت آپ جناب کر لیا ـــــ تم میری سکریٹری ہو۔ میں تمھیں صرف سلمیٰ کہوں گا۔ اپنا یہ اسکول مسٹریس کا ذہنی لبادہ اتارو ـــــ اور یہ اولڈ میڈ والی ذہنیت اختیار کی تو یاد رکھو واقعی ساری عمر اولڈ میڈ ہی رہو گی ـــــ اور یہ بڑی سخت ٹریجڈی ہو گی۔ جوانی کی مسرتوں کا تم پر بہت زیادہ حق ہے ـــــ!"

جمشید کی آنکھوں میں ہلکی سی سرخی تھی۔

رات کو جمشید علی گھر واپس پہنچا تو شراب کی مدھم سرور کی لہروں پر تیرتا ہوا سوچ رہا تھا کہ گو اس لڑکی کے خاندان کا کچھ پتا نشان معلوم نہیں مگر ہے بڑی پیاری۔ اور انگریزی بالکل میموں والی بولتی ہے، ممکن ہے اس کی ماں انگریز ہی ہو ـــــ بہترین بیوی ثابت ہو گی ـــــ خاموش طبیعت محنتی اور خوش اخلاق۔ مگر رہتی ہے کولونی

میں status کا بڑا پرابلم ہے، وہ برات لے کر کولونی کس طرح جائے گا ـــــ ؟

لیکن کپڑے تبدیل کر کے پلنگ پر لیٹے وقت جب اس کا سرور تھوڑا زائل ہوا تو اس نے سوچا ـــــ لاحول ولا قوۃ میں یہ کیا بکواس سوچ رہا ہوں ـــــ کیسی شادی اور کس کی شادی ـــــ ؟ میں اس لونڈی کو groom کروں گا۔ بہترین contact woman ثابت ہو گی۔ ایک سے ایک بڑا گھاگ اس کی بھولی بھالی صورت پر ریشہ خطمی ہو کر سارے کاروباری راز اگل دے گا۔ لاکھوں کے معاملات منٹوں میں طے ہو جائیں گے۔

اس نے پلنگ پر لیٹ کر ٹیبل لیمپ بجھادیا اور سگریٹ جلایا۔

What a lucky dog I am, what a lucky dog

اس نے دل میں کہا۔

برابر کے ایک کمرے میں سیّد اختر علی چند ملاقاتیوں سے کلیم کے متعلق تبادلۂ خیالات کر رہے تھے۔

"آپ نے کتنے کا کلیم داخل کیا ہے وکیل صاحب؟"

"صرف تین لاکھ کا ـــــ "سید اختر علی کی آواز آئی۔

"آپ کی زرعی جائیداد بھی تو ہو گی؟"

"جی ہاں! مگر میرے بھائی صاحب ابھی بھارت ہی میں ہیں" ـــــ سید اختر علی نے جواب دیا ـــــ "وہ ابھی تک وہیں پھنسے ہوئے ہیں۔ بہت لکھا کہ یہاں آجایئے مگر نہیں مانتے۔ میں نے تو اپنی کانپور کی کوٹھی کا کلیم بھی داخل کر دیا ہے فی الحال۔ منظور ہونے پر بھی اس کا چالیس فیصد ہی ملے گا۔ مگر صبر و شکر کر کے وہی قبول کرلیں گے ـــــ کیا کیا جائے؟ یہاں تو ہر طرف لوٹ مچی ہوئی ہے۔ آبادکاری کے محکمے میں ذرا بھی انصاف نہیں ـــــ یہ ملک تو بالکل اندھیر نگری بنا ہوا ہے ـــــ !"

"بالکل بجا فرمایا آپ نے وکیل صاحب!"

جمشید کو پیاس محسوس ہوئی۔ اس نے روشنی جلائی۔ اٹھ کر الماری میں سے وہسکی کی بوتل اور سوڈا نکالا اور ایک گلاس بھر کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس کے باپ کی آواز اس کے کانوں میں آتی رہی۔ اب وہ کہہ رہے تھے ــــــ "اب یہی دیکھیے۔ جمشید میاں نے دو ہزار گز زمین سوسائٹی میں لے کر دی تھی۔اس پر کوٹھی کی تعمیر شروع کروائی۔ مگر سیمنٹ اور لوہا سب بلیک میں چلا گیا۔اب تک ساڑھے تین لاکھ روپیہ اس پر خرچ ہو چکا ہے مگر تعمیر ختم نہیں ہوئی ــــــ "

جمشید نے گلاس ختم کیا اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ دفعتاً ایک بھیانک انکشاف اس کے ذہن کے دھندلکے میں کوندا ــــــ اپنے خدا پرست، فقیر منش، توکل پسند باپ کو، اس شخص کو جو ایک زمانے میں سید مظہر علی اور گوسائیں اور مولوی محمد حسن کے محدود و معصوم دائرے کا ایک شخص تھا۔ اس بھولے سیدھے کو جھوٹا، بد دیانت، ریاکار اور جعل ساز اس نے خود بنا دیا تھا ــــــ

Oh, what a dog I am what a dog, what a dog

اس نے زور سے تکیے پر مکا مارا اور کمبل میں منہ چھپا کر سو گیا۔

منصور احمد ثریا سے پیرس میں ملا تھا۔ وہ ایک ہونہار، محنتی اور بے انتہا قابل جرنلسٹ تھا اور کئی سال امریکہ میں پبلک ریلیشنز کی تکنیک سیکھنے کے بعد حال ہی میں کراچی واپس آیا تھا اور ان دنوں ایک انگریزی روزنامے سے منسلک تھا۔ شہر کے کامیاب اور بااثر صحافیوں میں اس کا شمار کیا جا رہا تھا۔

اس وقت وہ پریس کلب میں بیٹھا ثریا کی ہونے والی نمائش کے متعلق ایک رائٹ اپ لکھ رہا تھا۔ ثریا نے پریس کلب کو اپنی ایک بڑی پینٹنگ تحفے میں دی تھی اور منصور نے اسے فون کیا تھا کہ وہ خود پریس کلب آ کر تصویر کو اپنی مرضی کے مطابق دیوار پر آویزاں کرے اور کھانا بھی وہیں کھائے۔ اتوار کی سہ پہر تھی۔ تین چار صحافی ہال کے ایک کونے میں بڑی سنجیدگی سے شطرنج میں غلطاں و پیچاں تھے۔ منصور نے مضمون شروع کرنے کے لیے کاغذ ٹائپ رائٹر پر چڑھایا کہ دفعتاً اسے یاد آیا کہ اسے اپنے اخبار کے لیے بھارت کے متعلق ایک اہم مضمون تیار کر کے جلد از جلد کاپی فائل

کرنی ہے۔ وہ فوراً اسی میز کی طرف گیا جس پر رسالے اور اخبار بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے سرعت سے بھارت کے تازہ انگریزی اور اردو اخباروں کی ورق گردانی شروع کی۔ شمالی بھارت کے سیاسی کوائف کا جائزہ لینے کے لیے اس نے اتر پردیش کا ایک نسبتاً غیر معروف سا اردو اخبار اٹھالیا۔ اس میں زیادہ تر ملک کے مختلف حصوں میں ہونے والے عرسوں کی اطلاعات اور صوبے کے اسلامی اور عربی مدارس اور اوقاف کے انتظامات کے متعلق خبریں درج تھیں۔ اضلاع کی خبروں کے کالم میں ایک چھوٹی سی سرخی تھی ـــــ

شاہ منور علی کا وصال

موضع محمد گنج ضلع سلطان پور (اودھ) کی درگاہ شریف کے سجادہ نشین مخدوم زادہ شاہ منور علیؒ نور مرقدہٗ ہندوستان جنت نشان کی پاک سرزمین (پاک سرزمین؟ منصور احمد نے دل میں کہا "پاک سرزمین صرف پاکستان کی ہے ـــــ) کے ان عارفین کاملین اور بزرگان گرامی میں سے تھے جو ـــــ

منصور احمد نے اکتاکر آگے نظریں دوڑائیں۔ اسی کالم میں ایک اور غیر دلچسپ سی خبر تھی ـــــ جناب نوروز حسین خاں آف پاربتی پور (ضلع سلطان پور) نے جو ودھان سبھا میں سوتنتر پارٹی کے ممبر ہیں۔ کل ـــــ

منصور احمد نے اور آگے پڑھا ـــــ جہاں وزراء پر نکتہ چینی، بلیک مارکیٹ، رشوت ستانی، ذات بندی، صوبہ پرستی اور فرقہ پرستی کے انسداد کے مطالبے اور دیگر متعلقہ معاملات کے کوائف چھپے تھے۔ ایک سرخی پر اس کی نظر ٹھہر گئی جو اہم ہو سکتی تھی ـــــ کامریڈ آنند موہن گھوش کا لوک سبھا میں سوال ـــــ نئی دہلی ۱۲ مئی ـــــ لوک سبھا میں بحث کے دوران کمیونسٹ ممبر کامریڈ آنند موہن گھوش نے ـــــ

"ہیلو ـــــ ! کیا ہو رہا ہے ـــــ ؟" ثریا نے پیچھے سے آن کر آواز دی۔

"ہیلو ـــــ ثریا ـــــ !" منصور نے اخبار بند کرتے ہوئے مڑ کر کہا۔

"معاف کرنا مجھے دیر ہو گئی ـــــ !" ثریا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ عابد انصاری بھی تھا جو منصور کے مخالف اخبار میں چیف رپورٹر تھا۔ ان دونوں میں بہت دوستی تھی۔ مگر خبروں کی اسکوپ کے معاملے میں دونوں ایک دوسرے کو چوٹ دینے کی فکر میں رہتے تھے ـــــ "میں عابد کو اپنے میورل دکھانے لے گئی تھی۔ اس میں ایک گھنٹہ لگ گیا" ـــــ ثریا نے کہا۔

"ـــــ جو تم ایرپورٹ پر بنا رہی ہو؟" منصور احمد نے دریافت کیا۔

"نہیں! جمشید ہاؤس کی لاؤنج میں۔" ثریا نے کہا۔

"اور جمشید ہاؤس؟ ـــــ اچھا ـــــ وہ جمشید سید کی نئی کوٹھی ـــــ "

"اس کے لیے بہت سے آرٹسٹ دانت لگائے بیٹھے تھے کیوں کہ جمشید علی پیسے بہت فراخ دلی سے دیتا ہے" ـــــ عابد انصاری نے کہا۔

"میں فوٹوگرافر لے چلوں؟ میورل کی تصویر بھی تمھارے متعلق مضمون کے ساتھ چھپ جائے" ـــــ منصور احمد نے کہا۔

"ابھی رہنے دو ـــــ ابھی اس میں ہاتھی کی سونڈ باقی ہے۔" ثریا نے جواب دیا۔

"ہاؤس وارمنگ کے روز دیکھ لینا۔"

"اچھا ـــــ تو تم نے اس میں بھی مشرقی پاکستان کا موتیف رکھا ہے۔" منصور احمد نے میز پر جھک کر کاغذ پر ایک جملے کا اضافہ کیا۔ پھر اس نے کہا۔

"ثریا! تم کو ماننا پڑے گا کہ تمھاری نمائش کے لیے اس سے بڑھ کر ایڈوانس پبلسٹی نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک مضمون میں اپنے نام سے لکھ رہا ہوں ـــــ چار مضامین اگلے ہفتے تک مختلف ناموں سے پریس میں اور آجائیں گے۔ اور تمھاری نمائش کا کتابچہ بے حد خوبصورت چھپا ہے۔"

" تھینکس ـــــ ہاؤ سویٹ آف یو۔"

"تم دونوں جا کر کھانا منگواؤ۔ میں ایک ضروری نوٹ لکھ کر ابھی آتا ہوں۔"

"جلدی کرنا ـــــ " ثریا نے کھانے کے کمرے کی طرف جاتے

ہوئے کہا۔

منصور احمد نے نہایت سرعت سے بھارت پر نوٹ مکمل کیا اور ٹائپ رائٹر پر دوسرا کاغذ چڑھایا اور تیزی سے ٹائپ کرنا شروع کیا۔

"کراچی کے فنّی حلقوں کے لیے مس ثریا حسین محتاج تعارف نہیں۔ مس حسین نے جو اتر پردیش (بھارت) کے ایک تعلقہ دار کی صاحبزادی ہیں، مسوری کانونٹ میں تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد شانتی نکیتن اور ــــــ

۳

پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس کی ایک اونچی نیچی پتھریلی سڑک پر بے شمار موٹریں کھڑی تھیں اور معزز مہمان اتر اتر کر اندر جا رہے تھے۔ کراچی کے مشہور بزنس مین جمشید علی سید نے اپنی نئی کوٹھی کی "ہاؤس وارمنگ" کی دعوت میں شہر کے تقریباً سبھی اہم لوگوں کو مدعو کیا تھا۔ کوٹھی کی لاؤنج کے طویل دریچے میں سے وسیع اور سرسبز لان کا منظر ایک ٹیکنی کلر سینما اسکوپ پردے کے مانند دکھلائی دے رہا تھا۔ درختوں میں جگمگاتی برقی روشنیاں، قندیلیں، کیاریوں کے خوب صورت پھول۔ گھاس پر بکھرے ہوئے صوفے۔ اشیائے خورد و نوش سے لدی میزوں کی قطاریں۔ سفید کپڑوں میں ملبوس بیرے۔ تپائیوں پر رکھے ہوئے قیمتی سگریٹوں کے ڈبے۔ سفارت خانوں کے افراد۔ نظر فریب ہندوستانی ساریوں میں ملبوس دلفریب پاکستانی بیگمات ــــــ سرسراتے ہوئے ایوننگ گاؤن اور کاک ٹیل ڈریس۔ عطر کی لپٹیں۔ برف کی بالٹیوں میں ڈوبی ہوئی شراب کی بوتلیں۔ ادھر ادھر کھڑے ہوئے جرنلسٹوں کے گروہ۔ کیمرہ سنبھالے چاروں طرف ٹہلتے ہوئے فوٹو گرافر۔ وقتاً فوقتاً کوندتے ہوئے فلیش بلب۔ بڑے بڑے کاروباری۔ جغادری مل اونر۔ اعلیٰ سرکاری عہدے دار۔ کابینہ کے وزیر۔ سفیر اور فرسٹ سکریٹری اور پریس اتاشی اور کمرشل اتاشی ــــــ چبوترے پر ڈانس بینڈ بج رہا تھا اور چند جوڑے رقص میں مشغول تھے۔

شراب پانی کی طرح بہہ رہی تھی۔ کوٹھی کی دوسری منزل پر راک این رول کا شور مچ رہا تھا اور فیریٰ اپنے ہم عمر لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ اودھم مچا رہی تھی۔ نیچے لان میں عالیہ سیّد نہایت بیش قیمت سفید رنگ کی بنارسی ساری میں ملبوس، گلے میں سچے موتیوں کی ایک لڑی پہنے میزبانی کے فرائض انجام دینے میں مصروف تھی۔ سیّد اختر علی سوٹ پہنے ایک کونے میں بیٹھے سگار پی رہے تھے۔ جمشید کے دونوں چھوٹے بھائی امریکہ پلٹ کم عمر لڑکیوں کے ایک گروہ میں کھڑے قہقہے لگا رہے تھے۔

لاؤنج کے اندر چند مہمان دیوار کی سطح پر بنے ہوئے فریسکو پر رائے زنی میں منہمک تھے۔ ثریا جس نے فرانسیسی شیفون کے بڑے بڑے سرخ پھولوں والی ساری پہن رکھی تھی، تصویر کے سرے پر کھڑی مداحوں سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے بال تازہ ترین بی ہائیو اسٹائل میں بنے تھے اور اس نے شنیل فائیو کی خوشبو لگا رکھی تھی اور اس کے بلاؤز کی تراش میں سے اس کی ساری پیٹھ عریاں تھی۔

"مِس حسین میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اب آپ جیمنی رائے کے اثر سے آزاد ہو چکی ہیں ـــــ آپ کے بنائے ہوئے نقوش اور رنگوں میں اب قومی کردار اور قومی طرز کی جھلک نظر آنے لگی ہے" ـــــ پاکستانی آرٹ کے ایک مشہور نقاد نے اس سے کہا۔

"پاکستانی آرٹ کا مستقبل اب صرف ہمارے فن کاروں کی نئی نسل کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کے پیرس پیریڈ کی تصاویر سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ آپ اپنے تہذیبی ورثے کی طرف آ رہی ہیں۔" دوسرے نقاد نے کہا۔

"مثال کے طور پر موسیو ویژیے آپ ہاتھی کی سونڈ ملاحظہ کیجیے ـــــ " فریسکو کے سامنے ایک اور انٹلکچوئیل نے ایک موٹے فرانسیسی کو مخاطب کیا ـــــ "ہاتھی ـــــ" اس نے حلق صاف کر کے مقررانہ انداز میں بات جاری رکھی ـــــ مشرقی پاکستان کے کلچر کا ایک سمبل ہے وہاں کی ندیاں۔ بوٹ مین۔ ہاتھی اور مچھلیاں ـــــ "

"مچھلیاں، کشتیاں اور جوٹ ـــــ" دوسرے انٹلکچوئیل نے اضافہ کیا۔

موٹے فرانسیسی نے جو شکل سے ذرا احمق سا معلوم ہوتا تھا۔ عینک ناک کی پھننگ پر اچھی طرح جمائی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تصویروں کو دیکھا ـــــ "ایسے ہاتھی تو انڈیا میں بھی ہوتے ہیں۔" اس نے حیرت سے کہا۔

"مِس حسین!" ـــــ پہلے انٹلکچوئیل نے کہا ـــــ "موسیو ویژیے کو اپنے شاہکار کی سمبلزم سمجھائیے۔ پاکستان کی تہذیبی روایت کی جڑوں کی تلاش اور مسلمانوں کے اجتماعی فنّی لاشعور کے مظاہر کی معنی آفرینی اور ـــــ"

بیرا شراب کی بوتل اور جام ایک ٹرے میں رکھے ادھر آیا۔ وہ سب جام ہاتھوں میں لے کر فریسکو کے سامنے کھڑے آرٹ پر تبادلۂ خیالات میں مصروف رہے ـــــ

دیوار کی سبز روغنی سطح پر آم کے درخت بے ترتیبی سے آڑے ترچھے کھڑے تھے۔ عقب میں ایک گہری نیلی ندی بہہ رہی تھی۔ سامنے سے ایک ہاتھی گزر رہا تھا جس پر زرد رنگ کی جھولی اور چوکور سا ہودہ تھا۔ اس میں ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ پوری تصویر بنگالی فوک آرٹ کی طرز میں بنائی گئی تھی۔

"ثریا ـــــ!" دوسری طرف سے کسی نے آواز دی ـــــ "تمھیں جمشید ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔"

وہ لاؤنج میں جمع مہمانوں سے معذرت چاہ کر باہر لان میں گئی۔

مقابل کی روش پر سے اس نے ایک سنہرے بالوں والی پستہ قد لڑکی کو آتے دیکھا۔ اس لڑکی نے جھلمل کرتے ستاروں والی آتشیں گلابی ساری پہن رکھی تھی اور بالوں کا بہت اونچا پھیلے ہوئے تاج یا پنکھے کا سا جوڑا بنا رکھا تھا جس کی اونچائی کی وجہ سے اس کے قد میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ پپوٹوں کے ہلکے نیلے روغن اور ہونٹوں کے گہرے گلابی رنگ کے ساتھ اس کا میک اَپ بے حد نفیس اور مکمل تھا۔ وہ لڑکی قریب آ گئی۔

وہ دونوں آمنے سامنے اپنی اپنی جگہ پر منجمد ہو گئیں۔ کئی سکنڈ گزر گئے وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔

"چھوٹی بٹیا ـــــ!" ثریا نے چند لمحوں بعد کہا۔

سلمٰی گم صم آنکھیں پھاڑیں گھاس کو دیکھنے لگی۔

"چھوٹی بٹیا ــــــ !"

وہ خاموش رہی۔

"چھوٹی بٹیا ــــــ آپ ــــــ میں ــــــ "

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"او ہلو ثریا ــــــ !" کسی مہمان نے قریب آ کر گرم جوشی سے کہا ــــــ "لونگ ٹائم نو سی[1] ــــــ تمھیں فون کرتے کرتے عاجز آ گیا۔ ویسے تم رہتی کہاں ہو ــــــ ؟"

"ہاؤسنگ سوسائٹی ــــــ !" ثریا نے اس آواز میں کہا جو اس نے خود نہیں سنی۔ پھر اس نے جواب دہرایا ــــــ "ہاؤسنگ سوسائٹی!"

"اچھا۔ میں کل شام عالیہ کے ساتھ آؤں گا ــــــ " وہ مجمع میں غائب ہو گیا۔

پیچھے سے جمشید نے آ کر ثریا کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کاک ٹیل کا گلاس تھا۔

"جانِ من ــــــ " اس نے ذرا الپک کر کہا ــــــ "ڈھونڈ تھکا ہوں بن کے بن، چھان پھرا گلی گلی ــــــ ! کہاں تھیں ــــــ ؟ ارے تم دونوں ایسی چپ کیوں کھڑی ہو؟ کیا تمھارا ایک دوسرے سے تعارف نہیں ــــــ ؟ ثریا ــــــ دِس اِز سلمٰی مرزا ــــــ مائی موسٹ ایفی شنٹ سوشل پرسنل اینڈ کانفی ڈنشل سکریٹری۔ چلو جانِ من ناچیں ــــــ " اس نے گلاس تپائی پر رکھا اور ثریا کو کھینچتا ہوا چبوترے پر لے گیا۔ وہاں دونوں رقصاں جوڑوں کے بھنور میں غائب ہو گئے۔

ڈانس بینڈ کی دھن تیز ہو گئی۔ سلمٰی قریب کے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کا دل بہت گہرے اندھیرے سمندر میں ڈوب چکا تھا۔ صوفے پر ٹک کر وہ ثریا کو جمشید کے ساتھ ناچتا دیکھتی رہی۔

'ثریا باجی'۔ اس نے دل میں کہا۔ 'بھیا! آپ کے نام کی مالا جپتے جپتے برسوں کی قید کاٹنے چلے گئے۔ جب وہ قیدِ تنہائی کی لمبی مدت کے بعد باہر نکلیں گے ان کے بال

سفید ہوں گے اور وہ بوڑھے ہو چکے ہوں گے۔ لیکن میرے بھیا کبھی بوڑھے نہ ہوں گے ـــــ کبھی ناامید نہ ہوں گے ـــــ کبھی ہار نہ مانیں گے۔ جب کہ آپ نے ثریا باجی ـــــ اتنی آسانی سے ہار مان لی۔ آپ جنھوں نے بھیا کو روشنی دی تھی' دل دیا تھا، ہمت دی تھی' ـــــ اس نے آنکھیں میچ لیں تاکہ اس پارٹی کے منظر کی کسی چیز کو نہ دیکھ سکے۔

"ہیلو ـــــ !" کسی نے پیچھے سے آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، وہ چونکی۔ سامنے ملک التجار پینسٹھ سالہ مسٹر زاویری کھڑے اپنے نقلی دانت نکوس رہے تھے۔ ان دنوں، سلمٰی کی ڈیوٹی تھی کہ ان کو انٹرٹین کرے ـــــ "ارے تم ادھر پاگل کا مافک کائے کو بیٹھا ـــــ ؟ ڈانس نہیں بنائے گا ـــــ ؟" مسٹر زاویری نے کہا۔

"جی نہیں۔ میں اس وقت ڈانس نہیں کروں گی۔" ـــــ سلمٰی نے کپکپاتی آوز میں کہا ـــــ "اس وقت مجھے معاف کیجیے!"

"ارے ارے ـــــ ہم کو بولو ـــــ کیا بات ہے؟ ـــــ طبیعت کھراب ہے تمھارا ـــــ" مسٹر زاویری نے اس سے بے تکلف لہجے میں دریافت کیا جس طرح لوگ اپنی بیویوں سے بات کرتے ہیں۔ سلمٰی لرز اٹھی۔

"اچھا چلو۔ ادھر ٹیبل پہ تمھارا اکھا فرینڈ لوگ ویٹ کرتا ہے ـــــ" وہ کانپتی ہوئی ٹانگوں سے اٹھی ـــــ "ثریا باجی! میں آپ سے کس بات کا شکوہ کر سکتی ہوں۔ میں خود ہار مان چکی ہوں۔"

وہ مسٹر زاویری کے ہمراہ میزوں کی طرف چلی گئی۔ جہاں "بوفے" شروع ہو چکا تھا۔

رقص کے بعد جب ثریا چبوترے سے اتر کر لان میں آئی تو اس نے سلمٰی کو ایک درخت کے نیچے مسٹر زاویری کے ساتھ صوفے پر بیٹھا دیکھا۔ وہ جس انداز سے

Long time no see !

سلمیٰ کو گھور رہے تھے۔ ان کے چہرے پر ثریا کو ڈرگا گنڈ کے نواب سکندر علی خاں عرف نواب بھورے کی آنکھیں نظر آئیں۔

دفعتاً ایک بھیانک دھماکہ ہوا اور سامنے کے اس رنگین سنیما اسکوپ نظارے کے پرخچے اڑ گئے۔ سیاہ، دھواں اور سرخ شرارے ساری فضا میں رقصاں تھے۔ بہت دور ایک مہیب جوالا مکھی نے آگ اگلنا شروع کی۔ گرم گرم دہکتا ہوا لاوا بہتا ہوا سارے میں پھیل گیا۔ آتش فشاں کی گڑگڑاہٹ، زلزلے کے دھماکوں، آرکیسٹرا کے سروں، راک این رول کے شور، قہقہوں اور گلاسوں کی کھنکناہٹ میں سے گزرتی ایک مدھم اداس، خوبصورت آواز ثریا کے کانوں میں گونجی ـــــ "ماضی کی محل سرائیں جل کے راکھ ہوئیں۔ مگر ابھی اس ملبے کی بنیادوں پر دونوں ملکوں میں نئی بورژوازی کے نئے محل کھڑے ہوں گے۔ کل کے جاگیر دار کی جگہ آج کا سرمایہ دار حاصل کرے گا۔ کل کے جاگیر دار کی جگہ آج کا سرمایہ دار۔"

ثریا نے سہم کر آنکھیں بند کر لیں۔ یہ بلجین کٹ گلاس کے فانوسوں سے جگمگاتا، اطالوی معمار کا بنایا ہوا، الٹرا ماڈرن جمشید ہاؤس نہیں تھا، یہ ضلع سلطان پور کے تعلقے ڈرگا گنڈ کی نیم تاریک گڑھی تھی جس میں وہ خود بنتی بیگم قید تھی۔ پھر درگا گنڈ کی گڑھی جمشید ہاؤس میں تبدیل ہو گئی۔ اس میں چھوٹی بٹیا قید تھیں۔ اس نے آنکھیں کھول کر پہچاننے کی کوشش کی۔ سامنے ہری گھاس پر جاپانی قندیلوں کے نیچے کون لوگ ٹہل رہے تھے۔ مسٹر زاویری، مسٹر گھاس لیٹ والا، مسٹر برٹن۔ اس نے آنکھیں بند کیں۔ نواب بھورے۔ میاں نوروز۔ مٹن خاں۔ اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں۔ نواب بھورے۔ میاں نوروز۔ منن خاں۔ ایک بار پھر مسٹر زاویری۔ مسٹر گھاس لیٹ والا۔ اور مسٹر برٹن میں تبدیل ہو گئے۔ اس نے نظریں اوپر اٹھائیں۔ سامنے جمشید کھڑا تھا۔

"جانِ من ـــــ" اس نے سُرور کے عالم میں کہا ـــــ "اس جامِ جمشید کا جام تو پی لو۔ جس کا نام جمشید ہاؤس ہے ـــــ یہ میرا جامِ جہاں نما ہے ـــــ" اس نے ہاتھ سے چاروں طرف اشارہ کر کے کہا ـــــ "یہ میرا ساغرِ جم ہے ـــــ" اس نے گلاس اٹھایا اور دوسرا گلاس ثریا کو دیا۔

"چیرز ——— !"

"چیرز ——— !"

پھر وہ ثریا کی کمر کے گرد ہاتھ ڈال کر اسے ڈرائنگ روم کی سمت لے گیا۔ جس کے ایک گوشے میں بار کے اسٹولوں پر تین چار غیر ملکی اور دیسی بزنس مین چڑھے بیٹھے تھے اور مسٹر پیٹرک سیاہ پتلون، سفید کوٹ پہنے، سیاہ بو نائی لگائے بار مین کے فرائض انجام دے رہا تھا، جمشید ایک اسٹول پر بیٹھ گیا اور ثریا کو نزدیک کے اسٹول پر بٹھا لیا۔

گلاسوں میں تیز شراب انڈیلتے ہوئے جمشید نے ان لوگوں سے کاروباری باتیں شروع کیں۔

"جمشید بھائی! تم ہمارے کو یہ بولو کہ لندن آفس سے کیبل آگیا یا نہیں۔" سیٹھ عیسیٰ بھائی موسیٰ بھائی گھاس لیٹ والا نے جو ابھی ابھی بار پر آئے تھے ذرا عجلت سے اسے مخاطب کیا۔

"ابھی نہیں آیا سیٹھ صاحب ——— "جمشید نے بے پروائی سے جواب دیا اور غیر ملکی تاجر کی طرف مڑا ——— "ہاں تو جارج میں تم کو کیا بتا رہا تھا؟ ہاں! میں نے لندن سے درخواستیں منگوائی تھیں۔ ایک مسٹر ایس۔ ڈی۔ جانسن کا میں نے مانچسٹر آفس میں تقرر کر لیا ہے۔ مسٹر جانسن نے اپنی درخواست میں لکھا ہے کہ وہ انڈین سول سروس میں عرصے تک کلکٹر اور کمشنر وغیرہ رہ چکے ہیں اور برصغیر سے بہت اچھی طرح واقف ہیں۔ یقیناً وہ مانچسٹر برانچ کا کام اچھی طرح سنبھال لیں گے۔ میں اپنی غیر ملکی شاخوں میں ہمیشہ وہاں کے ایسے آدمی ملازم رکھتا ہوں جو برصغیر کے معاملات سے اجنبی نہ ہوں۔

"اپن کے تپاس کا جواب دو جمشید بھائی!" ——— سیٹھ عیسیٰ بھائی موسیٰ بھائی نے دوسرا گلاس چڑھا کر یک لخت بار کی چمکیلی سطح پر زور سے مکا مارا ——— "اپن کا ڈیل سٹیل کیا کہ نہیں!"

اب مسٹر زاویری بھی اندر آکر باتوں میں شریک ہو گئے۔ ثریا اس کاروباری

گفتگو سے اکتا کر اسٹول پر سے اتری۔ دوسرے کونے میں ایک صوفے پر جا بیٹھی۔

دفعتاً بار پر بیٹھے ہوئے لوگوں میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ سیٹھ عیسیٰ بھائی موسیٰ بھائی نے گلاس فرش پر پٹخ کر جمشید کا گلا پکڑ لیا ـــــ "سالا ـــــ تم نے ہم کو پانچ لاکھ کو دھوکا دیا ـــــ ہم تمھارے اوپر کیس چلائیں گا ـــــ"

"شٹ اپ عیسیٰ بھائی یو اولڈ فول ـــــ "جمشید نے گلا چھڑاتے ہوئے جواب دیا۔

"یو شٹ اپ ـــــ یو ڈرٹی بلیک مارکیٹیر ـــــ "سیٹھ گھاس لیٹ والا گرجے۔

"اوہ ـــــ فور گاڈز سیک[1] ـــــ "جارج نے انگلی اٹھا کر اکتائی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم خان برادرز سے ایگریمنٹ کرتا اور ہم سے چار سو بیس کرتا ـــــ ہم سے پانچ لاکھ کا فراڈ کرتا ـــــ ہمارا اچھا بزنس میں لفڑا کرتا ـــــ ہمارے روکڑ میں گول مال کرتا ـــــ ہمارے ساتھ اتنا بڑا گھپلا ڈالیں گا۔ ہم تم پر سوٹ فائل کریں گا ـــــ ہمارا پانچ لاکھ کا نقصان کیا ـــــ سالا موالی ـــــ چور ـــــ بے ایمان" ـــــ سیٹھ عیسیٰ بھائی نے نشے میں دھت ہو کر جمشید کی ناک پر زور کا گھونسہ رسید کیا اور ہاتھا پائی شروع کر دی۔

بار میں بیٹھے ہوئے باقی احباب بھی اس مار پیٹ میں خوشی خوشی شامل ہو گئے۔ چیخ و پکار سن کر سلمیٰ اندر آئی۔ مسٹر پیٹرک نے جلدی سے ڈرائنگ روم کے سارے دروازے اندر سے بند کر دیے۔

ثریا نے ڈرائی مارٹینی کا جام تپائی پر رکھا اور آنکھیں نیم وا کر کے سلمیٰ پر نظر ڈالی ـــــ "ہیوا ے ڈرنک سلمیٰ ڈیر ـــــ!" اس نے کہا۔

مسٹر پیٹرک نے سلمیٰ کے لیے شیری سے جام بھرا۔ وہ ثریا کے پاس صوفے

---

1. Oh, for God's sake

پر بیٹھ گئی!

ہاتھاپائی کرتے ہوئے معزز مہمانوں نے تین چار سر خوشی کے نعرے بلند کیے۔ لیکن سیٹھ عیسیٰ بھائی موسیٰ بھائی پر جنون سوار تھا۔ انھوں نے جمشید کو پیٹ بھر کے گھونسے مارے۔ جمشید قالین پر گر پڑا۔ کئی گلاس جھناکے سے ٹوٹے، جمشید کے چہرے اور ہتھیلیوں میں کرچیں چبھ گئی اور خون نکل آیا ثریا اور سلمیٰ اطمینان سے کونے میں بیٹھی تماشا دیکھتی رہیں۔

باہر چبوترے پر تقریباً سارے مہمان کسی تازہ ترین تیز رفتار جنوبی امریکن رقص میں مصروف تھے اور ڈانس بینڈ کے ڈرم زور زور سے بج رہے تھے۔ چند لمحوں بعد دھن تبدیل ہوئی اور ڈانس بینڈ نے افریقہ کے تاریک جنگلوں کی ایک تیز و تند، وحشی تال ڈرم پر بجانا شروع کی اور رقصاں جوڑے تالیاں بجا بجا کر فرش پر زور زور سے پیر پٹخنے افریقی تال پر تیز تیز چکر کاٹنے اور اچھلنے کودنے لگے۔

اندر ڈرائنگ روم میں سیٹھ عیسیٰ بھائی بنکارا کیے۔ ''جھوٹا ــــــ بے ایمان ــــــ سالا ــــــ چور'' ــــــ مسٹر پیٹرک نے ان کا نشہ اتارنے کے لیے پانی کا پورا جگ ان کے سر پر انڈیل دیا۔ سیٹھ عیسیٰ بھائی موسیٰ بھائی فرش پر لمبے لمبے لیٹ کر ایک سانس میں دہرانے لگے ــــــ ''اکھا پانچ لاکھ روپیا'' ــــــ پانچ لاکھ روپیا ــــــ پانچ لاکھ روپیا ــــــ مسٹر پیٹرک نے بقیہ حضرات کے لیے تازہ گلاس بھرے۔ دفعتاً سیٹھ عیسیٰ بھائی اٹھے اور چالاک بلّی کی سی تیزی کے ساتھ جھپٹ کر جمشید کو پھر دبوچ لیا ــــــ ''چور ــــــ ''وہ اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے دھاڑے۔

''ثریا باجی ــــــ ثریا باجی! مسٹر گھاس لیٹ والے نے چور پکڑا ہے ــــــ '' سلمیٰ نے خوشی کے عالم میں کہا اور نازک سا قہقہہ لگایا۔

جمشید سیٹھ عیسیٰ بھائی کی گرفت سے چھوٹ کر پھر فرش پر گر گیا۔ کچھ دیر کے لیے مکمل سناٹا چھا گیا۔ مسٹر زاویری، سیٹھ گھاس لیٹ والا کو کمرے سے باہر لے گئے۔ جمشید کہنیوں کے بل قالین پر سے اٹھا۔ رومال سے چہرے اور ہاتھوں کا خون

صاف کیا۔ پھر وہ چاروں ہاتھ پیروں کے بل کتے کی طرح چلتا ہوا دونوں لڑکیوں کی طرف آیا۔ وہ بری طرح سسکیاں بھر کے رو رہا تھا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور سلمیٰ پر جھک کر بولا ـــــ "ہم چور نہیں ہیں ـــــ ثریا ـــــ اس کو بتادو ہم چور نہیں ہیں۔ اس کو بتادو جمشید وا چور نہیں ہے!۔"

"یو آر میرلی ویری ڈرنک[1] مسٹر جمشید ـــــ "سلمیٰ نے بیزاری سے چہرہ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

یکایک وہ گانے لگا ـــــ "آگیا لا گی۔ سندر بن جل گیو رے۔"

ثریا نے ایک لمبا سانس لیا اور صوفے سے اٹھی اور سلمیٰ کی مدد سے لے جا کر اسے بڑے صوفے پر لٹا دیا۔ باقی ماندہ مہمان بھی بار سے اٹھ کر جا چکے تھے۔ مسٹر پیٹرک نے جھاڑن سے بار کی تربتر سطح کو پونچھا اور باہر چلا گیا۔

جمشید نے صوفے پر پڑے پڑے ایک اور بہت پرانا تھیٹر کا گیت شروع کر دیا ـــــ

"میں آفت کا پرکالا ہوں
ناچ نچادوں دم بھر میں ـــــ آگ لگادوں دم بھر میں۔
جس کو تاکا اس کو مارا۔ پو بارہ۔ پو بارہ ہیں پو بارہ ـــــ
پو بارہ ہیں پو بارہ ـــــ ہرّے ہپ ہپ ہرّے ہپ ہپ ہپ ہپ ہپ۔"

"شٹ اپ جمشید ـــــ "ثریا نے اسے سختی سے ڈانٹا اور جا کر دریچے کے نیچے رکھے ہوئے دیوان پر بیٹھ گئی۔

"یس سر ـــــ آل رائٹ سر ـــــ !" جمشید نے اٹھ کر سیلوٹ کیا اور پھر دراز ہو گیا۔

مسٹر پیٹرک ڈاک کا پلندہ لے کر اندر آیا ـــــ "سر کیبل آیا ہے۔ شام کی ڈاک میں چڑگانگ کے دو ضروری لیٹر ہیں۔ ذرا دیکھ لیجیے!"

"گیٹ آؤٹ!"

---

[1] You are merely very drunk

"سر ـــــ خان برادرز کا اگریمنٹ ـــــ مسٹر جانسن کا کیبل ـــــ موسٹ ارجنٹ۔" مسٹر پیٹرک نے کہا۔

"جمشید نے صوفے پر کھڑے ہو کر الاپنا شروع کر دیا ـــــ

"یہ سب کو سیر عجائب دکھائی شیریں نے

ادھر تو ہاتھوں میں مہندی لگائی شیریں نے

پھر اس طرف دل کو بکن میں آگ لگی اگیا لاگی سندر بن جل گیورے"

سلمیٰ ایک میز پر چڑھی بیٹھی تھی اور گھٹنوں پر سر رکھے فرش کو تک رہی تھی۔ جمشید صوفے پر سے کود کے الاپتا ہوا اس کی طرف گیا۔

گلال زلفوں میں ان کی پڑا تھا ہولی میں

تو لالہ بمولہ کہ مشک ختن میں آگ لگی ہے

اس نے سلمیٰ کے بالوں پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرا۔ سلمیٰ نے غصے سے سر پیچھے ہٹا لیا۔ وہ اچانک میز پر آ گیا اور اس کے سامنے دوزانو بیٹھ کر لگاتار دہاڑتا چلا گیا۔

"یہ وصف تجھ ہی میں دیکھا نگار غصے میں

ہوا ہے چہرہ تیرا زرد یار غصے میں

تو بلبلوں نے بھی جانا چمن میں آگ لگی ـــــ ارے ہاں اگیا لاگی"

"ڈوشٹ اپ پلیز ـــــ!" سلمیٰ نے تلملا کر کہا۔

جمشید نے ہوا میں ہاتھ لہرایا ـــــ دیگر ـــــ

"میں بھولی باتوں کا اس کے کروں بیاں کیا کیا

شفق کو دیکھ کے کہتا ہے نوجواں میرا

عجب تماشا ہے چرخِ کہن میں آگ لگی

جی ہاں آگ لگی ـــــ "

"ثریا باجی ـــــ" سلمیٰ نے میز پر سے اترتے ہوئے آواز دی۔ ثریا جو دیوان پر نیم دراز اونگھ رہی تھی۔ اس نے ایک آنکھ کھولی۔

"پری بی۔ مجھے سمجھاؤ کہ جانِ من تمھاری ثریاباجی کس طرح ہیں۔ کیوں کر ہیں؟ گھر ہیں۔ ایٹ سیٹ رل۔ ایٹ سیٹ را۔" جمشید نے انگلی اٹھا کر سلمٰی سے استفسار کیا۔

"سر ــــــ "مسٹر پیٹرک نے دوبارہ زبان کھولی ــــــ "ڈاک دیکھ لیجیے۔"

"آل رائٹ۔ یو بلیک مین۔ کال ٹین آدمی ہمارے غلام کے چلام کے تلام، نوکر کے چوکر، مُرئی کے اوسار، مسٹر ایس۔ ڈی۔ جانسن صاحب بہادر۔ آئی۔ سی۔ ایس۔ ریٹائرڈ کا کیبل مارو ــــــ اور دیکھو۔ اگر تم نے ہمارا ٹائم زیاستی خراب کیا ہم تمھارا اتنا ٹھکائی کرے گا اتنا ٹھکائی کرے گا کہ تم افسوس کرے گا کہ تم پیدا ہوا تھا۔" کہہ کر اس نے کاروباری خطوط کے لفافے کھولے۔ مسٹر پیٹرک نے جلدی سے فاؤنٹن پین حاضر کیا۔ اس نے خطوں پر سرسری نظر دوڑائی۔ آنکھ بند کر کے ایک فارم پر دستخط کیے اور کاغذات قالین پر پھینک دیے۔ مسٹر پیٹرک نے لپک کر انھیں اٹھایا۔ ایک اور لفافہ پیش کیا جس پر ہندوستان کے ٹکٹ اور مہر تھی۔ اس کے بعد مسٹر پیٹرک باہر چلا گیا۔ جمشید نے اسی طرح بہکتے ہوئے لفافہ کھولا اور خط پر نظر ڈالی۔ پھر اس کی تیوری پر بل پڑے اور اس نے آنکھیں پوری طرح کھول کر پڑھنا شروع کیا:

باسم سبحانہ
متصل درگاہ شریف موضع محمد گنج۔
تحصیل ہرونی ضلع سلطان پور۔ یوپی۔ مورخہ ۱۴ جون ۱۹۶۱ء

برخوردار سعادت آثار، نور چشمی جمشید میاں سلمہ تعالیٰ

واضح ہو کہ بتاریخ ۱۲ جون بروز جمعہ بوقت دس بجے شب نور چشمی منظور النسا سلمہا، بعارضہ تپ محرقہ راہی ملک عدم ہوئی۔ اناللہ و اناالیہ راجعون۔ مرحومہ کو خانقاہ شریف کے گورستان میں بھائی صاحب جنت آرام گاہ نور مرقدہٗ کے متبرک پہلو میں دفن کیا گیا۔

اس مرحومہ نے مرتے وقت تمھیں معاف کیا۔ تمھارا خدا

بھی تمھیں معاف فرمادے! فقط

دعاگو

تمھارا چچا سید مظہر علی عفی عنہ

جمشید نے خط مٹھی میں زور سے بھینچا اور کاغذ کو توڑنا مروڑنا شروع کر دیا۔ دوبارہ پڑھا اور ساکت و صامت ہو کر بیٹھ گیا۔

ثریا اور سلمیٰ بہت دور کونے میں گشتوں کے سہارے دیوان پر آڑی آڑی لیٹی بانہوں پر سر رکھ کے سو چکی تھیں۔ باہر رقص ختم ہو چکا تھا اور مہمانوں کی بھیڑ چھٹنے لگی تھی۔

کمرے میں قبرستان کی خاموشی سرسرانے لگی۔ سنسان خانقاہ کے سارے کواڑ ہوا میں زور سے کھل گئے اور کھڑ کھڑانے لگے ـــــ ارے خداوند تعالیٰ تو عاشق کو اتنی لمبی جایداد عطا کرتا ہے ـــــ صبر کی جایداد ـــــ صبر کی جایداد ـــــ بڑے ابانے کا کلیس چھٹکا کر نارنجی کفنی سمیٹی اور اپنے خالی حجرے میں سے جھانکا ـــــ کھڑاؤں پہنے اور کھٹ کھٹ کرتے، سیڑھیاں اتر کر دوبارہ اپنی قبر میں جا گھسے۔ ہوا روئی کے پیڑوں میں زور زور سے منڈلانے لگی۔ بہت سرد ہوا تھی اور لو کے جلتے ہوئے تھپیڑوں میں تبدیل ہو گئی ـــــ شائیں شائیں شائیں شائیں زوووؤں ـــــ گھوں گھوں گھوں گھوں۔ جھڑاکے کی بارش شروع ہو گئی اور کچی قبر پانی میں بھیگنے لگی ـــــ بادل چھٹ گئے ـــــ چاند نکل آیا ـــــ سرخ آسمان پر سورج بھی ڈوب رہا تھا اور چاند بھی نکل آیا ـــــ 'سہاگن کی قبر ہے۔ جیسے رات کو چنبیلی ایسن مہکت ہے' ـــــ بکریاں ہنکاتی ہوئی چرواہن نے کہا۔ جمشید نے زور سے سسکی بھری۔

"تمھارا نشہ اب تک نہیں اترا؟" ثریا نے آنکھ کھول کر استہزا سے دریافت کیا اور پھر سو گئی

عابد انصاری تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا پھولی ہوئی سانس کے ساتھ لاؤنج میں آیا ـــــ "منصور ـــــ منصور ـــــ !" اس نے آواز دی۔

'منصور ایک ہاتھ میں شراب کا گلاس لیے دوسرے میں ریسیور اٹھائے فون پر جھکا ہوا تھا۔ عابد نے اس کے قریب جاکر چاروں طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا ـــــ 'منصور ـــــ قیامت گزر گئی ـــــ !"

منصور نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور ریسیور کو ہاتھ سے چھپا کر آہستگی سے کہا۔

"مجھے معلوم ہو چکا ہے ـــــ" اس نے ریسیور ایک منٹ کے لیے تھامے رکھا پھر فون پر رکھ دیا اور فرش پر بیٹھ گیا۔

لاؤنج خالی پڑی تھی۔ عابد ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

"بیکار ہے ـــــ" منصور نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک دیا۔

"پولیس کا اصرار ہے، اس نے خود کشی کی، اور جیل کے حکام کا بیان ہے کہ پولس نے اسے تھرڈ ڈگری" عابد نے چونکتے ہو کر چاروں طرف دیکھا اور فوراً چپ ہو گیا۔ ڈرائنگ روم کے دریچے کا پٹ آہستہ سے کھلا۔

لاؤنج میں باتوں کی آواز سے ڈرائنگ روم کے اندر دیوان پر پڑی ہوئی ثریا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دریچے کا پٹ کھول کر باہر جھانکا ـــــ "ہلو منصور ـــــ عابد ـــــ یو سوا اینڈ سو ـــــ تم لوگ کیا مسکوٹ کر رہے ہو ـــــ ؟"

اتنا کہہ کر اس نے پٹ کھول دیے اور کُشنوں پر گر کر دوبارہ سو گئی۔

لاؤنج میں وہ دونوں فریسکو کے نیچے فرش پر پندرہ بیس منٹ تک بالکل چپ چاپ بیٹھے رہے۔

بہت دیر بعد منصور نے کہا۔

"جاں بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی
اے اہلِ مصر وضعِ تکلف تو دیکھیے"

عابد نے گھڑی پر نظر ڈالی اور اٹھ کھڑا ہوا ـــــ "میں پریس جاتا ہوں۔"

"اس خبر کی اشاعت پر چوبیں گھنٹے کی پابندی ہے۔ بیٹھ جاؤ ـــــ "منصور نے جواب دیا اور ہاتھ پکڑ کر اسے فرش پر بٹھادیا اور قریب کی میز پر رکھی ہوئی تند شراب کی بوتل گلاس میں انڈیلی اور ایک دفعہ میں گلاس ختم کردیا۔ عابد نے دوسرا گلاس بھر کے پیناشروع کیا۔ وہ پسینا پسینا ہو رہا تھا۔

"میں جاتا ہوں ـــــ !"اس نے دوبارہ کہا ـــــ "یہ میرا بہت بڑا اسکوپ ہے۔"

منصور نے سر جھکا کر شراب کے بلبلوں کو غور سے دیکھا اور آہستہ سے بولا ـــــ "ایں ـــــ میرا اسکوپ ـــــ جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے؟"

"یہ رات ـــــ یہ رات۔ اس درد کا شجر ہے ـــــ "عابد نے بھوں بھوں کر کے روتے ہوئے گرہ لگائی اور فریسکو سے ٹیک لگا کر ایک ہچکی لی۔

دونوں پھر خاموش ہوگئے۔ عابد نے دوسرا گلاس چڑھایا ـــــ "ہم جو تاریک راہوں میں۔"اس نے ایک اور ہچکی لی ـــــ "واہ فیض احمد فیض گریٹ مین دی لالٹین ـــــ زندہ باد ـــــ مارے گئے۔"

"زندہ باد چیرز ـــــ تمہارا جام صحت ـــــ وعلیکم السلام ـــــ "منصور نے کھڑے ہو کر کہا اور پھر بیٹھ گیا۔ ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ اندر سُریلے کلاک نے ٹکو ٹکو ٹکو کرنا شروع کیا۔ آدھ گھنٹہ اور گزر گیا۔

"کس نے ـــــ ؟"منصور نے سوال کرنا چاہا۔ مگر چاروں طرف دیکھ کر چپ ہو گیا۔

"کس نے ـــــ ؟"عابد نے ہچکی لے کر پوچھا۔

"یہ کس نے ـــــ ہچ ـــــ "منصور نے تھوڑی دیر بعد دہرایا۔

یہ کس نے ـــــ لاش پھینک دی ـــــ جوانیوں کی ـــــ راہ میں؟"

عابد نے کہا۔

"ابھی گزر رہے تھے ہم جو اِرزم گاہ میں ـــــ ہچ ـــــ "منصور نے کہا۔

چندلیٔ رچین لڑکیاں اپنے سر سراتے ہوئے ایوننگ گاؤن ٹخنوں تک اٹھائے

کھل کھلا کر ہنستی ہوئی سامنے سے گزر کر عالیہ کے ڈریسنگ روم کی سمت چلی گئیں۔

"یہ جور و ظلم کی کلائیاں مروڑ کر نکل پڑا ـــــــ "عابد نے کہا۔

"اندھیری رات تھی ـــــــ چُپ ـــــــ مگر یہ چل پڑا ـــــــ "منصور نے کہا۔

"مگر یہ کس کی لاش تھی کہ بیڑیاں پڑی ہیں اب بھی پاؤں میں" ـــــــ منصور نے کہا۔

"جیل کے حکام کا بیان ہے کہ اس کی ہتھیلیوں میں میخیں ٹھونکی گئیں ـــــــ چُپ" ـــــــ عابد نے کہا۔

بیرا چھلکتے ہوئے سرخ پیمانوں سے جھلملاتی روپہلی کشتی اٹھائے ان کے قریب آیا۔ دونوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ بیرے نے ان کے خالی گلاس کشتی میں رکھے اور نئے گلاس ان کے ہاتھ میں تھمائے اور آگے چلا گیا۔

"ارے خداوند تعالیٰ تو عاشق کو صبر کی اتنی ای ای ای لمبی جایداد عطا کرت ہے ـــــــ "ڈرائنگ روم میں سے جمشید کی آواز آئی جو صوفے پر کھڑا ہوا میں ہاتھ لہرا رہا تھا۔

"یہ شام غم کا عکس تھا۔ یہ ایک انتباہ تھا ـــــــ ہمیں اسے کچل نہ دیں ابھی ـــــــ یہ روندنے کی چیز کیوں بنے امانتِ زمیں ـــــــ ؟"منصور نے کہا اور جام خالی کر دیا۔ بتاؤ مسٹر عابد انصاری۔ کیوں بنے امانت زمیں ـــــــ ؟ نہیں نہیں ـــــــ بڑھے چلو، کچل بھی دو۔" اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔ "کچل بھی دو ـــــــ چُپ ـــــــ خزاں کا غنچہ ہے یہ لاش۔ یہ موت کا مجسمہ ڈرا رہا ہے دیر سے۔ لہو میں تربتر ہے سر سے پاؤں تک ـــــــ جمے ہوئے لہو میں ہے میرے ہی خون کی مہک۔"

"مہک" ـــــــ اس نے اتنے زور سے گرج کر کہا کہ عابد اچھل کر کھڑا ہو گیا اور اس سے زیادہ گرج کو بولا ـــــــ

"یہ میرا اسکوپ ہے۔ میں کہے دیتا ہوں۔ یہ میرے کیریر کا سب سے بڑا اسکوپ ہے" ـــــــ وہ لاؤنج سے نیچے کیاریوں میں پھلانگا اور گھاس کے قطعے پر سے

لڑکھڑاتا، دوڑتا، رسیوں سے ٹکراتا، جہاں اب اگاڈگا مہمان ادھر ادھر نشے میں لڑھک رہے تھے، وہ تیزی سے پھاٹک تک پہنچا اور ثریا کی نیلی فوکس ویگن میں بیٹھ کر زناٹے سے اپنے دفتر کی سمت روانہ ہو گیا۔

منصور نے اسے جاتے دیکھا اور سر ہلا کر کہا ـــــــ "عابد میاں! میں تمھارے آنے سے پہلے ہی اپنے اخبار کو فون کر چکا ہوں ـــــــ "اس کے بعد اس نے کیاری میں چھلانگ لگائی اور سر جھائے کیکڑے کی طرح ترچھا ترچھا چلتا تاریکی میں غائب ہو گیا۔

ثریا نے جاگ کر آنکھیں ملیں اور سلمیٰ کا بازو ہلایا ـــــــ "اٹھو سلمیٰ! کیا رات بھر یہیں سونے کا ارادہ ہے؟"

"ہمیں سونے دیجیے ثریا باجی! ـــــــ ہم بہت تھک گئے ہیں ـــــــ" سلمیٰ نے کروٹ بدل کر جواب دیا۔

جمشید صوفے پر سے کود کر لڑکھڑاتا ہوا لڑکیوں کی طرف آیا اور سلمیٰ کے چہرے پر اپنا چہرہ رکھ کر پوچھا ـــــــ "پری بی! ذرا یہ تو بتاؤ کہ جانِ من تمھاری ثریا باجی کس طرح ہیں ـــــــ کیوں کر ہیں ـــــــ کدھر ہیں ـــــــ ایں؟"

سلمیٰ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور جمشید کو پوری قوت سے پیچھے ڈھکیلتے ہوئے اس نے یک لخت شدید کراہت کے ساتھ کہا ـــــــ "کیپ اوے یوڈرٹی ڈوگ[1]۔"

"کیا کہا پری بی ـــــــ؟ میں ڈرٹی ڈوگ ہوں؟ اور تم ـــــــ؟ اور تم ـــــــ؟ تم کیا ہو ـــــــ؟ یوڈرٹی بلڈی بچ[2] ـــــــ"

ثریا آگ بگولہ ہو کر اٹھی۔ اس نے جمشید کے منہ پر اپنی پوری طاقت سے ایک طمانچہ رسید کیا۔

---

1. Keep away, you dirty dog
2. You dirty bloody bitch

"جمشید علی سیّد، تم کتنے ہی نشے میں کیوں نہ ہو، مگر تم نے میرے سامنے چھوٹی بٹیا کی توہین کی تو میں تمھارے دانت توڑ دوں گے۔ تمھارا خون کردوں گی۔"

"آہاہاہا ـــــ اوہو ہو ہو۔ یک نہ شد دو شد۔ چھوٹی بٹیا ـــــ !یہ آپ کی چھوٹی بٹیا ہیں۔ آپ ان کی اماں جان ہیں ـــــ والدہ محترمہ ـــــ چہ خوش چرانہ بودی ـــــ چھپّر پہ بھینس کودی۔ آج کی رات بڑے بڑے انکشافات ہو رہے ہیں ہم پر ـــــ چودہ دونی اٹھائیس طبق روشن شد۔" پھر اس نے زور کی تان لگائی ـــــ آج کی رات ـــــ آج کی راآآآت۔ سازِ درد نہ چھیڑ ـــــ "اور دیوان کے قریب قالین پر دھم سے بیٹھ گیا۔

سلمٰی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ وہ ثریا سے لپٹ گئی ـــــ جیسے اس کی پناہ لیتی ہو۔

ثریا دفعتاً ہوش میں آگئی اور اس نے آہستہ سے جمشید کو مخاطب کیا ـــــ "جمشید! سلمٰی تمھارے دفتر میں چار مہینے سے کام کر رہی ہے اور تم کو یہ معلوم نہیں کہ یہ کون ہے اور کس کی بیٹی ہے؟"

"مجھے موصوفہ کا شجرۂ نسب اور ہسٹری شیٹ معلوم کرنے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں ـــــ ان کی ذاتی فائل سے میرا وزیر باتدبیر مسٹر پیٹرک ڈیل کرتا ہے۔ مجھے صرف اس سے غرض ہے کہ یہ میری نوکر ہیں اور میرے کلائنٹس کی محبوبہ دلنواز ـــــ مِس چھپّن چھری ـــــ ارے ـــــ !"اس نے پھر لہکنا شروع کیا ـــــ "ارے ایسے تو جگ میں جوان کوئی ہو ہیونا ـــــ ارے دس گنڈہ آگے ـــــ دس گنڈہ پیچھے ـــــ ایسے تو ـــــ"

ثریا نے طیش سے بے قابو ہو کر تین چار تھپڑ اسے اور لگائے۔ اس نے بازو چہرے کے سامنے کر کے ثریا کا ہاتھ روکنے کی کوشش کی۔ سلمٰی نے لرزتے ہوئے ثریا کو اپنی طرف کھینچا ـــــ "ثریا باجی ـــــ خدا کے لیے ـــــ ثریا باجی۔"

ثریا چیتے کی طرح چلتی ہوئی پھر جمشید کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی ـــــ ہاں جمشید علی سیّد آج کی رات، یقیناً انکشافات کی رات ہے۔"

وہ ثریا کے تیور دیکھ کر بے طرح خوف زدہ ہو گیا ـــــ "ڈارلنگ ہمیں مارو نہیں ـــــ ہمیں ڈانٹو نہیں ـــــ !" اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

پنجرے میں مقید شیرنی کی مانند چاروں طرف گھوم گھوم کر ثریا نے کہنا شروع کیا۔

"جمشید علی سید ـــــ آج پہلی مرتبہ میری ملاقات کھانے کی میز پر تمھارے والد صاحب سے ہوئی ـــــ اور میں نے ان کو فوراً پہچان لیا ـــــ محمد گنج میں وہ ابا سے ملنے ہمارے گھر اکثر آیا کرتے تھے ـــــ "

جمشید کا رنگ فق ہوتا دیکھ کر اس نے قہقہہ لگایا ـــ "جمشید ڈارلنگ! ـــ میں کسی تعلقہ دار کی صاحبزادی نہیں ہوں۔ میں نے کسی مسوری کانونٹ میں تعلیم نہیں پائی ہے۔ میں نے کسی شانتی نکیتن کی شکل نہیں دیکھی ہے ـــــ میں سید زوار حسین مرحوم، سوز خوان وکاشت کار، موضع محمد گنج سلطان پور کی لڑکی ہوں۔ تم کان پور کے کسی "مشہور ایڈوکیٹ" کے بیٹے نہیں ہو۔ تم سید مظہر علی، کاشت کار موضع محمد گنج ضلع سلطان پور کے بھتیجے ہو، اور تم نے کسی کرنل براؤن اسکول دہرہ دون میں تعلیم حاصل نہیں کی ہے ـــــ تم اور میں ـــــ ہم دونوں اپنے پبلک ریلیشنز ایکسپرٹ کے تخلیق کردہ کردار ہیں ـــــ زندہ باد منصور احمد خاں ـــــ میرا حلق خشک ہو رہا ہے ـــــ !" وہ فرش پر بیٹھ گئی۔

جمشید خاموشی سے اٹھا اور بار پر سے دو گلاس بنالایا۔

"آؤ ـــــ ہم دونوں اپنے عزیز "پریس ایجنٹ" منصور احمد خاں کا جام صحت پئیں"۔ ثریا نے بڑی سنجیدگی سے اپنا گلاس جمشید کے گلاس سے ٹکرایا۔ جمشید نے وحشت زدہ ہو کر اسے دیکھا۔

بوٹا بیگم آتو جی کی لڑکی ـــــ بسنتی بیگم

وہ کہتی رہی ـــــ "تمھارے چچا ابا سید مظہر علی نے سر پر کفن باندھ کر

اپنی آقا نواب شمس آرا بیگم کے خلاف گواہی دی تھی اور مجھے میاں نوروز کے چنگل سے چھڑایا تھا۔ وہ میرے محافظ فرشتے تھے۔ وہ تمھارے بھی محافظ فرشتے تھے مگر تم نے ان کو بھی نہ پہچانا ـــــ اور ان کی قدر نہ کی۔

"چھوٹی بٹیا کے بابا مرزا قمر الدین احمد نے مجھے آسرا دیا تھا۔ وہ بھی نیکی کر کے دریا میں ڈالنے کے قائل تھے۔ وہ میرے دوسرے محافظ فرشتے تھے۔ میرا تیسرا محافظ فرشتہ" وہ کہتے کہتے یک لخت رک گئی۔ چند لمحوں بعد اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بات دوبارہ شروع کی ـــــ "میرا سب سے بڑا محافظ فرشتہ منصور احمد خاں ہے اور میری آخری جائے پناہ سوئٹزرلینڈ کے وہ بنک ہیں جن میں تمھاری دولت جمع ہے۔ آؤ ـــــ تمھارے سوئس اکاؤنٹ کا جام پئیں ـــــ اس نے گلاس دوبارہ ٹکرایا۔ اس نے دو سال پیرس میں رہ کے کبھی اتنی شراب نہ پی تھی جتنی وہ شام سے لے کر اب تک چڑھا چکی تھی۔

جمشید نے وحشت زدہ ہو کر سلمیٰ کو دیکھا جو بچوں کی طرح ہاتھوں کی مٹھی بنا کر اپنی آنکھیں مل رہی تھیں اور ثریا کی ساری کا آنچل پکڑے اس کی آڑ میں دبکی اور سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔

کہر آلود آم کے باغ میں گرم، روشن خیمے کے اندر ایک چھوٹی سی بچی نے چھتری سنبھال کر چھوٹی سی آواز میں "تھینک یو" کہا

کمرے میں لرزہ خیز سکوت طاری تھا ـــــ دونوں آشفتہ حال، بے سہارا لڑکیاں محمد گنج کے مندر کی سیتا کی مورتیوں کے مانند اس کے سامنے بیٹھی تھیں، وہ ان کے سامنے دوزانو جھک گیا اور اس نے آہستہ آہستہ کہا۔

"میری منظوریا نے مرنے سے پہلے مجھے معاف کر دیا۔ ثریا۔ سلمیٰ۔ تم دونوں بھی مجھے معاف کر دو ـــــ "

"کے سیرا![1] ـــــ سیرا ـــــ" دوسری منزل سے نغمے کی آواز بلند ہوئی اور رات کے گہرے سناٹے میں گونجی۔ اوپر ابھی پارٹی جاری تھی اور فیری کے کسی بوائے فرینڈ نے ریڈیو گرام پر ڈورس ڈے کا ریکارڈ لگا دیا تھا۔

جمشید دفعتاً اپنی جگہ سے اٹھا اور زینے میں جا کر بے حد زور سے دہاڑا ـــــ "اری او فرحتیا ـــــ بلا بند کر ـــــ" وہ اس زور سے چیخا کہ سارے جمشید ہاؤس میں اس کی آواز گونج اٹھی۔ فیری نے گھبرا کر اوپر سے جھانکا اور ڈیڈی کی آواز اور اس لہجے سے بے حد متعجب ہوئی ـــــ ڈیڈی نے آج تک اسے اس گنوارو نام سے نہیں پکارا تھا۔

وہ پھر آکر فرش پر بیٹھ گیا۔

سریلے کلاک نے رات کا دو بجایا۔

ثریا نے آنکھیں میچ لیں اور چپکے چپکے کہا ـــ "سلمان ـــ سلمان ـــ تم بھی معاف کر دو۔ تم جہاں کہیں بھی ہو، جس حالت میں بھی ہو۔ مجھے معاف کر دو ـــــ مجھے معاف کر دو ـــــ مجھے اس طرح نام نے دو ـــــ سلمان!"

کمرے میں ایک بار پھر قبرستان کی خاموشی سنسنانے لگی۔

جمشید ہاتھوں میں سر پکڑے اس طرح بیٹھا رہا جیسے وہ گورکن ہو اور بہت سی میتیں دفن کر کے اب ستا رہا ہو ـــــ 'اگیا لاگی سندر بن جل گیو رے' اس نے بیٹھی ہوئی آواز میں دہرایا اور گلاس کی باقی ماندہ شراب ختم کرنے کے بعد اپنی آنکھوں پر ہتھیلی پھیری۔ اور پھر بڑی دلدوز نیچی آواز میں آہستہ آہستہ الاپنا شروع کیا:

جلی ہے لاش مری آتشِ جدائی میں
مدد کو پہنچو صنم اب کفن میں آگ لگی

ـــــ پھر اس نے کہا ـــــ "بسنتی بیگم! تمھیں ہمارے گاؤں کا چپاتی بھانڈ یاد ہے جو یہ ٹھمہ گایا کرتا تھا ـــــ"

---

[1] جو کچھ ہونا ہے وہ ہوگا۔ ہم مستقبل کو نہیں دیکھ سکتے

ثریا اس کے نزدیک اکڑوں بیٹھ گئی اور آواز ملانے لگی ـــــ "مدد کو پہنچو صنم اب کفن میں آگ لگی" ـــــ کچھ دیر بعد ثریا نے یک بیک چیخ کر دہرایا۔

پھر وہ دونوں یک لخت چپ ہو گئے۔ سلمٰی خاموشی سے سر جھکائے قالین کو تکتی رہی۔ ثریا نے ایک سانس میں متواتر دہرانا شروع کیا ـــــ "پل نہ لاگیں موری انکھیاں پیو، پل نہ لاگیں موری آنکھیاں۔ پیو پل نہ لاگیں پل نہ لاگیں پل نہ ـــــ"

سلمٰی نے گھبرا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا ـــــ ثریا باجی ـــــ ثریا باجی ـــــ لیٹ جائیے ـــــ پانی پی لیجیے!"

"میں بالکل ٹھیک ہوں چھوٹی بٹیا ـــــ" اس نے جواب دیا اور ساری کے آنچل سے اپنا بھیگا ہوا چہرہ پونچھا۔ مگر آنسوؤں کا سیلاب اس کی آنکھوں سے ابل آیا۔

پھر وہ دھیرے سے بولی ـــــ "جمشید ـــــ! مجھے بھی چپاتی بھانڈ کا ایک گانا یاد ہے۔ سناؤں ـــــ؟" پھر اس نے دل کو ٹکڑے کر دینے والی آوز میں کہا ـــــ

"دن کو آ سکتے نہ تھے ـــــ آنے کو کیا رات نہ تھی ـــــ مہندی پاؤں میں نہ تھی آپ کے ـــــ برسات نہ تھی ـــــ کج ادائی کے سوا اور کوئی بات نہ تھی ـــــ سچ تو کہیے کہ منظور ملاقات نہ تھی ـــــ منظور ملاقات نہ تھی ـــــ" پھر دفعتاً وہ بالکل خاموش ہو گئی اور دونوں ہاتھ گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔

وہ تینوں شکستہ جاموں، بکھری ہوئی بوتلوں، فرش پر بہتی ہوئی شراب اور ٹوٹی ہوئی تپائیوں کے انبار پر اس طرح سر جھکائے بیٹھے رہے جیسے دنیا کا خاتمہ ہو چکا ہو اور وہ جلے ہوئے کرۂ زمین کے آخری جاندار ہیں۔

دھڑ سے دروازہ کھلا اور سیٹھ عیسٰی بھائی موسٰی بھائی گھاس لیٹ والا اندر داخل ہوئے اور انھوں نے آگے بڑھ کر ایک اسٹامپ پیپر جمشید کی ناک کے سامنے لہرایا۔

"چٹاگانگ سے ٹرنک کال آگیا ہے زمشید بھائی، ادھر سائن کر دو، ہم کو گھر

جانے کا ہے ـــــ "

جمشید نے سر اٹھا کر انھیں دیکھا۔ آنکھیں ملیں اور اسے رفتہ رفتہ یاد آیا کہ وہ کون ہیں۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے آنکھیں پوری طرح کھول کر اپنے آپ پر نظر ڈالی اور اسے یاد آگیا کہ وہ خود کون ہے ـــــ وہ مشہور بزنس میگنیٹ جمشید علی سیّد تھا۔ آج شام اس کی شاندار کوٹھی کی "ہاؤس وارمنگ" ہوئی تھی۔ یہ کوٹھی اس نے ساڑھے چار لاکھ میں بنوائی تھی۔ اس کے سارے کمرے ایرکنڈیشنڈ تھے۔ جو ایک دوسرے سے ہاؤس ٹیلی فون کے ذریعے منسلک تھے۔ شہر کے خوش پوش ترین جوانوں میں اس کا شمار کیا جاتا تھا اور اعلیٰ طبقے کی بیش تر بن بیاہی لڑکیاں "بیگم جمشید" کہلانے کی متمنی تھیں۔ آج صبح اس نے دس لاکھ کا ایک معاملہ طے کیا تھا اور اس کے لیے مسٹر جانسن کے کیبل کا اسے جواب دینا تھا۔ اس کے بعد چٹاگانگ ٹرنک کال کرنا تھی ـــــ اور اس کے بعد نئے معاہدے کے سلسلے میں ایک جرمن فرم سے گفت و شنید کے لیے کل تیسرے پہر کو یورپ روانہ ہونا تھا۔ اس نے ایک لمبا سانس لیا۔ سگریٹ جلایا اور مسٹر گھاس لیٹ والا کے ساتھ اپنے آفس روم کی طرف چلا گیا۔

اب صبح کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ مسٹر پیٹر ڈرائنگ روم میں آئے اور انھوں نے سلمیٰ کو مخاطب کیا ـــــ "مس مرزا ـــــ بوس وانٹس یو۔"

سلمیٰ قالین پر سے اٹھی۔ بیگ میں سے آئینہ نکال کر چہرہ صاف کیا اور مضبوط قدم رکھتی آفس روم میں گئی۔

"مس مرزا ـــــ!"

"یس سر ـــــ!"

"آپ کو اتوار کے دن بھی زحمت دینی پڑ رہی ہے۔ کل نو بجے صبح مسٹر ولکاکس اور ان کا گروپ بی۔ او۔ اے۔ سی سے آرہا ہے۔ ساڑھے نو بجے وہ دونوں جاپانی پہنچ جائیں گے۔ صبح کو ایرپورٹ چلی جایئے۔ ان لوگوں کے لیے میٹروپول میں کمرے

بک کروا دیجیے اور دوپہر کو لنچ کھلا دیجیے۔"

بوس نے نظریں نیچی کیے کیے اس سے کہا ــــــ "میں خود نہ آسکوں گا۔ کیوں کہ کل فلائی کرنے سے پہلے مجھے بہت سے کام نپٹانے ہیں۔ کل دس بجے تک میٹروپول پہنچ جایئے گا۔"

"یس سر ــــــ !" سلمٰی نے سیدھی کھڑی ہو کر نارمل اور باہمت آواز میں جواب دیا ــــــ "گڈ نائٹ!"

"گڈ نائٹ۔ مسٹر پیٹرک! ــــــ قادر بخش کو بولو، مس صاحب کو گھر پہنچا دے" ــــــ

سلمٰی کمرے سے باہر چلی گئی۔

مسٹر پیٹرک ڈرائنگ روم میں گئے۔

"مس حسین! مسٹر سیّد نے بلایا ہے۔"

ثریا قالین پر سے اٹھی۔ بیگ میں آئینہ نکال چہرہ صاف کیا اور مضبوط قدم رکھتی آفس میں گئی۔

"ثریا ــــــ !" جمشید سیّد نے نظریں اٹھائے بغیر کہا ــــــ "شام کو تمھارا ٹکٹ بھی آگیا ہے۔ گھر جا کر پیکنگ کرلو۔ کل ڈھائی بجے ایر پورٹ آجانا۔ ابھی پیرس سے کیبل آیا ہے۔ تمھاری نمائش کا انھوں نے ۱۸ جولائی سے انتظام کیا ہے۔ اتنا عرصہ ہم لوگ جنیوا میں رہ سکیں گے ــــ اچھا کل ملاقات ہوگی ــــ گڈ نائٹ ثریا ــــ !"

"گڈ نائٹ" ــــــ وہ بھی باہر چلی گئی۔ مگر چند منٹ بعد اس نے واپس آکر کہا ــــــ "میری کار غائب ہے ــــــ شاید منصور یا عابد لے گئے۔"

"مسٹر پیٹرک! ــــــ فتح گل کو بولو عالیہ بی بی کی کار میں مس صاحب کو گھر پہنچا دے۔"

"یس سر ــــــ"

دوسرے روز غیر ملکی مہمانوں سے نپٹ چکنے کے بعد سلمٰی نے میٹروپول کی دکانوں سے بہت ساسامان خریدا۔ قیمتی چاکلیٹ، ٹافی، بسکٹوں کے ڈبے ـــــ خشک میوہ۔ شیرے میں ڈوبے ہوئے پھلوں کے ٹین۔ تھری کاسلز سگریٹ کا پورا کارٹن۔ ایکواویلوااور شمپو کی شیشیاں۔ بڑھیا قسم کا شیونگ سوپ۔ ٹوتھ پیسٹ۔ بک اسٹال سے بہت سی پیپر بیک کتابیں اور تازہ رسالے اٹھائے اور گھر آگئی۔ ماما کو ایک ایک چیز دکھائی اور رات کو کھانے کے بعد سارے سامان کا بڑا ساپارسل بنایا۔ پارسل کو سرہانے رکھا اور اس پر ہاتھ رکھ کر سو گئی۔

ایک صاحب کے ذریعہ وہ ہر پندرھویں روز ایک پارسل سلمان کو بھجوایا کرتی تھی۔ وہ صاحب گھر سے لے جایا کرتے تھے۔ مگر پچھلی مرتبہ انھوں نے کہا تھا کہ اس دفعہ وہ خود نہ آسکیں گے اور سلمٰی نے ان سے کہا تھا کہ پیر کی صبح کو وہ سامان ان کے پاس پہنچادے گی۔

صبح کو وہ پارسل دفتر لیتی گئی اور اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی ان صاحب کو فون نمبر دیکھنے کے لیے ٹیلی فون ڈائرکٹری کھولی۔ اتنے میں مسٹر پیٹرک اندر آئے اور انھوں نے ایک لفافہ سلمٰی کو دیا ـــــ ”بوس کا خط ـــــ “انھوں نے کہا اور باہر چلے گئے۔ مس ڈی سوزا آئیں۔ چند کاغذات کرسی پر رکھے اور چلی گئیں۔ اس نے کھڑکی میں جا کر لفافہ کھولا۔

”چھوٹی بٹیا! ـــــ پرسوں رات انتہائی نشے اور نیم دیوانگی کے عالم میں، میں نے جس طرح آپ سے گستاخی کی اس کے لیے صدق دل سے معافی کا خواست گار ہوں اور جانتا ہوں کہ معاف کیے جانے کا ہرگز مستحق نہیں۔ میری رذالت کے باوجود اس کے بعد آپ نے اسی تمکنت اور بردباری سے میرے ”حکم“ کی تعمیل کی اور آج حسبِ معمول میرے لیے میزبانی کے فرائض انجام دیے۔ پرسوں رات جب میں نے دفتر کی میز پر بیٹھ کر آپ سے ایرپورٹ اور میٹروپول جانے کے لیے کہا تھا اس وقت

میں آپ کے متعلق ایک اہم فیصلہ کر چکا تھا۔

وہ فیصلہ یہ تھا کہ میں اس ملازمت کے لیے جو آپ کے وقار اور شرافت کے سراسر منافی ہے اور آپ کی شخصیت کی توہین ہے میں آپ کو مزید زحمت نہیں دے سکتا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں کیا لکھوں اور کن الفاظ میں آپ کو یقین دلاؤں کہ میرے دل میں آپ کی کتنی عزت ہے اور جو کچھ میں کہنے والا ہوں اپنے میں ہمت نہیں پاتا ہوں اور مناسب الفاظ کا متلاشی ہوں جن کے ذریعہ آپ کے معصوم اور دکھی دل کو ٹھیس لگائے بغیر اپنا مافی الضمیر ادا کر سکوں۔

چھوٹی بٹیا، پرسوں رات میں نے بہت سے پوشیدہ ڈھانچے اپنی الماری میں سے نکالے، ان کو جھاڑا پونچھا اور انھیں الماری میں دوبارہ مقفّل کر دیا۔ میں نے اپنی لاش کا خود پوسٹ مارٹم کیا اور اسے زندگی کے مردہ خانے میں برف کی سلوں کے تلے دبا دیا اور آج میں وہی جمشید سیّد ہوں جس سے آپ پچھلے چار مہینے سے واقف ہیں۔ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں ایک انتہائی ذلیل، بے رحم، خود غرض، کمینہ اور مفاد پرست انسان ہوں۔ میں ایک ایسا شخص ہوں جس کے لیے کسی قسم کی پرانی اقدار، شرافت، اصول پرستی وغیرہ وغیرہ کے تصورات لایعنی ہو چکے ہیں۔ لیکن پرسوں رات جب مجھے معلوم ہوا کہ آپ مرحوم مرزا صاحب کی صاحبزادی ہیں تو میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ اس اطلاع سے دوسرا ذہنی جھٹکا جو مجھے لگا اس کا تعلق سراسر میری کاروباری حس اور میرے کمینے پن اور کامن سنس سے ہے۔ وہ ذہنی جھٹکا یہ تھا کہ آپ نہ صرف مرزا صاحب کی صاحبزادی ہیں بلکہ اپنے بھائی کی بہن بھی ہیں۔

"چھوٹی بٹیا، آپ کو اب معلوم ہو گیا ہے کہ میں ایک سیلف میڈ انسان ہوں اور میری زندگی کا سب سے بڑا مطمعِ نظر میرا ذاتی مفاد ہے۔ آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ میرا کاروبار خصوصیت سے کسی غیر ملکی قوم کے ساتھ ہے۔ جب انھیں یہ معلوم ہوگا کہ میری کانفی ڈنشل سکریٹری کس شخص کی سگی بہن ہے تو آپ خود اندازہ کر لیجیے اس کا اثر میرے کاروبار کے لیے کس قدر تباہ کن ہوگا۔

"چھوٹی بٹیا ـــــ میں درپردہ ہر ممکن طریقے سے آپ کی مدد اور اعانت

کروں گا اور آپ کو کسی بھی دفتر میں ایک معقول ملازمت دلوادوں گا۔ آپ کی اور آپ کی والدہ صاحبہ مکرمہ کی خدمت میرا فرضِ اولین ہے ــــــ بٹیا ــــــ اب میں آپ کے "بزرگ" کی حیثیت سے چند پند و نصائح کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ دنیا بڑی ذلیل جگہ ہے۔ میں بھی دنیا کا ایک فرد ہوں۔ آپ کے بھائی نے دنیا سے سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا اور اس کی سزا بھگت رہا ہے۔ مجھے یقین ہے، اور امید ہے کہ بہت جلد اسے معلوم ہو جائے گا، یا شاید معلوم ہو چکا ہو کہ اس کے تجزیے اس کی انتہا پسندی اور آئیڈیلزم قطعاً غلط ہے۔ آپ نے اپنے حالات اور اپنے مجبوریوں کے تحت میرے ذریعہ دنیا سے ایک حد تک سمجھوتہ کر لیا۔ جس طرح ثریا نے میرے ذریعے دنیا سے سمجھوتہ کر لیا جس طرح ثریا نے میرے ذریعہ دنیا سے سمجھوتہ کر کے سورج کے نیچے اپنے جگہ بنالی۔ مجھے یقین ہے کہ قطعی فیصلہ کرنے سے قبل اسے شدید ذہنی کشمکش کا سامنا کرنا پڑا ہو گا۔ مگر اسے معلوم ہو چکا ہے اور آپ بھی دیکھ چکی ہیں کہ آج کی دنیا ایک بہت عظیم الشان بلیک مارکیٹ ہے، جس میں ذہنوں، دماغوں، دلوں اور روحوں کی اعلیٰ پیمانے پر خرید و فروخت ہوتی ہے۔ بڑے بڑے فنکار، دانشور، عینیت پسند اور خدا پرست، میں نے اس چور بازار میں بکتے دیکھے ہیں۔ میں خود اکثر ان کی خرید و فروخت کرتا ہوں۔

"میں یہ سب باتیں آپ کو اس لیے لکھ رہا ہوں کہ آپ ذہنی طور پر بڑی ہو جائیں اور زندگی کی طرف سے کسی قسم کے مزید الوژن اور خوش فہمیاں آپ کے دل میں باقی نہ رہیں۔ ورنہ آپ کو مرتے دم تک مزید صدمے اٹھانے پڑیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ زندگی سے خوف زدہ ہونا چھوڑ دیں ــــــ اور زندگی کے مکر و فریب اور ریاکاری اور کمینے پن کا انہی ہتھیاروں سے مقابلہ کریں۔ دنیا میں زیادہ تر انسان جنگل کے درندے ہیں ــــــ اور ہمیں جنگل کے قانون کا ساتھ دینا ہے۔ مجھے اچھی طرح اندازہ تھا کہ آپ اپنی موجودہ ملازمت سے کس قدر دہشت زدہ تھیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ زندگی کی دہشت پر جلد از جلد قابو پالیں۔

"میں یہ خط ایرپورٹ سے لکھ رہا ہوں۔ میں اور ثریا مہینے بھر کے لیے یورپ

جا رہے ہیں اور ہم دونوں کی خواہش ہے کہ واپسی پر ہم آپ کو خوش و خرم اور بخیریت پائیں!

"آخر میں میرا ایک اور بزرگانہ مشورہ یہ ہے کہ اب آپ کو شادی کر لینی چاہیے اور اس نقطۂ نظر سے آپ کی موجودہ جائے رہائش کا آپ کے مستقبل پر اچھا اثر نہیں پڑ سکتا۔ میں جنیوا سے لوٹتے ہی کوشش کروں گا کہ آپ کو میرے قرب و جوار میں ایک معقول کرائے کا فلیٹ مل جائے تاکہ آپ بھی ہاؤسنگ سوسائٹی میں منتقل ہو سکیں۔"

"والدہ صاحبہ محترمہ کی خدمت میں میرا آداب کہیے گا۔ میری پُر خلوص دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ یقین کیجیے میں ہمیشہ آپ کا مخلص اور بے لوث دوست رہوں گا!

خدا حافظ

آپ کا تابعدار

کمترین جمشید"

سلمٰی کے ہاتھ سے خط گر گیا۔ نیچے کرسی پر صبح کا اخبار رکھا تھا جس کے پہلے صفحے پر جلی سرخی میں منصور احمد خاں کا اسکوپ چھپا تھا۔

سرلادیوی

سرلادیوی ۱۹۲۹ء میں پنجاب میں پیدا ہوئیں۔ ان کی ذہنی نشو و نما ایک ایسے ماحول میں ہوئی جو نہ صرف علمی اور ادبی تھا بلکہ زبردست اشتراکی بھی تھا۔ ان کے دونوں بھائی کرشن چندر اور مہندر ناتھ ترقی پسند تحریک کے روحِ رواں تھے۔ ان کے خاوند ریوتی سرن شرما معروف ترقی پسند افسانہ نگار اور ڈرامہ نویس ہیں۔

تقسیمِ ملک اور فرقہ وارانہ فسادات سرلادیوی کے خصوصی موضوعات رہے ہیں۔ تقسیم ملک سے پیدا شدہ صورتِ حال کا کرب اور درد ان کی کہانیوں میں نمایاں طور پر واضح ہے۔ انھوں نے بہت کم لکھا لیکن انھوں نے جتنا بھی اپنے افسانوں کی شکل میں تحریر کیا، اس سے اس سماجی المیے کی تصویریں سامنے آتی ہیں جو تقسیمِ ہند کے بعد فرقہ وارانہ فسادات کی صورت میں سامنے آئیں۔ اسی لیے وہ اس آزادی سے خوش نظر نہیں آتیں جس نے اتنے بڑے انسانی اور تہذیبی المیے کو جنم دیا۔ اپنے افسانوں میں سرلادیوی اس ظلم و جبر کی بھی تصویر کشی کرتی ہیں، جس کے عذاب سے برصغیر کی ہزاروں بے گناہ عورتوں کو فرقہ وارانہ فسادات کے دوران گزرنا پڑا۔

سرلادیوی کے بارے میں راجندر سنگھ بیدی نے ایک بار لکھا تھا کہ

"سرلا دیوی کی ادب کے تئیں سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انھوں نے ہماری زندگی کے کھوکھلے پن کو اچھی طرح بے نقاب کیا ہے۔" سچ تو یہ ہے کہ وہ کھوکھلے پن کو بڑی جارحیت کے ساتھ بے نقاب کرتی ہیں۔

ان کا انتقال دلی میں ۸ مئی ۱۹۷۵ء کو ہوا۔

سَرلا دیوی

چاند بجھ گیا

جب سے ڈاکٹر ہو کر گیا تھا گھر میں ایک منحوس سی خاموشی چھاگئی تھی۔ سب غیر معمولی طور پر چپ ہو گئے تھے۔ ان کے ہونٹوں سے ہنسی یکسر غائب ہو گئی تھی۔ وہ چل پھر رہے تھے مگر سایوں کی طرح خاموش۔ ان کے چہرے ایک ساتھ لمبے لمبے ہو گئے۔ ان کی آنکھوں کی سفیدی ضرورت سے زیادہ نمایاں ہو گئی تھی اور چیزوں کو پکڑتے اور اٹھاتے وقت ان کی انگلیاں کانپ کانپ جاتی تھیں۔ گھر کے لوگوں میں اس تبدیلی کو موہنی نے بخوبی محسوس کیا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ کمرے میں جو شخص بھی داخل ہوتا ہے اس سے آنکھیں نہیں ملاتا بلکہ جلد سے جلد باہر چلے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس نے ایک دوبار دریافت بھی کیا کہ ڈاکٹر کیا مرض بتا گیا ہے مگر کسی نے تسلی بخش جواب نہ دیا تھا۔ سب لوگ اس سے کچھ چھپانا چاہتے تھے۔ وہ اس کی آواز سن کر چونک پڑتے تھے اور ایک بار آنکھیں ملا کو فوراً نظریں چراجاتے تھے۔ موہنی کو کسی نے کچھ نہ بتایا لیکن وہ سب کچھ جان گئی۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا تجربہ نہ تھا۔ اس قسم کے تجربہ سے وہ پہلے بھی ایک بار دوچار ہو چکی تھی۔

لیکن پہلے تجربہ میں اور دوسرے تجربہ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اُس دفعہ موہنی چارپائی پر نہیں پڑی تھی۔ اُن دنوں وہ تندرست تھی، خوبصورت تھی۔ اُس کے رخساروں کی رنگت گلابی اور ہونٹوں کی سرخی تازہ تھی۔ چارپائی پر اُس کے پتا پڑے

تھے۔ بخار نے ان کا خون اور گوشت گلا ڈالا تھا۔ اور ہڈیاں پیلی مردہ کھال کے نیچے بے ڈھنگے سے انداز میں پڑی رہ گئی تھیں۔ وہ چار مہینے سے بیمار تھے۔ پہلے ڈاکٹروں نے معمولی بخار بتایا۔ پھر ملیریا ٹائیفائڈ اور پھر ایک دن سارے گھر میں آج کی طرح سناٹا چھا گیا۔ خوف و ہراس سے سب کانپ اٹھے۔ ہمت اور حوصلہ جواب دے گیا۔ گھر میں موت کے سیاہ پروں کا سایہ پھیلتا دکھائی دیا۔ ڈاکٹروں نے اس کے پتا کو تپ دق کا مریض قرار دے دیا تھا۔ آج پھر موہنی کی آنکھوں کے آگے اس کے بیمار پتا کی تصویر گھومنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد یہ تصویر دھندلی پڑنے لگی اور اس میں سے ایک نئی تصویر ابھرنے لگی ـــــ یہ دوسری تصویر موہنی کی طرح تھی ـــــ موہنی کو سمجھنے میں کچھ دیر نہ لگی کہ اس نے اپنے پتا کی چارپائی سنبھال لی ہے۔

دق۔ ٹی بی ـــــ موہنی کی چھاتی میں برچھیاں سی اتر گئیں۔ وہ لرز اٹھی۔ اس کا سارا بدن پسینہ سے شرابور ہو گیا۔ کیا اسے واقعی دق ہو گئی ہے۔ کیا اس کی زندگی میں واقعی گھن لگ گیا ہے؟ موت کا خیال آتے ہی موہنی کا سر چکرا گیا۔ موت کے خوف نے اس کی روح کو جکڑ لیا ـــــ لیکن دوسرے لمحے یہ خوف کافور ہو گیا۔ اس کی جگہ چنتا نے لے لی۔ میں مر جاؤں گی تو میرے بعد میرے بچوں کا کیا ہوگا؟ میری سویٹ اور میرے اس منے کا جس کا میں ابھی نام بھی نہ رکھ پائی ہوں؟ اور گویا موہنی کے لیے زندگی اور موت کے تمام مسائل سمٹ کر اس مسئلے میں سما گئے ـــــ میرے بچوں کا کیا ہوگا۔ میرے بچوں کا کیا ہوگا؟

اس کا تخیل تصویر پیش کرنے لگا ـــــ وہ موت کا شکار ہو گئی ہے ـــــ مرگئی ہے۔ اس کے بچے بھوکے پیاسے بلک رہے ہیں۔ کسی نے ان کے بالوں کو نہیں سنوارا۔ کسی نے ان کے کپڑے نہیں بدلے۔ کسی نے ان کے ماتھوں پر نظر سے بچنے کے ٹیکے نہیں لگائے۔ یکایک اس کا پتی ایک غیر عورت کو لے کر گھر میں آیا۔ وہ عورت بہت خوبصورت ہے۔ اس نے اس کے کپڑے اور زیور پہنے ہوئے ہیں۔ لیکن جونہی وہ اس کے بچوں کو دیکھتی ہے اس کی تیوریاں چڑھ جاتی ہیں۔ چہرے کے خطوط بگڑ جاتے ہیں۔ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگتے ہیں......اور پھر ـــــ پھر وہ بچوں سے دن بھر گھر

کا کام کراتی ہے اور شام کو ان کی جھوٹی جھوٹی شکایتیں کر کے اپنے شوہر سے پٹواتی ہے اور رات کے تاریک سناٹے میں بچے اپنی ماں کو یاد کر کر کے روتے رہتے ہیں۔ بلکتے رہتے ہیں اور پھر تھک کر سو جاتے ہیں، کیا میرے بعد میرے بچوں کا یہ حال ہو گا؟ موہنی پریشان ہو اٹھی۔ نہیں نہیں۔ میں جیوں گی۔ میں اپنے بچوں کی خاطر مرض سے لڑوں گی۔ مرض کو شکست دوں گی۔

موہنی زندہ رہنا چاہتی تھی۔ اس نے سدا زندوں کی طرح رہنا چاہا تھا۔ اس نے غریب شیکھر سے اپنی ماں کی مرضی کے خلاف صرف اس لیے شادی کی تھی کہ شیکھر سے جدا رہ کر وہ جیتے جی مر جاتی۔ مُردوں کی طرح جینا اسے پسند نہ تھا۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ غریب ہوتے ہوئے بھی اس کے لیے اچھے گھرانوں کے رشتے آئے تھے۔ وہ اگر چاہتی تو کسی امیر گھرانے میں شادی کر کے زندگی عیش سے گزارتی۔ لیکن اس نے ہر قسم کے بوجھ اور لالچ کو تیاگ کر شیکھر سے پریم وواہ کر لیا ـــــ شیکھر جو ۱۲۵ روپیہ ماہوار کا کلرک تھا۔

شادی کے بعد ایک سال انھوں نے بڑے سکھ اور شانتی میں بتایا تھا۔ جیون مسکراہٹوں اور قہقہوں کی لڑی بن گیا تھا۔ ان کی صبحیں روشن، شامیں سلونی اور راتیں نکھاری تھیں۔ گھر میں فرنیچر نہ تھا، ٹرنک میں ریشمی کپڑوں کے ڈھیر نہ تھے، مخملی ڈبّوں میں زیور نہ تھے، سیر کے لیے کار اور تفریح کے لیے روپے نہ تھے مگر محبت تھی خوشی تھی، شانتی تھی۔ گھر میں دو پرانی تھے۔ جو تنخواہ ملتی اس میں گزر کر لیتے اور زندگی کی دوسری آسائشوں کی کمی کو ان خوابوں سے پورا کرتے جو دونوں مل کر اس وقت دیکھا کرتے جب رات کا کاجل رچ جاتا۔ ستارے بڑے بڑے ہیروں کی طرح آسمان کی گہری نیلی مخمل پر جگ مگ کرنے لگتے اور چاند آسمان کی پیشانی پر جھومر کی طرح جھمکنے لگتا۔ وہ خواب دیکھا کرتے ـــــ ہمارے بچہ ہو گا، ہم اسے بڑے پیار سے پالیں گے۔ پڑھائیں گے لکھائیں گے۔ وہ بڑا ہو کر ایک خوبصورت جوان نکلے گا اور ہم بوڑھے ہو کر آرام کی زندگی گزاریں گے۔ سچا سادہ معصوم خواب، زندگی سے اپنے لیے نہیں بلکہ اپنے بچے کے ایک درخشاں مستقبل کی آس۔ جس دن ان کو اپنے اس

خواب کو پورا ہونے کی آس بندھی، وہ کس قدر خوش تھے۔ ان کی آنکھوں میں تارے ناچ رہے تھے اور ان کے کانوں میں ان کے ہونے والے بچے کی کلکاریاں گونج رہی تھیں۔ انھوں نے بڑے شوق اور بے قراری سے اس دن کا انتظار کرنا شروع کیا جب ان کا بچہ ان کی گود میں آئے گا۔

لیکن موہنی کو جوں جوں دن چڑھنے لگے، یہ شوق، یہ بے قراری مرجھاتی گئی۔ موہنی کی صحت گرنے لگی۔ وہ تھکی تھکی سی رہنے لگی۔ اس کے گالوں کا گلابی پن اور ہونٹوں کی سرخی غائب ہونے لگی۔ ناچتی ہوئی پتلیوں پر تھکی ہوئی پلکیں پڑنے لگیں۔ شیکھر اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا اور بتایا کہ جسم میں خون کی بہت کمی ہے۔ اسے وٹامن چاہئیں۔ لیور ایکسٹریکٹ چاہیے۔ خوراک میں مکھن، گھی، دودھ، پھل زیادہ سے زیادہ ملنے چاہئیں اور پورا آرام دیا جائے۔ وہ دونوں وہاں سے لوٹ آئے لیکن اب ان کے درمیان ایک پیارا سندر بالک ہی نہ تھا ان کے درمیان دوائیں، پھل، دودھ، گھی اور ایک نوکر بھی تھا۔ موہنی سوچ رہی تھی کہ بناسپتی کے بجائے اسے اصلی گھی کھانا چاہیے۔ صحت اچھی ہونے پر ہی بچہ تندرست پیدا ہو سکے گا۔ مگر ان سب چیزوں کے لیے روپیہ چاہیے، روپیہ۔ اور پہلی بار اس کی زندگی میں روپے کی اہمیت ابھر کر سامنے آئی۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ شیکھر کی تنخواہ بہت تھوڑی ہے۔ پہلی بار اسے خواہش پیدا ہوئی کہ شیکھر کے پاس بہت سی دولت ہو، اس کی تنخواہ زیادہ ہو ــــــ عیش کرنے کے لیے بلکہ ایک صحت مند زندگی گزارنے کے لیے۔ ایک صحت مند بچے کی ماں بننے کے لیے، ایک جیو آتما کو جنم دینے کے لیے۔

لیکن شیکھر ایک کلرک تھا اس کی تنخواہ بندھی ہوئی تھی آمدنی میں بناسپتی گھی اور چائے کے بھورے پانی کے علاوہ کسی اور چیز کی آشا کرنا پاگل پن تھا۔ موہنی کا چہرہ مرجھا گیا۔

اب ہر لمحہ اور ہر قدم پر موہنی کے سامنے تلخ حقیقت آ کھڑی ہوتی۔ زندگی کے متعلق جو رومان انگیز تصور اس نے باندھے تھے وہ اب منہ چڑاتے ہوئے بھاگنے لگے۔ موہنی کو محسوس ہونے لگا کہ وہ اپنے کو دھوکا دے رہی تھی۔ وہ ایک خیالی دنیا میں

رہ رہی تھی۔ جن چیزوں کی ضرورت کو اس نے شیکھر کی محبت میں فراموش کر دیا تھا وہ اب کانٹوں کی طرح اس کی زندگی کے راستے میں آن کھڑی ہوئی ہیں۔ اب موہنی کے دن شیکھر کے دفتر سے آنے کی آس میں، اور راتیں چاند تاروں کے رومان کی تلاش میں گزرنے کے بجائے الجھنوں، تشنگیوں اور محرومیوں کے لمحہ بہ لمحہ گھرے ہوتے ہوئے احساس میں بیتنے لگیں۔ ہر لمحہ ایک نئی محرومی کا احساس ہوتا ـــــ اور یہ احساس اس کے اور شیکھر کے درمیان جھنجھلاہٹ کی ایک دیوار کھڑی کرنے لگا۔ لیکن یہ سب کچھ صرف ایسے لمحوں میں ہوتا جب موہنی تھکی ہوتی۔ اس کی طبیعت گری ہوتی۔ کوئی کام کرنے کو جی نہ کرتا اور کام کا اونچا پہاڑ اس کے سامنے ہوتا۔ موہنی کے لیے کچھ طاقت کی دوائیاں لانے اور دودھ وغیرہ منگانے کی وجہ سے تنخواہ ضرورت سے زیادہ ناکافی معلوم ہونے لگی ـــــ اور اس کا نتیجہ یہ ہونے لگا کہ وہ دوائیں پیتے وقت یا غذا کھاتے وقت موہنی کے ذہن میں حساب کی گردان سی ہوتی رہتی ـــــ یہ چار روپے کی وٹامن کی گولیاں ہیں۔ لور ایکسٹریکٹ کی گولیاں، گیارہ روپے کی آتی ہیں۔ اور دودھ کا بل اب کے تیس روپے آئے گا۔ اور اسے محسوس ہوتا ہے جیسے اگلے مہینے گھر کی گاڑی کسی صورت نہ چل سکے گی۔ اور کھایا پیا اسے کچھ نہ لگتا۔ تکان، کمزوری، پریشانی، جھنجھلاہٹ ـــــ اور جیسے موہنی کے مزاج میں ایک غیر معمولی تبدیلی آنے لگی ـــــ ہونٹ بھنچے رہتے اور ماتھے پر ایک شکن ہر وقت پڑی رہتی۔ مگر ایسے لمحے بھی آتے جب ایک لمحے کے لیے گھٹائیں چھٹ جاتیں اور چاند اپنی پوری آب و تاب سے نکل آتا۔ انھیں حالات میں موہنی نے ایک بچی کو جنم دیا۔

بچی بہت خوبصورت تھی۔ اس کا گورا گول مٹول معصوم چہرہ دیکھ کر دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی۔ وہ اسے گود میں لے کر کھلاتے تو ان کے ماتھے سے پریشانی اور تردّد کی لکیریں تھوڑی دیر کے لیے مٹ جاتیں۔ وہ غیر شعوری کشیدگی جو موہنی اور شیکھر کے درمیان پچھلے چار پانچ مہینے میں پیدا ہوگئی تھی ایک حد تک دور ہو جاتی۔

اب ان کی زندگی میں پھر ایک ایسی چیز آگئی تھی جسے وہ مشترک طور پر پیار کر سکتے تھے۔ جس کے متعلق ہم آہنگی سے باتیں کر سکتے اور جس میں دونوں اپنے

غموں کو بھلا سکتے تھے۔ ماحول کی کشیدگی کم ہو گئی تھی۔ مگر یہ سب کچھ جذبات کی سطح پر تھا حقیقت کی سطح پر حالات زیادہ خراب ہو گئے تھے۔ بچی کے ہونے سے دس طرح کے خرچ بڑھ گئے تھے۔ آمدنی کسی طرح نہ بڑھی تھی۔ تنخواہ آتی اور پچھلے مہینے کا حساب چکاتے چکاتے ختم ہو جاتی اور پورے اکتیس دن کاٹنے کے لیے صرف پندرہ روپے ہاتھ میں رہ جاتے۔ وہ تمام خواہشیں اور وہ تمام منصوبے جو وہ اگلے مہینے پورا کرنے کی امید سے باندھتے خاک میں مل جاتے اور پھر تنگی اور کفایت شعاری اور من مارنے کا دور شروع ہو جاتا۔ اس تنگ حالی کے نشانات گھر میں دکھائی دینے لگے۔ کالروں، پتلونوں، ساڑیوں اور پلنگ کی چادروں میں جوڑ اور پیوند نظر آنے لگے۔ جو گلاس یا پیالے ٹوٹ جاتے ان کی جگہ نئے نہ آپاتے۔ بچی کے کپڑے بنانے کی آرزو پرانی ساڑیوں کو پھاڑ کر اور ان میں سے بنا پھٹے کپڑے نکال کر پوری کی جاتی۔ آنہ دو آنہ کے خرچ پر میاں بیوی میں کھینچا تانی ہوتی، سنیما اور سیر کرنا یکسر بند ہو گئے۔ پیسے پیسے کا حساب رکھا جانے لگا۔ دونوں میں سے جس کا رشتہ دار یا مہمان آجاتا اس کی گویا شامت آجاتی —— دونوں ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے کو دوڑتے۔ بد مزاجی اور چڑچڑاپن ان کے سبھاؤ میں رچ گیا —— ہر وقت گھر میں یہی سنائی دیتا —— 'کھانا ضائع نہ کرو، کپڑے نہ بنواؤ، کپڑے ہاتھ سے دھوؤ، کوئلہ کم خرچ کرو۔' غرض یہ کہ ذرا ذرا سی چیز پر روک ٹوک شروع ہو گئی۔ اب جب کبھی وہ ساتھ ساتھ بازار جاتے تو ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر مسکرانے اور ایک دوسرے میں مگن رہنے کے بجائے ان کی آنکھوں میں دوسرے مرد عورتوں کے سوٹ، ساڑیاں، بلاؤز، اوور کوٹ، زیور، بالوں کے جوڑے کھٹکتے۔ زندگی کا سکون غائب ہو گیا۔ محرومی کا احساس ہر لمحہ زیادہ شدید اور گہرا ہونے لگا اور پیار کی وہ دنیا جس میں شادی کے بعد ایک سال تک وہ مسکراہٹ اور پیار کے دن گزار رہے تھے اب مکمل طور پر برباد ہو گئی تھی۔

شاید اس حد تک بھی موہنی زندگی کے مقابلے میں ڈٹی رہ سکتی تھی۔ لیکن زندگی نے اس کی صحت کو بھی کھانا شروع کر دیا تھا۔ وہ ہر وقت تھکی تھکی رہتی۔ اس کی کمر اور گھٹنوں میں جان نہ رہی۔ اٹھتے بیٹھتے اس کی آنکھوں کے آگے سیاہی کے دائرے

پھیلتے اور سمٹتے۔ اس کی جلد کی سفیدی میں سرخی کے بجائے ہلدی جیسی زردی جھلکنے لگی۔ رخسار جو کبھی مسکراہٹ کی وجہ سے سدا دمکتے رہتے تھے، اب مرجھائے مرجھائے رہتے اور ہونٹ کنیر کی باسی کلیوں کی طرح بے رنگ ہو گئے۔

شیکھر کو موہنی کی گرتی ہوئی صحت کا احساس تھا۔ وہ جب دیکھتا کہ بلاؤز جو کبھی موہنی کے انگ انگ کو اجاگر کر دیتے تھے، اب ڈھیلے ڈھیلے لٹکتے رہتے ہیں اور چوڑیاں جو کبھی موہنی کی کلائیوں میں چندن کی ریکھاؤں کی طرح نظر آتی تھیں اب پونچیوں میں پڑی رہتی ہیں تو اس کی چھاتی میں گھونسا سا لگتا۔ وہ اس کو آرام پہنچانے کا پورا خیال رکھتا۔ وہ اپنا پیٹ کاٹ کے اور من مار کے اس کے لیے کچھ نہ کچھ لاتا رہتا۔ مگر مہنگائی اسے مات پہ مات دے رہی تھی۔ تنگی کر کے وہ جتنا خرچ کم کرتا تھا اتنا ہی چیزوں کے مہنگا ہو جانے سے بڑھ جاتا تھا۔ اب وہ ہاتھ پاؤں سے بھی موہنی کی مدد کرتا اور اسے زیادہ سے زیادہ آرام دیتا۔ کپڑے خود دھوتا۔ بستر خود بچھاتا۔ دفتر سے آکر بچی کو کھلاتا اور جب کبھی موہنی کی کمر اور اس کے سر میں درد ہوتا تو اپنی تھکن بھول کر گھنٹوں اس کا سر دباتا ـــــ لیکن اس کے قدموں کے نیچے کی زمین کھسکتی جا رہی تھی۔ گھر کی حالت سنبھلنے میں نہ آتی تھی اور موہنی کے جسم کی ہڈیاں نمایاں ہوتی چلی جا رہی تھیں۔

اس طرح آرام اور خوشی کے لیے چھینا جھپٹی کرتے کرتے زندگی کے دو سال گزر گئے۔ اب ان کی حالت اس قدر تنگ ہو گئی تھی کہ کھانے میں تنگی کرنے کی نوبت آ گئی۔ گوشت کے بجائے اب ان کے ہاں دونوں وقت دال پکنے لگی۔ کوئی مہمان آ جاتا یا کچھ لینا دینا پڑ جاتا تو قرض سر پر سوار ہو جاتا ـــــ زندگی کی چکی میں پستے پستے ان کے جذبات بھی سرد پڑ گئے۔ اب کئی کئی دن تک وہ ایک دوسرے سے بات نہ کرتے۔ انھیں خیال بھی نہ ہوتا کہ انھوں نے کئی دنوں سے ایک دوسرے سے باتیں نہیں کی ہیں۔ موہنی اپنے حلقہ میں گھومتی رہتی، شیکھر اپنے دائرے میں گردش کرتا رہتا ـــــ رات کو دونوں اپنے اپنے جوئے سے مکتی پا کر نیم جان سے چارپائی پر پڑ رہتے۔ پیار کرنے کو، چاؤ سے باتیں کرنے کو، دیکھ کر مسکرانے کو زندگی میں کچھ نہ رہا تھا۔ چاند ان کے لیے بجھ گیا تھا اور تارے ان کے لیے چیچک کے سوکھے ہوئے داغ بن

گئے تھے۔ اب ان کے دل میں ایک دوسرے کے لیے کوئی جذبہ پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ چپ چاپ گھر میں چلتے پھرتے، کام کرتے، پڑ کر سو جاتے۔ کبھی کبھار ایک آدھ لفظ منہ سے نکل جاتا، چونک کر نگاہیں مل جاتیں مگر راکھ کی چنگاری کی طرح صرف ایک لمحے کے لیے ـــــ پھر وہی غیریت ـــــ بے حسی ـــــ مٹیالی مُردنی۔

اسی غیریت، بے حسی، مٹیالی مردنی کے سائے میں موہنی دوبارہ حاملہ ہو گئی ۔ زندگی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی گئی۔ موہنی کے جسم میں بچہ جوں جوں پرورش پانے لگا موہنی کے ہونٹوں کی خشکی، آنکھوں کا پھیکا پن اور رگوں کا نیلا پن زیادہ نمایاں ہوتا گیا۔ جسم نے اس دوسری جان کو سینچنے سے انکار کر دیا۔ موہنی نے کھاٹ پکڑ لی۔ بچہ پیدا ہونے سے پہلے ہی حرارت رہنے لگی۔ بچہ ہوا تو بخار نے آ دبوچا۔ بخار جڑ پکڑ گیا اور موہنی کی زندگی کی جڑ کھوکھلی ہو گئی اور ایک دن ڈاکٹر نے کہہ ہی دیا "موہنی کو دق ہو گئی ہے۔"

موہنی کمرے میں پڑی رہتی۔ شیکھر اور اس کی بہن جو تیمار داری کے لیے آئی ہوئی تھیں، نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ کمرے ہی میں نہیں بلکہ سارے گھر میں سناٹا تھا۔ پاس ہی پالنے میں بچہ پڑا سو رہا تھا ـــــ میرا لال، میرا چاند ـــــ کیا میں اپنے چاند کو اپنی گود میں لے کر نہ کھلا سکوں گی؟ جس کو میں نے اپنے خون سے سینچا ہے، کیا اسے بے سہارا چھوڑ کر چلی جاؤں گی؟ نہیں نہیں! میں نہیں مروں گی، میں جیوں گی! ـــــ میں نے اس دنیا میں ایک نئی زندگی کو جنم دیا ہے۔ کیا دنیا اس کے بدلے مجھے میری زندگی کا دان نہیں دے گی؟ مجھے میری زندگی کا دان دیا جا سکتا ہے۔ میرا علاج کر کے، مجھے اچھی غذا دے کر، ہوا اور روشنی دے کر۔ یہ میرا حق ہے۔ میرا حق مجھے ملنا چاہیے۔ ـــــ میرا حق مجھے ملنا چاہیے! اس کی آتما پکار اٹھی۔

لیکن اس کی آتما کی پکار کسی نے نہ سنی کیوں کہ کمرے میں کوئی نہ تھا اور کھڑکیاں اور روشن دان بند تھے۔

جیلانی بانو

جیلانی بانو ۱۴ جولائی ۱۹۳۶ء کو بدایوں (اتر پردیش) میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے ۱۹۵۴ء میں اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ ان کے والد علامہ حیرت بدایونی نے جو خود بھی اردو اور فارسی زبانوں کے عالم اور شاعر تھے، ان کی کافی حوصلہ افزائی کی۔

جیلانی بانو کی تخلیقات سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اشتراکیت اور ترقی پسندی سے اچھی خاصی متاثر ہیں۔ ان کی تخلیقات میں تقسیم ملک سے پیدا شدہ صورتِ حال، ہندوستانی مسلمانوں پر تقسیم ملک کے اثرات اور عام طور پر مسلمانوں کو درپیش سماجی، سیاسی اور ثقافتی مسائل کے تجزیہ اور حالات کی بھرپور عکاسی نظر آتی ہے۔ گاؤں کے غریب پسماندہ لوگ اور ان کے مختلف مصائب و مسائل، فرقہ وارانہ تصادم، استحصالی عناصر کی چالبازیاں اور حالاتِ حاضرہ میں خواتین کو درپیش مسائل ان کی تحریروں کے موضوعات ہیں۔

ان کے بیشتر افسانوں کا پس منظر حیدر آباد دکن ہے۔ اس پس منظر میں وہ متوسط مُسلم سماج کے افراد کی اس نفسیاتی کش مکش کو اجاگر کرتی ہیں، جہاں ایک طرف تو وہ اپنی پرانی سماجی اور خاندانی روایات اور قدروں کا بوجھ اٹھائے پھر رہے ہیں، اور دوسری طرف سماج میں ابھرتی ہوئی نئی قدروں کے ساتھ بھی سمجھوتہ کرنے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے اس متوسط طبقے کے ثقافتی بحران کو بھی

اُجاگر کرتی ہیں، جس کا سامنا ان کو ہندوستان سے ہجرت کرنے کے بعد پاکستان میں کرنا پڑا۔

جیلانی بانو کے یہاں رومانی اور سماجی حقیقت نگاری کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ان کو اس دور کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی مسائل کا پورا ادراک ہے۔ وہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کو ایک متاعِ عزیز سمجھتی ہیں، جس کی حفاظت وہ اپنے لیے ایک فرض سمجھتی ہیں۔

جیلانی بانو کے ناول 'ایوانِ غزل'، 'بارشِ سنگ' اور افسانوی مجموعے 'روشنی کے مینار'، 'نروان'، 'پرایا گھر'، 'روز کا قصہ'، 'یہ کون ہنسا؟'، 'تریاق' اور 'سچ کے سوا' خاصے مقبول ہوئے۔ ان کے دو ناولٹ 'جگنو اور ستارے' اور 'نغمے کا سفر' بھی شایع ہو چکے ہیں۔

ان کو ۱۹۸۵ء میں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ جیلانی بانو حیدر آباد میں مقیم ہیں۔

جیلانی بانو

اَدّو

آج اڈو اچانک بہت بڑا اور سب سے اہم بن گیا تھا۔ جیسے پتھر اپنوں سے کٹ کر خدا بن جاتا ہے۔

اڈو کو بھی آج دنیا کی ہر چیز حقیر اور ناقابل تسخیر نظر آرہی تھی۔ کیوں کہ آج وہ اپنے آپ کو صاحب کی طرح اونچا محسوس کررہا تھا۔ آج اس کی جیب میں ایک روپیہ تھا۔ سچ مچ کا ایک روپیہ۔ اسی لیے تو جیب کی طرف سے وہ ایک طرف کو جھک گیا تھا۔ آج اسے معلوم ہوا کہ ہوائی جہاز اپنے آپ، بغیر کسی ڈور کے سہارے آسمان پر کیسے اڑتا ہے۔ صاحب کی موٹر کیسے زن سے چل نکلتی ہے اور سرکس میں پہلوان کیسے ہاتھی کو اپنے سینے پر کھڑا کرلیتا ہے۔ یہ سب پیسے کا کس بل ہے میاں۔ اس کا چچا مستان ٹھیک کہتا تھا۔

اسی وجہ سے آج اڈو بھی بازار میں یوں چل رہا تھا جیسے اس کی ٹانگیں دو بانس اونچی ہو گئی ہوں اور وہ نیچے کی غریب مخلوق کو روندتا ہوا گزر رہا ہو۔

فٹ پاتھ کے ہر خوانچہ فروش سے اس نے پوچھا۔

"گاجریں کتنے میں دوگے؟ سیتا پھل روپے میں کتنے دوگے؟ ایک روپے والی آئس کریم ہے؟"

ان سب چیزوں کے نام پوچھ کر اس کے دل میں ایسی ٹھنڈک ہو گئی جیسے اس

نے ایک روپے والی آئس کریم کا پورا گلاس کھالیا ہو ـــــ اکثر جب وہ بیگم صاحبہ کے ساتھ بازار جاتا تھا تو اسے سخت تعجب ہوتا کہ اتنے سنترے، آئس کریم، چاٹ اور مٹھائیاں بک رہی ہیں مگر پرس میں روپے رکھنے کے باوجود بیگم صاحبہ کا دل کیوں نہیں چاہتا کہ یہ سب چیزیں کھالیں۔ وہ بھی ایک روپے میں دنیا بھر کا ہر ذائقہ چکھ سکتا ہے۔ ہر چیز خرید سکتا ہے۔ پھر بے صبرا پن کیوں کرے۔؟ پہلے وہ بھی تمام ندیدے بچوں کی طرح سوچا کرتا تھا کہ کہیں سے ایک روپیہ مل جائے تو منٹ بھر میں کھاپی ڈالے۔

مگر دولت انسان کو بردباری بھی سکھا دیتی ہے۔ اس نے روپیہ جیب میں رکھا تو بڑا مطمئن سا ہو گیا تھا۔

روز کی طرح آج بھی بیگم صاحبہ نے لات مار کر اسے اٹھایا تو اڈو کو کیا معلوم تھا کہ آج کا سورج اڈو کی قسمت بدلنے والا ہے۔ یہ سب جھوٹ نہ بولنے کا نتیجہ تھا۔ مولوی صاحب کے کہنے پر اس نے کبھی جھوٹ نہ بولنے کی قسم کھائی تھی۔ اپنے دل سے وعدہ کیا تھا کہ کبھی چوری نہ کرے گا۔ جب کبھی اس کا دل کسی چیز کے لیے للچاتا تو وہ دھڑکتے دل سے الف، لام، میم کا سپارہ اٹھا کر چوم لیتا، بس فوراً سکون مل جاتا۔ مولوی صاحب کہتے کہ جنت کے دروازے چوری نہ کرنے والوں کے لیے کھلے ہیں۔ وہ جنھوں نے چوری نہیں کی۔ جھوٹ نہیں بولے ـــــ اڈو کے پسینے اور میلے میں ڈوبے ہوئے کپڑوں سے اچانک جنت الفردوس کے عطر کی خوشبو بھنبھنا آنے لگتی۔ یہ دنیا تو سرائے فانی ہے۔ جو بھی تکلیفیں ہیں پل بھر میں ختم ہو جائیں گی اور پھر نیک دل انسانوں کے لیے فرشتے جنت کے دروازے کھول دیں گے۔ جب صدیق اور شفیق مولوی صاحب سے قرآن شریف پڑھتے تھے تو اڈو دور بیٹھا مولوی صاحب کی ساری باتیں اپنے دل میں اتار لیتا تھا۔ حالانکہ صدیق اور شفیق کو مولوی صاحب کی ساری باتیں یاد رہتیں نہ سبق۔ کتنی بار خوانچے میں رکھے ہوئے پھلوں نے اسے اشارہ کیا، میز پر رکھی ہوئی مٹھائیوں نے اسے بلایا۔ بیگم صاحبہ کے پان دان سے اٹھنی، چونی گر گئی تو اس نے جھاڑو دیتے وقت یوں اٹھائی جیسے جلتا ہوا انگارا چھولیا ہو۔ بھلا ایک چونی کی خاطر دوزخ کا عذاب کیوں مول لے گا!

رات کو جب تھکن کے مارے نیند نہ آتی تو وہ سوچتا ـــــ عید کب آئے گی! عید کے دن صاحب ایک اٹھنّی ضرور دے دیں گے۔ بیگم صاحبہ تو چونّی سے زیادہ کبھی نہیں دیتیں۔ شاید چھوٹے میاں بھی ایک چونّی دے دیں، ایک روپیہ ہو جائے گا۔ آٹھ کی آئس کریم، دس پیسے کے چنے، چار آنے کا شربت ـــــ ارے نہیں اتنا چٹورپن ٹھیک نہیں ہے۔ وہ روپیہ میں آپا کی منّی کو دے آؤں گا۔ آپا بے چاری سسرال میں کتنی دبلی ہو گئی ہے۔ ایک بار وہ پانچ میل چل کر آپا کے گھر گیا تھا تو آپا اسے دیکھ کر بالکل خوش نہ ہوئی۔ ایک کونے میں لے جا کر بولی۔

"اڈو تو یہاں مت آیا کر۔ میری ساس طعنے دیتی ہے کہ ماموں کیا لایا ہے منّی کے لیے؟"

"بس تو اب کی عید پر منّی کو ایک روپیہ دے آؤں گا۔ آپا خوش ہو جائے گی ـــ مگر روپے کی بھنک کان میں پڑتے ہی اماں سر پر کھڑی ہو جاتی ہے، بہت رونے دھونے پر شاید دس پیسے دے دے۔

بہت دن ہو گئے صاحب نے کہا تھا کہ اڈو کو ایک چونّی دیں گے کیوں کہ وہ روز صبح اِن کی کار کو آدھا میل تک دھکا دیتا تھا۔ پھر کار کے اسٹارٹ ہوتے ہی وہ زن سے چلے جاتے اور چونّی کی بات دوسرے دن پر ٹل جاتی تھی۔

آج بھی جب وہ صاحب کی کار ڈھکیلنے میں ہانپ رہا تھا تو سوچا کہ آج چونّی کی بات کیا صاحب کو یاد دلا دوں! مگر صاحب کو شاید خود ہی یاد آ گیا۔ انھوں نے پرس نکالا اور چونّی ڈھونڈی، نہ ملی تو پرس بند کر کے جیب میں رکھا اور کار اسٹارٹ کر دی۔ اپنے میلے ہاتھوں کو دباتے میں اڈو ہانپنے لگا۔ روز کار ڈھکیلنے سے اس کے سینے میں درد ہونے لگا تھا۔ گیٹ کی طرف مڑتے ہی اس کی نظر زمین پر گئی اور وہ تیزی سے ادھر جھپٹا۔ اس کی مٹھی میں ایک روپیہ کا کرارا نوٹ تھا۔ سچ مچ کا نوٹ۔ خوف اور خوشی کے مارے وہ کانپنے لگا۔ روپے کا نوٹ اتنا وزنی تھا کہ وہ روپے سمیت ایک قدم بھی نہ اٹھا سکا۔ جن کے پاس بہت سے روپے ہوتے ہیں وہ جانے کس عذاب میں گرفتار ہوں گے۔ اڈو نے بڑے دکھ سے سوچا ـــــ اب صاحب کی کار چوراہے سے مڑ چکی تھی اور کھلے ہوئے

گیٹ کے باہر کوئی نہیں تھا۔

روپیہ ہاتھ میں آتے ہیں اڈو اندیشوں اور خطروں میں گھر گیا۔ وہ ایک روپے کی دولت سمیٹے اکیلا تھا اور ساری دنیا لٹیروں سے بھری ہوئی تھی۔ بوجھل پیروں کو گھسیٹتا ہوا وہ آہستہ آہستہ بازار کی سمت جانے لگا اور پھر فٹ پاتھ پر بیٹھ کر غور سے روپے کو دیکھنے لگا۔ اسے دبا دبا کر تہہ کیا، ایک کاغذ میں لپیٹا اور احتیاط سے جیب میں رکھ لیا۔ اب اس میں ایک دولت مند انسان کی سوجھ بوجھ آچکی تھی۔ اب اس کے منہ میں نہ جانے کتنی چیزوں کا ذائقہ گھل رہا تھا اور خوف کی دھند چاروں طرف پھیل رہی تھی۔

چاؤس کی دکان پر ایک لڑکی ناریل خرید رہی تھی۔

"مجھے بھی ایک روپیہ کا ناریل دینا ـــــ" مگر گاہکوں کی بھیڑ میں چاؤس نے اس کی بات نہیں سنی۔ اچھا ہی ہوا۔ اگر وہ اس روپے کا ناریل کھالیتا تو قیامت کے روز اللہ میاں اس کے ہاتھوں پر انگارے رکھیں گے۔ انگارے کی جلن سے گھبرا کر اس نے ہاتھ کھینچا تو روپیہ نیچے گر گیا۔ جلدی سے اٹھا کر پھر ایک بار نوٹ کو غور سے دیکھا۔ روپے پر تین شیروں کی تصویر بنی تھی۔ جیسے وہ شیر پہرہ دے رہے ہوں کہ اس روپے کو کوئی بے ایمانی سے چرا نہ لے۔

پاس سے ایک آدمی گزرا تو اس نے بڑے غور سے اڈو کو دیکھا۔ جیسے پہچان لیا ہو کہ وہ چور ہے۔ کہیں پولیس کو اطلاع نہ دے دے! ہتھکڑی پہن کر تھانے جانا پڑے گا ـــــ وہ خوف سے لرزنے لگا۔

اللہ میاں مجھے بچالے ـــــ میرے مولا بلا لو مدینے مجھے ـــــ مگر چوری کر کے مدینے جائے گا بے شرم ـــــ لعنت ہے تجھ پر ـــــ اڈو کے بچے! یہ لو ـــــ یہ تو گھر والی گلی آگئی۔ اماں پوچھے گی۔ روپیہ کہاں سے آیا۔ جھوٹ بولنا پڑے گا ـــــ چوری اور جھوٹ ـــــ؟ خوف کے مارے وہ لرزنے لگا ـــــ

لو ـــــ گیارہ بج گئے ـــــ بیگم صاحب چلا رہی ہوں گی کہ آج اڈو کہاں مر گیا ـــــ گوشت ترکاری کون لائے گا؟ جھاڑو کون دے گا؟ کپڑے کون دھوئے گا؟ بچوں کا ٹفن اسکول لے کو کون جائے گا؟ وہ یوں سرپٹ بھاگا جیسے بیگم صاحبہ

کی آواز سن لی ہو۔ لے کر اچھا خاصا نام بگاڑ دیا۔ اس کا نام تو آدم علی خاں تھا مگر انسانوں نے آدم کے نام کی جس طرح تذلیل کی ہے اڈو بھی اس سے نہ بچ سکا۔ اس کے نام کے بھی سارے پھول پتے جھڑ گئے اور وہ نرا اڈو رہ گیا۔ اب میں یہ روپیہ آپا کی منّی کو دے آؤں گا۔ آپا خوش ہو جائے گی ـــــ ممکن ہے دال چاول بھی کھلا دے۔ اب تو بھوک لگ رہی ہے۔ آدھا دن گزر گیا۔ آج ناشتہ بھی نہیں کیا۔ مگر آپا کی سسرال پانچ میل دور تھی۔ پاؤں دکھ جائیں گے۔

پھر بھی وہ چلتا رہا ـــــ منّی کو روپیہ دینے کی خوشی میں، گرم سڑک پر پاؤں جل رہے تھے۔ اس روپے کی چپل خرید لوں؟ پرانی چپلیں موچی ایک روپے میں دے دیتا ہے۔ مگر پھر آئس کریم کیسے کھاؤں گا؟

ایک ٹھیلے میں پکے پکے موز بک رہے تھے۔ بہت دنوں سے اس کا جی چاہ رہا تھا کھانے کو۔ جلدی سے اس نے ایک موز خرید لیا۔ پھر جب ٹھیلے والے نے ایک اٹھنّی اور ایک چونّی واپس کی تو اڈو کا دل دھک سے ہو گیا ـــ لو۔ روپیہ ختم ـــ صرف ایک اٹھنّی اور ایک چونّی رہ گئی۔ "نہیں چاہیے مجھے موز ـــــ "اس نے جلدی سے موز ٹھیلے میں رکھ دیا اور اپنا روپیہ مٹھی میں دبا لیا۔ اللہ تیرا شکر ہے۔ میرا ایمان بچ گیا۔ موز کھا لیتا تو اٹھنّی اماں چھین لیتی اور قیامت کے دن کوئی اماں اپنے بچوں کو نہیں پہچانے گی۔ ہر شخص کے گناہوں کا بوجھ اس کی گردن پر ہو گا۔ اماں بھی اٹھنّی کے چاول لا کر پکائے گی اور دوزخ کے سانپ بچھو مجھے کاٹیں گے۔

اب آپا کا گھر سامنے نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنی جھونپڑی کے سامنے بیٹھی منّی کے سر میں جوئیں دیکھ رہی تھی۔

منّی کو سامنے دیکھ کر وہ خوشی کے مارے دوڑنے لگا۔

مگر روپیہ منّی کو دے کر بھی تو دوزخ کا عذاب بھگتنا پڑے گا۔

وہ ٹھہر گیا۔ پیاس اور بھوک کے مارے حلق خشک ہو رہا تھا ـــــ سامنے ہوٹل کے اوپر بہت بڑی فنٹا کی بوتل بنی تھی جس سے میٹھے ٹھنڈے شربت کی دھار ٹپک رہی تھی۔ کتنا مزہ آئے گا یہ شربت پی کر ـــــ اڈو نے مٹھی میں دبا ہوا روپیہ

غور سے دیکھا ـــــ مگر وہ روپیہ آئینہ بن گیا۔ جس میں دوزخ کے شعلے اس کی طرف لپک رہے تھے۔

نڈھال، تھکا ہوا، دوزخ کی آنچ میں سلگتا ہوا بھوکا پیاسا اڈو آہستہ اہستہ لوٹنے لگا ـــــ آپااور منّی سے ملے بغیر ـــــ

"ابے اڈو، اڈو کے بچے۔ آج صبح سے کہاں غائب ہے تو ـــــ تیری بیگم صاحب خفا ہو رہی ہیں۔" پڑوس کی ماما نے اسے دیکھ کر پکارا۔ گھبرا کر اڈو روپیہ جیب میں ڈالنے لگا تو وہ قریب آگئی۔

"کیا تو بنگلے سے کچھ چرا کر بھاگا ہے آج؟" ماما تشویش بھرے انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

"نہیں تو ـــــ میں چوری کیوں کروں گا ـــــ"

اس نے ماما کو ٹال دیا۔ مگر آنسو دب کر تھمنے کو تیار نہیں ہوئے۔ کہیں بیگم صاحب کو بھی معلوم ہو گیا کہ وہ روپیہ چرا کے بھاگا ہے تو وہ پولیس کو بلالیں گی۔ لوگ اسے چور چور پکاریں گے۔ وہ ابھی جا کر روپیہ بیگم صاحب کو دے دے گا۔ بیگم صاحب خوش ہو جائیں گی۔ سارے محلے میں اس کی ایمانداری کے چرچے ہوں گے۔ محلے کے دوسرے نوکروں کو اس کی مثالیں دی جائیں گی اور پھر جنت کے دروازے اس کے سامنے کھلنے لگے۔ مرے مرے قدموں سے وہ پھاٹک میں داخل ہوا۔ اس کی آمد کی اطلاع پہلے ہی پہنچادی گئی اور سارے محلے کی لونڈیاں بیگم صاحب کی عدالت میں اس کے مقدمہ کا فیصلہ سننے کو اکٹھی ہو چکی تھیں۔

"صبح گیٹ کے پاس پڑا ملا تھا ـــــ" میل اور پسینے میں بھیگا ہوا روپیہ اس نے بیگم صاحب کے سامنے رکھا۔ وہ ورانڈے میں کرسی پر لیٹی اخبار دیکھ رہی تھیں۔ اخبار رکھ کر انھوں نے اڈو کو گھورا اور دھم سے اس کے منہ پر ایک تھپڑ مار کر بولیں۔

"چوٹٹے، سچ سچ بتا ـــــ تو نے آج اور کتنے روپے چرائے ہیں، جن سے سارا دن گلچھرّے اڑا تا رہا ہے ـــــ؟"

آمنہ ابوالحسن

آمنہ ابوالحسن (اصلی نام آمنہ بانو) ۱۰ مئی ۱۹۴۱ء کو حیدر آباد (آندھرا پردیش) میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد ابوالحسن سید علی ایک نامور وکیل اور معروف سیاست داں تھے۔ ان کے خیالات اور سیاسی کشمکش کا آمنہ ابوالحسن کی تحریروں پر خاصہ اثر رہا ہے۔

آمنہ ابوالحسن کی پہلی کہانی 'ساقی' میں ۱۹۵۱ء میں شایع ہوئی۔ انھوں نے مجموعی طور پر چھ ناول اور دو افسانوں کے دو مجموعے شایع کیے ہیں۔ وہ ہندو مسلم اتحاد اور فرقہ واریت جیسے موضوع پر بہت شدت کے ساتھ لکھتی ہیں۔ ان کی تحریروں سے ان کی انسانی نفسیات میں دلچسپی کا واضح اندازہ ہوتا ہے۔

آمنہ ابوالحسن کا ادبی سفر جاری ہے۔

ان کے ناولوں 'سیاہ سرخ سفید'، 'تم کون ہو؟' اور 'واپسی' کو یو۔پی اردو اکادمی کے نقد انعامات، 'آواز' کو بہار اردو اکادمی انعام اور 'پلس مائنس' اور 'یادش بخیر' کو یو۔پی اردو اکادمی اور دلّی اردو اکادمی کے نقد انعامات سے نوازا گیا ہے۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں 'کہانی' اور 'بائی فوکل' شامل ہیں۔

وہ آج کل حیدر آباد میں مقیم ہیں۔

آمنہ ابوالحسن

کاش

عجیب شور و غوغا برپا تھا۔ لوگ چاروں طرف سے نہ جانے کس کو گھیرے ہوئے اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ ایسے میں زناٹے سے کار میں گزرتے ہوئے ذکی نے کار روک کر اژدہام پر نظر ڈالی پھر کار فٹ پاتھ کے کنارے روک کر نیچے اتر آیا۔

"کیا ہو گیا بھائیو۔ اتنا ہنگامہ کس لیے مچا ہوا ہے یہاں۔" اس نے بلند آواز سے دریافت کیا۔ تو ہجوم میں سے ایک شخص نے اسے بتایا۔

"بڑی گڑبڑ ہے صاحب جی۔ اغوا کا معاملہ ہے شاید۔"

"اغوا؟" ذکی ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھا اور لوگوں کے وسط میں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکی زمین پر چیخ چیخ کر رو رہی ہے اور اس کے قریب بیٹھی ہوئی دوسری جوان لڑکی اسے منانے سمجھانے کی کوشش میں پسینہ پسینہ ہوئی جا رہی ہے۔ ذکی نے غور سے ان دونوں کو دیکھا۔ پھر دوسری والی لڑکی سے پوچھا "کیا قصہ ہے محترمہ۔"

"اجی قصہ کیا ہونا ہے۔" کوئی اور بولا۔

"یہ محترمہ یقیناً زور زبردستی اس لڑکی کو اٹھا لے جانا چاہتی تھیں کہ لڑکی مچل گئی اور تب سے اب تک برابر چلائے جا رہی ہے۔"

"بالکل جناب ورنہ اپنے کسی جاننے والی کے ہمراہ جانے کے لیے لڑکی کو اس طرح مچلنے کی ضرورت ہی نہ پیش آتی۔" کسی اور نے تائید کی۔

"مائی گڈ نیس" ذکی کو عجیب سی سنسنی محسوس ہوئی اور اس بار اس نے چبھتی ہوئی نظروں سے جوان لڑکی کو گھورتے ہوئے درشتی سے کہا۔

"بڑے افسوس کی بات ہے محترمہ کہ اتنی مہذب ہو کر ایسی گھٹیا حرکت کرتے ہوئے ذرا بھی شرم نہیں آئی آپ کو ____؟"

زیبا سر تھام کر چلائی۔ "یہ غلط ہے۔ الزام ہے سراسر۔ میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔ اتنی دیر سے سمجھا رہی ہوں کہ یہ میری چھوٹی بہن ہے مگر کوئی سمجھتا ہی نہیں۔ اب کیسے یقین دلاؤں، سمجھاؤں آپ لوگوں کو۔"

"چہ خوب۔" لوگوں کا ایک ملا جلا طنزیہ قہقہہ ابھرا۔ "اگر یہ آپ کی بہن ہے تو اس طرح رو پیٹ کیوں رہی ہے۔ من کیوں نہیں جاتی، آپ کے منانے سے۔"

"بتایئے بتایئے۔" ذکی نے طیش میں آتے ہوئے کہا "گویا اغوا کا اندیشہ غلط نہیں ہے۔"

"سو فیصد درست ہے جناب خواہ یہ محترمہ کتنے ہی بہانے تراش لیں۔" کسی نے لن ترانی کی۔

"سن لیا محترمہ آپ نے۔ آخر اتنے سارے لوگوں کو غلط کہنے کی کیا ضرورت ہے۔"

زیبا اپنی پیشانی پر ابھر آنے والا پسینہ اپنے دوپٹے کے کنارے سے پونچھتی ہوئی بے بسی سے بولی۔

مت کیجیے یقین۔ جہنم میں جایئے آپ سب میری بلا سے مگر حقیقت یہی ہے کہ یہ میری چھوٹی بہن ہے بس۔"

"حد ہو گئی ڈھٹائی کی۔ تو پھر آخر اس طرح کیوں رو رہی ہے بلا سبب۔"

"کیوں کہ یہ ایک کمزور ذہن کی ریٹارڈڈ لڑکی ہے اس لیے جسمانی طور پر صحت مند دکھائی دینے کے باوجود ذہنی طور پر ایب نارمل۔"

"ہاہاہا۔" لوگوں نے پھر استہزائیہ قہقہے لگائے۔

"کوئی احمق ہی یقین کرے گا کہ اتنی بڑی لڑکی اتنی نا سمجھ ہو سکتی ہے۔" مگر ذکی ٹھٹھک گیا۔

"ایک منٹ بھائیو۔ ایک منٹ۔" اس نے ہنسنے والوں کو روکا۔ "ابھی امتحان ہوا جاتا ہے اس بات کا۔" اور جھک کر لڑکی کے قریب اکڑوں بیٹھ گیا۔

"آپ کا نام کیا ہے بے بی۔" اس نے بسورتی ہوئی لڑکی سے ملائمت سے پوچھا۔

جواب میں بسورتی ہوئی لڑکی نے ایک زور کی چیخ ماری اور ذکی کو کھسوٹ ڈالا۔ ذکی گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور لوگ بھی ٹھٹھک کر دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔

غالباً جوان لڑکی سچ ہی کہہ رہی ہے، ذکی نے سوچا ورنہ ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکی کا یوں سر راہ چیخنا چلانا قرینِ قیاس نہیں۔ تب زیبا کی طرف وہ مڑ کر بولا۔

"کیا آپ کوئی ثبوت پیش کر سکتی ہیں تاکہ لوگ مطمئن ہو جائیں۔"

"جی نہیں۔" زیبا جھلا کر بولی۔ "سر راہ میں ایسا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتی۔" تصدیق ہی چاہتے ہیں آپ تو میرے ساتھ گھر چلیے۔ وہیں میں آپ کو مطمئن کر سکوں گی۔" ذکی نے سکنڈ بھر کے لیے سوچا پھر بولا۔

"چلیے۔ رفعِ شک تو ضروری ہے۔ میں آپ کے ساتھ ضرور چلوں گا۔ ادھر اس طرف میری کار موجود ہے۔ میں آپ لوگوں کو آسانی کے ساتھ گھر پہنچا دوں گا۔

"شکریہ لیکن ہم آپ کی کار میں نہیں جائیں گے۔ مہربانی کر کے ہمارے لیے ٹیکسی بلوا دیں۔"

"ٹیکسی ہی سہی۔" ذکی نے پلٹ کر ایک آدمی سے ٹیکسی بلوانے کی درخواست کی۔ تھوڑی دیر میں ٹیکسی آ گئی۔

"کیا ہم میں سے کوئی آپ کے ساتھ چلے جناب۔" ہجوم میں سے کسی متجسّس شخص نے ذکی سے پوچھا۔

"اس کی ضرورت نہیں بھائی۔ تصدیق کے لیے میں گناہ گار کافی ہوں۔ اگر

معاملہ گڑبڑ ہوا تو بلا تامل پولیس کی مدد طلب کرلوں گا۔" تب ذکی نے زیبا کے ساتھ سہارا دے کر مچلتی ہوئی لڑکی کو زمین سے اٹھایا اور ہجوم نے دو حصوں میں تقسیم ہو کر اپنے درمیان سے گزرنے کا راستہ دیا۔ چلاتی ہوئی لڑکی اب بھی ہاتھ پیر چلا رہی تھی اور بدستور مچل رہی تھی مگر زیبا اور ذکی نے کسی نہ کسی طرح اسے سنبھال کر ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بٹھلا دیا۔ تب اس کے برابر بیٹھ کر دروازہ بند کرتے ہوئے زیبا نے ذکی سے کہا۔

"ہمارے ساتھ ساتھ چلے آیئے اور ڈرائیور کو اپنے گھر کا ایڈریس سمجھانے لگی۔ آگے پیچھے دوڑتی ہوئی دونوں گاڑیاں کوئی پندرہ منٹ بعد ہی زیبا کے بنگلے کے آگے جار کیں۔

زیبا نے ٹیکسی سے اتر کر چابی سے گیٹ کھولا۔ پھر بیرونی برآمدے میں پہنچ کر کال بیل بجانے کے بعد اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر کی خادمہ نمودار ہوئی۔

ذکی اپنی کار کے بونٹ سے ٹکا سب دیکھ رہا تھا۔ خادمہ نے اس پر ایک سرسری نظر ڈال کر زیبا سے پوچھا۔ "کیا ہوا بڑی بٹیا۔ کہیں چھوٹی بٹیا بکھر تو نہیں گئیں۔"

"یہی بات ہے بُوا۔ میں نے بڑے غلطی کی جو تمھیں ساتھ نہ لے گئی۔ خیر اب جاکر زرّین کو ٹیکسی سے اتارو اور اندر لے جاؤ۔ میں بھی آرہی ہوں۔"

یہ سن کر خادمہ تیزی سے ٹیکسی کی طرف بڑھی۔ روتی بسورتی زرّین کو منا سمجھا کر ٹیکسی سے نیچے اتارا اور سہارا دے کر چمکارتی ہوئی بنگلے کے اندر لے جانے لگی تب زیبا نے لاتعلق کھڑے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ دیا اور ذکی سے بولی۔ "آیئے۔"

ذکی نے محسوس کیا کہ گھر پہنچتے ہی بپھری ہوئی لڑکی خاموش ہو گئی تھی اور بڑی آسانی سے خادمہ کے ساتھ بنگلے میں چلی گئی تھی تو کیا وہ اپنا گھر پہچانتی ہے......؟ یہی سوچتے ہوئے اس نے اندر پہنچ کر نشست لی اور زیبا نے خادمہ کو آواز

دے کر بتلایا۔

"ذرا آنٹی کو آواز دے لینا بوا۔ کہنا جلد آ جائیں مجھے ان کی ارجنٹ ضرورت ہے۔"

تب زیبا بھی کرسی پر ٹک کر اپنی بکھری ہوئی لٹیں سمیٹ سمیٹ کر پنوں میں اڑسنے لگی۔ پھر ایک طویل سانس لے کر اس نے ذکی سے پوچھا۔

"اب بتائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔"

"اس سلسلے میں، میں سب سے پہلے آپ کے والدین سے ملنا چاہوں گا محترمہ۔"

"افسوس کہ میری والدہ با حیات نہیں۔ عرصۂ قبل فوت ہو چکی ہیں لیکن میرے والد سے آپ ضرور مل سکتے ہیں۔ وہ اس وقت اپنے آفس میں ہیں۔ کہیے تو فون پر بات کرا دوں یا پھر آپ ان کے آفس ہی چلے جائیں۔ میں آفس کا ایڈریس دیے دیتی ہوں۔"

قبل اس کے کہ ذکی جواب میں کچھ کہتا بیٹھک کا پردہ ہٹا کر زیبا کی پڑوسن آنٹی کمرے میں داخل ہوئیں اور ذکی کو حیرانی سے دیکھتے ہوئے زیبا سے بولیں۔ "کیا ہوا بھئی۔ ارجنٹ طلبی ہوئی ہے تمھاری طرف سے۔"

"میں ہرگز ایسی گستاخی نہیں کرتی آنٹی لیکن معاملہ ہی کچھ ایسا ہے۔ میری شامت آئی تھی۔ جو زرّین کو اچھے موڈ میں دیکھ کر شاپنگ کے لیے ساتھ لیتی گئی۔ جرابیں تو میں خود لے آتی۔ لیکن جوتوں کے صحیح ناپ کے لیے اس کی موجودگی ضروری سمجھی۔ مجھ سے بس یہی حماقت ہو گئی۔ تھوڑی دیر تک تو بالکل ٹھیک رہی وہ، مگر پھر رو رو کر مجمع اکٹھا کر لیا۔ تماشہ بنا کر رکھ دیا میرا اور مجمع کی مین نے لیتی تو آپ جانتی ہی ہیں۔"

"اچھی طرح۔" پڑوسن آنٹی کرسی کے کشنوں میں دھنستے ہوئے بولیں۔ "تمھیں ایسا رسک لینا ہی نہیں چاہیے تھا۔ زرّین کے موڈ کا کبھی کوئی بھروسہ نہیں ہوتا زیبا۔ ابھی خوش، ابھی خفا۔ مجھ سے کہہ دیتیں میں جا کر لے آتی۔ اس کی ناپ کی

جرابیں اور جوتے۔ خیر تو اب پرابلم کیا ہے۔"

"اب ان صاحب کو یہ یقین دلانا ہے آنٹی، کہ زرّین میری بہن ہی ہے جب کہ وہاں موجود مجمع کا یہی خیال تھا کہ میں زرّین کا اغوا کر رہی ہوں ورنہ کسی اپنے کی موجودگی میں وہ اس طرح نہیں مچلتی۔"

"شکر کرو زیبا کہ بچ کر آ گئیں تم، تھانے چوکی کی نوبت نہیں آئی۔ تو کیا یہ صاحبزادے بھی مشکوک ہیں تمھاری طرف سے۔"

"جی آنٹی۔ اور اب یہی تصدیق کرنے یہاں آئے ہیں کہ کہیں یہ در حقیقت اغوا کا کیس تو نہیں۔"

"اچھا کیا صاحبزادے جو یہاں آ گئے تم کو ورنہ خواہ مخواہ شکوک و شبہات میں مبتلا رہتے لیکن یقین کرو کہ اغوا کا خیال سراسر لغو اور احمقانہ ہے۔ یہ دونوں سگی بہنیں ہیں۔ یہ زیبا ہے اور وہ دوسری والی زرّین ریٹارڈ لڑکی ہے۔"

انھوں نے رک کر ایک سرد سانس لی، پھر سلسلۂ کلام جوڑا۔ "مجمع کی بات چھوڑو صاحبزادے لیکن تم تو تعلیم یافتہ سمجھدار معلوم ہوتے ہو۔ پھر تم نے کیسے اس نامعقول خیال کا اعتبار کر لیا۔"

"اگر آپ کہتی ہیں تو یہ سب سچ ہی ہوگا آنٹی لیکن وہ سچویشن ہی ایسی تھی کہ میں کیا ہر کوئی سٹپٹا جاتا، کیوں کہ بچوں اور لڑکیوں کا اغوا روزمرہ کا معمول جو بن گیا ہے آج کل۔ ضمیر فروشوں کے لیے ایک منفعت بخش دھندہ، لہٰذا کسی تسلی بخش ثبوت کے نہ ہونے کی وجہ سے ایسی باتوں کا نوٹس لینا ہی پڑتا ہے۔ بائی داوے آپ کب سے محترمہ زیبا کی پڑوسن رہی ہیں۔"

"اس وقت سے صاحبزادے جب ابھی زرّین پیدا بھی نہ ہوئی تھی اور زیرک کی طرح زیبا بھی ایک ہونہار طالبہ تھی۔"

"یہ زیرک کون ہیں آنٹی؟"

"زیبا اور زرّین کے درمیان والی بہن ہے مگر برا ہوا اس حادثے کا جن میں ان بچیوں کی والدہ فوت ہو گئیں اور والدہ کے انتقال کے بعد زرّین کی دیکھ بھال کے

لیے زیبا کو اپنی تعلیم ترک کر دینا پڑی، کیوں کہ زرّین کو گھر پر تنہا نہیں چھوڑا جا سکتا اس لیے۔"

"ویری سیڈ آنٹی۔" ذکی نے متاسفانہ نظروں سے زیبا کو دیکھا جو اپنی جگہ خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔

"پھر آنٹی؟"

"پھر کیا صاحبزادے۔ تب سے زرّین کے لیے وقف ہو کر رہ گئی ہے زیبا۔ کبھی یہ بھی ایک ہنستا ہوا آباد گھرانہ تھا۔ غمِ امروز و فردا سے بے نیاز مگر اس منحوس رات جب آنے والے جاں گسل لمحات سے بے خبر وہ دونوں ایک عشائیے سے خوش خوش گھر لوٹ رہے تھے کہ ایک ٹرک ان کی کار سے آٹکرایا۔ زیبا کی والدہ تو جائے حادثہ پر ہی ختم ہو گئیں، والد البتہ بچ گئے۔ بس یہیں سے زیبا کے لیے مشکلات شروع ہو گئیں۔"

"افسوس!" ذکی نے کرسی پر اضطراب سے پہلو بدلا۔ "انکل کرتے کیا ہیں آنٹی؟"

"وہ ایک مشہور صنعت کار کے قانونی مشیر ہیں صاحبزادے! پہلے بہت زندہ دل ظریف ہوا کرتے تھے مگر اب تو صرف بچّیوں کی خاطر زندہ ہیں، کسی مشین کی طرح۔ دوست احباب، کلب تفریحات، سب سے ناطہ توڑ چکے ہیں۔ شاید ملازمت بھی ترک کر دیتے اگر گھر کے اخراجات کا معاملہ نہ ہوتا۔ لہٰذا گھر سے آفس اور آفس سے گھر اب یہی ان کی زندگی ہے۔ مجبوراً آفس جاتے اور آتے ہیں۔ زرّین کے حوالے ہو جاتے ہیں۔ ان کی موجودگی میں زیبا بے شک فری ہو جاتی ہے۔ اتنا کما لیتے ہیں کہ لڑکیوں کو کوئی مالی دشواری نہیں ہے۔ اچھا کھاتی اور اچھا پہنتی فراغت سے رہتی ہیں۔ افسوس ناک بات یہی ہے کہ زیبا کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ جیسی اوپر والے کی مرضی......

"ویسے میرے شوہر بھی محکمۂ شہری ہوابازی میں ایک معقول عہدے پر فائز ہیں۔ لہٰذا تم چاہو تو اپنی مزید تسلّی کے لیے ان سے مل کر بھی ان سب باتوں کی تصدیق کر سکتے ہو۔ گھر پر یا آفس میں۔ میں ان کا کارڈ بھی تمھیں دے دیتی ہوں۔"

''رہنے دیں آنٹی۔ آپ کا کہہ دینا ہی کافی ہے۔ آپ کے لہجے کی صداقت گواہ ہے کہ آپ جو کہہ رہی ہیں، درست کہہ رہی ہیں۔ میں اپنے شک وشبے پر شرمندہ ہوں۔ آپ لوگوں کا کافی وقت برباد کر چکا ہوں۔ لہٰذا اب مجھے اجازت دیں۔''

ذکی اٹھنے لگا تو آنٹی زیبا سے بولیں۔

''مانا کہ یہ تمھارے مطلوبہ مہمان نہیں ہیں زیبا پھر بھی گھر آئے ہوئے مہمان کی میزبانی ضروری ہے۔ انھیں چائے شربت کچھ تو پلوادو۔''

''سوری آنٹی۔ باتوں میں دھیان ہی نہیں رہا۔ میں ابھی انتظام کرتی ہوں۔''

''تکلف رہنے دیں محترمہ۔ اس وقت کچھ پینے کی خواہش نہیں ہے۔ اگر آئندہ کبھی آنا ہوا تو بے شک جو جی چاہے پلا دیجئے گا۔ فی الحال صرف اجازت۔''

وہ اٹھ کر قدرے خم ہوا۔ پھر بیرونی دروازے تک پہنچ کر پلٹتے ہوئے دریافت کیا۔

''کیا میں زرّین کی خیر و عافیت جاننے کے لیے کبھی کبھار یہاں آسکتا ہوں۔ آنٹی۔''

''ضرور صاحبزادے! جب دل چاہے چلے آنا۔ یہ بڑا اچھا خیال ہے۔ کیوں کہ میری دانست میں ان لڑکیوں کو اچھے دوستوں اور بہی خواہوں کی بے حد ضرورت ہے۔ میں تنہا، چاہ کر بھی انھیں زیادہ وقت نہیں دے سکتی۔''

''شکریہ آنٹی۔ لیکن انکل کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔''

''اگر انھیں تمھارے بے لوثی پر یقین آگیا تو یقیناً نہیں۔''

''میں اپنی بے لوثی ثابت کرنے کی پوری کوشش کروں گا آنٹی۔''

ذکی نکلا چلا گیا۔ اور جب باہر اس کی کار کے اسٹارٹ ہو کر روانہ ہو جانے کی آواز سنائی دی تب زیبا نے شکایتی انداز سے آنٹی سے کہا۔

''آپ نے ذکی صاحب کو یہاں آنے کی ناحق اجازت دے دی آنٹی۔ ہم ان کے بارے میں تو کچھ بھی نہیں جانتے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ حضرت وقت بے وقت نازل

ہو کر خواہ مخواہ مجھے بور کیا کریں۔"

"وہ ایسا غیر ذمہ دار یا دل پھینک لڑکا نہیں لگا زیبا یقیناً میں اجازت نہ دیتی۔ مجھ پر بھروسہ رکھو میں نے اپنے بال دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں اور یہ بھی ذہن نشین کر لو کہ آئندہ پھر کبھی زرّین کو بازار لے جانے کی غلطی مت کرنا ورنہ اس سے بھی زیادہ ناخوش گوار نتائج پیش آسکتے ہیں۔ اپنے پاپا کو یا مجھے اس کی ضرورتیں بتلا دیا کرنا اور بس۔"

"میں توبہ کر چکی ہوں آنٹی۔ اپنی غلطی کی سزا بھی بھگت چکی ہوں۔ آپ خاطر جمع رکھیں۔ آئندہ ایسی بھول کبھی نہ ہو گی۔"

"تو اب میں بھی چلتی ہوں زیبا۔ اپنا کام ادھورا چھوڑ کر آئی تھی۔ اس واقعے کا صرف یہی ایک پہلو عمدہ رہا کہ ایک ڈیسنٹ انسان سے ملاقات ہو گئی تمھاری۔ اگر وہ سچ مچ دوست ثابت ہوا تو تمھاری اور زرّین کی کافی بوریت رفع ہو جائے گی۔"

بیٹھک سے اٹھ کر وہ دونوں زرّین کے کمرے میں پہنچیں اور اسے وہاں آرام سے سوتا پا کر آنٹی اپنے گھر روانہ ہو گئیں اور زیبا اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ اس وقت زرّین کو دیکھ کر کوئی بھی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی ہٹیلی لڑکی ہے جس نے کچھ دیر قبل قیامت مچا رکھی تھی۔ بہر حال زرّین کا بازار جانا اور وہاں بکھر جانا گیا گزرا واقعہ ہو گیا اور گزرے ہوئے کے ساتھ ساتھ فراموش بھی ہو گیا۔ زیبا کچھ دنوں تک ذکی کے آمد کے متوقع رہی مگر جب وہ نہیں آیا تو اسے بھی بھول بھال گئی۔

پھر کئی روز بعد گھر کی کچھ ضروری خریداری کے لیے زرّین کو بوا کی تحویل میں چھوڑ کر زیبا تنہا ہی مارکیٹ روانہ ہو گئی تو دورانِ خریداری سازوں کا ایک شوروم دیکھ کر اسے خیال آیا کہ کیوں نہ کوئی ساز خرید کر اسے بجانا سیکھ لے تاکہ دماغی ٹینشن کو کچھ سکون ملے۔

اس خیال کے آتے ہی وہ اپنا خریدا ہوا سامان سمیٹ کر فوراً سازوں کے شوروم کی طرف بڑھی اور خوب سوچ بچار کر ایک وائلن خرید لیا اور گھر پہنچتے ہی سب سے پہلے زرّین کی خبر لے کر اور اسے خوش بہ خوش مطمئن پا کر اس کے لیے لائے

ہوئے فروٹس اور چاکلیٹیں بوا کو تھما کر خود آنٹی کو رِنگ کرنے لگی اور آنٹی کو بتایا کہ آج زرّین کو اچھے موڈ میں پاکر وہ کچھ ضروری سامان خریدنے بازار چلی گئی تھی جہاں مطلوبہ سامان کے ساتھ ساتھ وہ اپنے لیے ایک وائلن بھی خرید لائی ہے جسے سکھانے والے استاد کی فراہمی اب انھیں کے ذمّے ہے۔ پھر آنٹی سے اثباتی جواب سن کر اس نے پوچھا کہ ماسٹر جی کب تک آجائیں گے؟

''جلد سے جلد۔'' آنٹی نے بتایا تو وہ سراپا انتظار بن گئی۔

پھر دوسرے ہی دن اسے آنٹی کی طرف سے اطلاع ملی کہ ماسٹر جی کا بندوبست ہو گیا ہے اور وہ اگلی شام اس کے یہاں پہنچ رہے ہیں تو زیبا کی مسرت کا ٹھکانہ نہ رہا۔ جلد سے جلد سارے کام نمٹا کر وہ شام کا انتظار کرنے لگی۔ بے حد اکسائیٹڈ تھی وہ۔

مگر عجیب اتفاق کہ اس شام ماسٹر جی اور ذکی ساتھ ساتھ آگئے۔ خلافِ توقع ذکی کو دیکھ زیبا کسی قدر بوکھلائی مگر اخلاقاً استقبالی مسکراہٹ سے دونوں کا استقبال کرتے ہوئے انھیں بیٹھک میں لے گئی اور ماسٹر جی سے معذرت کرتے ہوئے ذکی سے رسمی گفتگو کرنے لگی۔ وہ چاہتی تھی ذکی جلد سے جلد لوٹ جائے مگر جانے کے بجائے جب ذکی نے زرّین کی خیرت وعافیت دریافت کی اور اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو زیبا بہ خوشی اسے زرّین کے کمرے پہنچا کر بولی۔

''آپ برا نہ مانیں تو میں ذرا ماسٹر جی سے گفتگو کر کے آؤں۔''

''آپ بھی برا نہ مانیں تو میں یہ کہنے کی جسارت کروں کہ نہایت ہونّق قسم کی چیز ہیں آپ کے ماسٹر جی۔''

''کیا آپ کسی معقول ٹیلر ماسٹر سے اپنے کپڑے نہیں سلوا سکتیں؟''

''ٹیلر ماسٹر؟'' زیبا ہنسنے لگی۔

''یہ ٹیلر ماسٹر نہیں جناب بلکہ ساز سکھانے والے ماسٹر جی ہیں سمجھ گئے آپ۔''

''اوہو ہو ہو......'' ذکی نے ایک بلند آہنگ قہقہے میں اپنی شرمندگی چھپائی۔

''تب تو بشوق جائیں آپ۔ میں تب تک زرّین سے خود ہی متعارف ہوئے

لیتا ہوں۔"

"بوا بھی تو ہیں یہاں۔وہ آپ کی مدد کریں گی۔"

یہ سن کر زرّین کے قریب بیٹھی ہوئی بوا نے اثباتی انداز میں سر ہلایا اور ذکی کو وہیں چھوڑ کر زیبا بلا تاخیر بیٹھک میں جا پہنچی۔

اس کی روانگی کے بعد ذکی نے جوتے اتارے اور جرابوں سمیت زرّین کے دوسری طرف بیٹھتا ہوا بغور اسے دیکھنے لگا۔

گول مٹول، گدگدی، گندمی رنگت اور مہتابی چہرے والی زرّین جس کے سادہ سے نقوش میں بھی ایک نظر نواز جاذبیت اور کشش تھی۔

ذکی پہلی بار زرّین کو اتنی توجہ اور باریک بینی سے دیکھ رہا تھا۔

اگرچہ زرّین کی ناک چھوٹی سی تھی، آنکھیں بھی چھوٹی چھوٹی لیکن مختصر تراشا ہوا دہانہ خاصہ مقناطیسی تھا۔ابرو خم دار۔

چہرے کا ٹوٹل امپریشن بے حد معصوم۔

پندرہ سولہ سالہ لڑکی کا چہرہ تو لگتا ہی نہیں تھا اس کا چہرہ بلکہ کسی کم عمر لڑکی کا چہرہ ہی جان پڑتا تھا۔

سی گرین کلر کے لباس میں اس کا گندمی رنگ اور نکھر آیا تھا جیسے شاداب شاخ کا کوئی تازہ پتہ ہو۔کلائیوں میں بھی میچنگ چوڑیاں کھنک رہی تھیں اور نفاست سے گندھی ہوئی اس کی دونوں چوٹیاں اس کے سر کی ہر جنبش پر ادھر ادھر ڈولنے لگتی تھیں۔غرضیکہ اس کے تمام سراپے میں مٹھاس ہی مٹھاس تھی۔

کیسٹ پلییر پر شاید اس کا پسندیدہ گیت بج رہا تھا اور اس کے ارد گرد رنگین تصاویر والے رسائل اور البم بکھرے ہوئے تھے

ذکی کو قریب پا کر زرّین نے سرسری انداز میں اسے دیکھا تھا پھر بے نیازی سے تصویریں دیکھنے میں منہمک ہو گئی تھی۔اس کا تغافل محسوس کر کے ذکی نے جھک کر اس کے ہاتھ میں تھمے ہوئے رسالے کی تصویروں پر نظر دوڑاتے ہوئے بوا سے پوچھا۔

"کیا زرّین کو صرف بچوں کی تصویریں ہی پسند ہیں بوا۔ ہنستے، مسکراتے، روتے ہوئے بچوں کی۔"

تو بوا نے رسانی سے بتلایا۔

"یہ چھوٹی بٹیا کے موڈ پر منحصر ہے بیٹے۔ جس طرح دِنوں وہ صرف ایک ہی گیت سنتی رہتی ہیں، بیزار نہیں ہوتیں اسی طرح کئی کئی دن تک صرف ایک ہی رسالہ یا البم دیکھتی رہتی ہیں، کبھی جانوروں کی تصویروں اور کبھی ہوائی جہاز۔ ریل گاڑی۔ موٹر اسکوٹر والا۔ آج کل بچوں والا رسالہ دیکھ رہی ہیں۔"

"گویا سب چیزوں کو الگ الگ پہچان لیتی ہیں۔ زرّین۔"

"ہاں اگر آپ ٹالنے کے لیے کسی چیز کا غلط سلط نام بتادیں تو اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتیں، جب تک صحیح نام نہ بتادیا جائے۔"

"یہ تو بڑی امید افزا صورتِ حال ہے بوا۔ پھر ریٹارڈڈ کس طرح ہوئیں، یہ سبھی چیزوں کی درست شناخت کر لیتی ہیں۔"

"یہ تو میں نہیں سمجھا سکوں گی بیٹے۔ بڑی بٹیا ہی سمجھا سکیں گی آپ کو۔"

تب ذکی نے زرّین کو متوجہ کر کے اپنا دایاں ہاتھ پیشانی پر رکھتے ہوئے کہا...... "آداب۔!"

تو زرّین نے بھی اپنا ایک ہاتھ پیشانی پر رکھ کر سلام کا جواب دیا۔

"یہ تو سبھی باتیں سمجھ لیتی ہیں بوا۔"

"کچھ مشکل باتیں نہیں بھی سمجھتیں بیٹے۔ لیکن روزمرہ ہونے والی زیادہ تر باتیں تو سمجھ ہی لیتی ہے۔ بولتی نہیں مگر اشاروں میں اپنا مطلب سمجھا دیتی ہیں۔"

_____ ذکی نے اظہارِ مسرت کرتے ہوئے اپنا لایا ہوا پارسل کھول کر اس میں سے ایک قیمتی خوبصورت گڑیا برآمد کی اور اس کو زرّین کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"یہ آپ کے لیے ہے۔ لیجیے۔"

زرّین نے گڑیا لینے کے بجائے سر گھما کر بوا کی طرف دیکھا تو بوا نے سر ہلا کر

کہا۔ "لے لیجیے بٹیا یہ آپ کے لیے ہے۔"

زرّین نے گڑیا لے لی، چند منٹ تک الٹ پلٹ کر اسے دیکھتی رہی پھر بے دلی سے فرش پر ڈال کر دوبارہ تصاویر دیکھنے میں منہمک ہو گئی۔

"کیا گڑیا انھیں پسند نہیں آتی بوا"۔ ذکی نے مایوسی سے پوچھا۔

"پتہ نہیں اس کا کیا سبب ہے کہ یہ کھلونوں سے کھیلتی ہی نہیں بیٹے۔ وہ دیکھیے اس طرف۔" بوا نے کمرے کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا تو ذکی نے دیکھا کہ وہاں پلاسٹک کی ایک بڑی سی باسکٹ مختلف سائز اور قسموں کے کھلونوں سے بھری رکھی ہوئی تھی۔

"یہ سارے کھلونے بٹیا وقتاً فوقتاً لاتی رہتی ہیں اس کے لیے مگر کبھی چند منٹ سے زیادہ دلچسپی نہیں لی چھوٹی بٹیا نے ان میں۔"

"اوہ! اگر پہلے سے پتہ ہوتا تو میں بھی رنگین تصاویر والے میگزین ہی لے آتا......"

"میگزینوں کی بھی کوئی کمی تھوڑی ہے بیٹے۔ وہ دیکھیے ادھر، بوا نے اس بار کمرے کے دوسرے گوشے کی طرف انگلی اٹھائی تو ذکی نے سر نہوڑا کر دیکھا کہ اس کارنر میں ایک پورا شیلف رسائل سے پُر تھا۔

"خیر خیر۔" ذکی نے پینٹ کی جیب سے ایک لفافہ نکال کر اس میں سے بہترین قسم کی ملائم ٹافیاں نکال کر ہتھیلی پر سجائیں اور بغیر کچھ کہے ہتھیلی زرّین کے آگے کر دی۔

"زرّین نے رسالے سے نگاہ ہٹا کر غور سے ذکی کی ہتھیلی پر پھیلی ہوئی ٹافیوں کو دیکھا اور پھر بوا کی جانب پلٹی تو ذکی متعجب رہ گیا۔

"کیا یہ آپ کی اجازت کے بغیر کچھ بھی قبول نہیں کرتیں بوا۔" تو بوا نے مسکراتے ہوئے فخر سے بتایا۔

"یہی بات ہے بیٹے۔ یہ کسی سے بھی بڑے سرکار، بڑی بٹیا یا مجھ سے پوچھے بغیر کچھ نہیں لیتیں۔" پھر بوا نے سر ہلا کر اجازت دی تب زرّین نے مٹھی بھر ٹافیاں

ذکی کی ہتھیلی سے اٹھالیں اور رسالہ نیچے ڈال کر ان کے ریپرز کھولنے کی کوشش کرنے لگی لیکن ریپرز کے پیچ کھول نہیں سکی۔ یہ دیکھ کر ذکی نے اس کی مدد کی اور مسرور ہوتے ہوئے بوا سے پوچھا۔

"زرّین کو اور کیا کیا پسند ہے بوا۔" تھوڑا سا ہچکچا کر بوا نے بتایا۔

"نئے نئے عمدہ ملبوسات اور زیورات بیٹے۔"

"اچھا! اور کیا ان کا پسندیدہ کیسٹ دن بھر بجتا رہتا ہے۔"

"جی ہاں۔ جب تک یہ نہیں سو جاتیں تب تک مسلسل۔ اس کے علاوہ تفریح کی بھی بڑی شوقین ہیں۔ چھٹی کے روز بڑے سرکار سہ پہر سے شام تک انھیں لے کر نکل جاتے ہیں اور خوب گھما پھرا کر لاتے ہیں۔ جب بڑے سرکار ہوتے ہیں تو انھیں کسی اور کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"اتنا چاہتی ہیں اپنے پاپا کو؟"

"بے حد۔"

"اور اگر ان کی مرضی کے بغیر کیسٹ بند کر دیا جائے بوا تب؟"

"قیامت مچا دیتی ہیں۔ اس لیے کوئی بند ہی نہیں کرتا۔"

"میں بند کر کے دیکھوں بوا۔"

"دیکھ لیجیے۔ جھنجھوڑنا شروع کر دیں گی آپ کو یا مجھے۔ دو ہی تو مشغلے ہیں ان کے۔ گیت سننا اور تصویریں دیکھنا۔ بڑی بٹیا کہتی ہیں کہ یہ اگر ایب نارمل نہ ہوتیں تو ضرور موسیقار یا فوٹو گرافر بنتیں۔

گفتگو یہیں تک پہنچی تھی کہ زیبا آ گئی اور ذکی کو بے تکلفی سے زرّین کے پاس بیٹھا دیکھ کر بطور وارننگ بولی۔ "ذرا سنبھل کے ذکی صاحب۔ زرّین کی دوستی جتنی اچھی ہوتی ہے اس کی برہمی اتنی ہی خطرناک۔ پہلا تجربہ آپ بھولے نہ ہوں گے۔"

"مجھے یاد ہے۔" ذکی مسکرایا۔ "مگر آج تو یہ نوچ کھسوٹ کے موڈ میں نہیں ہیں۔ بہت ساؤنڈ ہیں۔"

"مگر حالت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اس کا ضرور دھیان رکھیے۔" زیبا ایک

مونڈھا کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

ذکی نے لفافے میں سے چند ٹافیاں نکال کر پہلے زیبا کی طرف پھر بوا کی طرف بڑھائیں۔ زیبا نے دو تین ٹافیاں اٹھالیں مگر بوا نے معذرت کرلی۔

"میں میٹھا نہیں کھاتی بیٹے۔ لگتی ہے دانتوں میں۔" پھر انھوں نے زیبا سے پوچھا۔

"آپ دونوں کے لیے کچھ چائے شربت لاؤں۔"

"رہنے دیں بوا اس وقت نہیں۔ جب زرّین سے پکّی دوستی ہو جائے گی تب چائے شربت کیا فل کورس کھانا یہیں کھاؤں گا۔ آپ سب کے ساتھ۔"

"تب کی تب سہی۔ فی الحال تو کچھ لے لیجیے۔ کیوں نہ رات کا کھانا یہیں کھالیں ہمارے ساتھ۔ تو میں آپ کو پاپا سے بھی متعارف کروادوں گی۔ خوش ہوں گے وہ آپ سے مل کر۔"

"زہے نصیب لیکن آج کی حد تک سوری زیبا صاحبہ۔ آج شام میری ایک ضروری مصروفیت ہے ورنہ انکل سے یقیناً تعارف حاصل کرتا۔ انشاء اللہ عنقریب یہ سعادت حاصل کروں گا۔" یہ سن کر بوا کمرے سے باہر چلی گئیں اور ذکی نے کہا۔

"ویسے تو خاصا تعارف حاصل کرلیا ہے میں نے زرّین سے مگر چند باتیں اور بتادیجیے۔"

"پوچھیے۔"

"جب آپ کی والدہ حیات تھیں کیا تب بھی اتنی ہی غصیلی تھیں زرّین؟ حالتِ برہمی میں کیا انھیں بھی خاطر میں نہیں لاتی تھیں۔ یا یہ کوئی نفسیاتی گرہ ہے جو ان سے محرومی کی وجہ سے پڑگئی ہے زرّین کے احساس میں۔"

"یہ تو میں نہیں بتا سکتی لیکن پیدائش کے سال بھر تک بالکل ٹھیک رہی تھیں زرّین۔ پہلا فِٹ اسے اس وقت پڑا جب وہ سوا سال کی تھی۔ ممّی پاپا گھبرا کر اسے مختلف ڈاکٹروں کے پاس لیے پھرتے رہے۔ پھر کسی کے مشورے پر اسے ایک مشہور نفسیاتی معالج کے پاس لے گئے جنھوں نے ٹیسٹ کرکے بتایا کہ زرّین کے ذہن کا وہ حصہ

مفلوج ہے جو بول چال کے لیے مخصوص ہوتا ہے غالبًانہ بول سکنے کی گھٹن کی وجہ سے دورے پڑا کرتے ہیں اسے۔"

"پھر؟"

"پھر میجر آپریشن ہوا زرّین کے دماغ کا مگر نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا۔ ڈاکٹروں نے اسے دو سال تک انڈر آبزرویشن بھی رکھا مگر فٹس نہیں رکے نہ ہی وہ بات کر سکی۔ البتہ دواؤں کی وجہ سے فٹس کا وقفہ بڑھ گیا۔"

"تو فٹس اب بھی پڑتے ہیں اسے؟"

"ہاں کبھی جلد جلد کبھی تاخیر سے۔"

"اور دوائیں بھی جاری ہیں؟"

"ہاں خاص کر ٹرنکولائی زرس۔ صبح شام پابندی سے۔"

"تو کرتی کیا ہیں یہ فِٹس کے دوران۔ مکمل غشی یا......؟"

"یہ سمجھانا مشکل ہے۔ کبھی موقع ملے تو خود دیکھ لیجیے گا۔"

ذکی سمجھ گیا کہ زیبا قصداً زرّین کی وہ حالت بتانے سے گریز کر رہی ہے۔ لہٰذا جھک کر اس نے زرّین کی پیشانی چومی۔ اسے ٹاٹا کیا اور اٹھ کر جوتے پہنتے ہوئے زیبا سے بولا۔

"معلومات کی فراہمی کا شکریہ زیبا صاحبہ۔ اب اجازت دیجیے۔ آنٹی سے نہ ملنے کا افسوس ہے۔ کیا ان کے آنے کے اوقات مقرر ہیں یہاں۔"

"نہیں ایسا کچھ نہیں۔ جب انھیں فرصت ملتی ہے، جب ان کا جی چاہتا ہے چلی آتی ہیں۔ اب وہی تو تنہا ہمدرد ہیں ہماری۔ ممّی کی وفات کے بعد۔"

"تو میرا سلام عرض کر دیجیے آنٹی سے اور آج کی میری حاضری بھی لگوا دیجیے۔"

"ضرور ضرور۔" زیبا نے کہا اور ماں کے ذکر پر ان کی یاد آئی تو دکھ کی شدید لہر اسے خود پر قابض ہوتی محسوس ہوئی۔ زیبا کو لگا اس کا دل خالی ویران سنسان ہے۔ ماں کی محبت کے بغیر وہ ادھوری ادھوری سی ہے...... اس نے دوپٹے سے اپنی بھر آئی

آنکھیں خشک کیں اس کے سوا کر ہی کیا سکتی تھی۔ اگر چیخنے چلانے سے مرنے والے واپس آ سکتے تو یقیناً وہ دہاڑیں مارتی مگر اب تو غم کی شان یہی تھی کہ اسے ہنستے ہنستے جھیل لیا جائے۔ لہٰذا وہ بھی خاموشی سے ان کے غم کو خود میں کسی امانت کی طرح بسائے، محفوظ کیے ہوئے تھی۔"

نہ معلوم وہ کب تک گم صم رہتی کہ ذکی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ پوچھ رہا تھا۔

"ہاں خوب یاد آیا وہ آپ کے درمیان والی بہن کہاں ہیں؟"

"زیرک؟ وہ یہاں نہیں رہتی۔"

"مطلب؟"

"حصولِ تعلیم کے سلسلے میں دوتِن ہاسٹل میں مقیم ہے۔ صرف تعطیلات گزارنے گھر آتی ہے۔

"اہو! تب تو ان سے ملاقات ڈیو رہی میری۔" ذکی نے کہا اور روانہ ہو گیا۔

لوٹتے ہوئے اس نے سوچا۔ پتہ نہیں ان موصوفہ کا نام ان کی ذہانت کیوجہ سے زیرک رکھا گیا ہے یا یوں ہی۔

بہر حال اسے یقین تھا کہ وہ بھی زیبا اور زرّین کی طرح شائستہ اور شگفتہ ہو گی۔ اسے تو کبھی گمان بھی نہیں تھا کہ زیبا اور زرّین سے یوں اچانک حادثاتی ملاقات ہو جائے گی مگر ایک اچھا انسان ہونے کے ناطے اب وہ زرّین کے لیے بے حد فکر مند تھا۔

ادھر زیبا نے ماسٹر جی سے گفتگو کر کے ایک مناسب وقت اپنے لیے مقرر کر لیا تھا، اور پابندی اور انہماک سے وائیلن بجانا سیکھ رہی تھی۔

ابتدا میں مضراب پہن کر تاروں کو چھیڑنا اسے خاصہ دِقّت طلب محسوس ہوا تھا مگر رفتہ رفتہ وہ اس کی عادی ہوتی گئی۔ رات کو کھانے کے بعد زرّین کو سلا کر اپنے پاپا کے اسٹڈی میں چلے جانے کے بعد وہ بالکنی میں بچھے تخت پر بیٹھ جاتی اور بسیط آسمان کی پراسرار پنہائیوں پر نگاہ جمائے وائیلن کے تار چھیڑتی تو وائیلن کے سُر اسے کسی ہمدردو

غمگسار دوست کی طرح جتلاتے :

''اپنی طرف توجہ دو زیبا۔ تمھیں ایک رفیق کی ضرورت ہے کسی اچھے انسان کی جو تمھاری اندرونی تنہائی کا مداوا بن جائے۔'' ایسے میں زیبا کی آنکھیں بھر آتیں وہ سوچتی۔

''میں ایک ایسی کتاب ہوں جس کا زیادہ حصہ کھلا ہوا، عیاں ہے، سب پر ظاہر ہے لیکن اس کتاب کا ایک مخفی حصہ ایسا بھی ہے جو صرف اس کی ذات اس کی آگہی تک محدود و مخصوص ہے جس کی بابت دوسرا کوئی کچھ نہیں جانتا۔

''کھلے عیاں حصے میں اس کی ہنسی مسکراہٹیں اس کے ارادے اور عزائم ہیں، مگر مخفی حصے میں درد و کرب ہے، وہ آنسو پوشیدہ ہیں جن کا کوئی حصے دار نہیں ہے اور آنسو بہانا اسے پسند نہیں کہ اگر ایک بار آنسوؤں نے راستہ پالیا تو اسے رہ رہ کر تھکاتے نڈھال کرتے رہیں گے۔ انھیں باہر آنے کی عادت ہو جائے گی مگر بسورتے چہرے کتنے بُرے لگتے ہیں اس لیے وہ اپنی قوتِ ارادی سے حتی الامکان خود کو منظم و مضبوط رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ کیوں کہ اگر زرّین ایسی ہے تو اس میں اس غریب کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس کی ذمہ داری اگر خدا نے اس پر عائد کر دی ہے تو اسے اس کی آزمائش میں کامیاب و کامران ہونا ہی ہے۔

''بالکل اسی طرح جیسے تمام طالب علم سال بہ سال اپنے امتحانات میں کامیاب ہوئے بغیر اگلی کلاس نہیں چھوڑ سکتے۔ اپنی اپنی مقررہ منزلوں میں نہیں پہنچ سکتے۔ اسے بھی اس امتحان میں امتیازی نمبرات حاصل کرنے ہیں خواہ اس کے لیے کچھ بھی بھگتنا پڑے۔''

اس کے لیے یہی اطمینان کافی تھا کہ زیرک کا مستقبل تو روشن ہے اور وہ تمام حالیہ کھلنڈرے پن اور سرکشی کے باوجود زرّین سے بالکل ہی بے پرواہ اور غافل نہیں۔ جب جب ہاسٹل سے گھر آتی ہے تو کمر کس کر گھر کے کام کاج اور زرّین کی دیکھ بھال میں مصروف ہو جاتی ہے۔

زیبا کو کوئی کام کرنے نہیں دیتی۔ لٰہذا دور ہوتے ہوئے بھی زیرک وائیلن

کے میلوڈیس سُروں کی طرح زیبا کی امیدوں کے نہاں خانوں میں اپنی شہد آگیں صلاحیتوں کے ساتھ ہر ہر درد کا درماں نہیں ہوئی تھی۔ گرمیِ خون اور حرارتِ زندگانی کی طرح ہمہ وقت زیبا کو نرماتی گرماتی رہتی تھی۔ اور یہ سوچ سوچ کر زیبا کا دل فخر و انبساط سے بھر جاتا تھا کہ مستقبل بعد میں جب وہ خود بوڑھی ہو جائے گی تو زرّین کو نہ سہی زیرک کو ہی ایک بھرپور زندگی جیتا دیکھ کر کیا نہ مسرور ہو گی۔ تب تمام سفید بالوں والی نانیوں، دادیوں اور شفیق ماؤں کی طرح زیرک کو اپنی مزید بہترین دعاؤں سے نواز کر اپنی اکارت ہوئی جوانی کو یکسر بھول بھال جائے گی۔

اگرچہ کہ زرّین کا دن بھر گاؤ تکیوں سے ٹکے تصویروں کو گھورتے رہنا، خود سے اور ارد گرد سے بے بہرہ اپنے پسندیدہ گیت سن سن کر خوش ہوتے رہنا بھی ایک غمناک کیفیت تھی جس کا کوئی مداوا نہ تھا۔ ویسے زرّین سمجھتی سب کچھ تھی مگر بول نہیں سکتی تھی۔ اگر اسے قوتِ گویائی مل جاتی تو نہ جانے خود کتنے گیت گاتی۔ کیسا کیسا سب کو لبھاتی مگر افسوس کہ وہ اظہارِ ذات سے قاصر تھی۔

زیبا ہر وقت اس کے لیے دعا گو رہتی تھی۔ اس کی ذہنی صحت مندی کے لیے اتنی دعائیں مانگ چکی تھی کہ اب کوئی دعا باقی نہ بچی تھی مگر زرّین کے سلسلے میں اس کی کوئی دعا قبول نہ ہوئی تھی۔ ایسے میں جب وہ زرّین کے ہم عمر بچوں کو ہنستے بولتے چہلیں کرتے خوش باشیوں میں مصروف دیکھتی، درس گاہوں کو جاتے آتے دیکھتی تو زیبا کے سینے پر سانپ لوٹ لوٹ جاتے۔ وہ از سرِ نو دامن پسار پسار کر خدا کو پکارنے لگتی۔

آنٹی نے کئی بار اس سے کہا تھا کہ یوں خود کو مسمار کرتے رہنے کے بجائے وہ زرّین کے لیے کوئی اچھی تربیت یافتہ گورنس مقرر کر دے مگر زیبا کا دل نہیں مانتا تھا کہ اپنی سہولتوں کے لیے زرّین ایسی معصوم بے بس لڑکی کو کسی اور کے حوالے کر دے۔ ملازم ملازمائیں کتنی ہی تربیت یافتہ سہی، اس کی دانست میں اپنوں کی طرح کبھی بچوں کی دیکھ بھال نہیں کر سکتے۔ ان میں احساس فرض ہو تو ہو لیکن احساس اپنائیت نہیں ہو سکتا۔

یہی وجہ تھی کہ وہ کسی ہستی کو اپنے خانۂ دل میں کسی خوبصورت راز کی طرح

مقیم بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اسے صرف زرّین کے لیے جینا تھا۔ لہٰذا اس نے قصداً تمام دنیا سے اپنا ناطہ توڑ لیا تھا۔

ذکی اب اکثر شاموں میں زیبا کے ہاں آ جاتا تھا اور زیبا اور زرّین کے ساتھ چائے پیتا۔ کبھی زرّین کو سیر کرانے کبھی کالونی کے کامن لان میں اور کبھی کسی فرحت بخش پارک میں لے جاتا تھا۔ ایسے موقعوں پر بوا ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتی تھیں۔

زرّین کو مضبوطی سے تھام کر وہ اسے کھلے لان میں خوب خوب دوڑاتا تھا۔ خوب ورزش کراتا تھا۔ اس سے جی بھر کر کھیلتا تھا لہٰذا زرّین دن بہ دن اس سے زیادہ سے زیادہ مانوس ہوتی جا رہی تھی۔ اگر کسی دن باہر جانا نہ ہوتا تو وہ گھر ہی میں فنگر بلیئر ڈ سجا کر بیٹھ جاتا اور زرّین کے ساتھ مل کر خوب ہلڑ مچاتا۔

زرّین کے پاپا سے بھی اب اس کی اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی لہٰذا ہر تعطیل کے روز وہ بھی ضروری طور پر ذکی اور زرّین کا ساتھ دیتے تھے۔ بقیہ دنوں میں آنٹی آجاتی تھیں، کیونکہ زیبا اس وقت وائیلن سیکھنے میں مصروف ہوتی تھی۔ چنانچہ ذکی کی زرّین سے خصوصی توجہ دیکھ کر ایک روز بوا نے ڈرتے ڈرتے زیبا سے کہا۔

"کیوں نہیں تم ذکی میاں کی طرف توجہ دیتیں بڑی بٹیا! کیوں کہ چھوٹی بٹیا کو اتنا چاہنے والا کوئی اور مشکل سے ہی ملے گا۔

زیبا نے ناگواری سے بوا کو جتلایا۔

"فضول بے سروپا باتیں مت سوچا کرو بوا۔"

خود گھر بسا کر زرّین اور تنہا ابو کو اس غم میں کس کے سہارے چھوڑ دوں میں؟ نہیں بوا۔ ایسا کوئی رسک نہیں لے سکتی میں۔ مردوں کا کیا بھروسہ۔ پل میں تولہ پل میں ماشہ ہوتے ہیں وہ۔ اگر شادی کے بعد ذکی نے بھی زرّین اور پاپا کو بوجھ سمجھنا شروع کر دیا تو برداشت نہیں کر سکوں گی میں۔ اس لیے مہربانی کر کے آئندہ ایسی باتیں مت سوچیے گا۔"

اس جواب پر بے چاری بوا اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔

اگلی شام ذکی آیا تو زیبا حسبِ دستور ماسٹر جی کے ساتھ وائیلن کی مشق میں

مصروف تھی اور زیبا کے پاپا زرّین کو بمعہ بوا کے اپنے ساتھ کہیں لے گئے تھے۔ اکیلی آنٹی کسی رسالے کی ورق گردانی میں مصروف تھیں کہ ذکی کو آتا دیکھ کر خوش ہو گئیں۔ رسالہ ہاتھ سے رکھ کر بولیں۔

"آؤ! آؤ بیٹے۔ میں تو سخت بور ہو رہی تھی اکیلے بیٹھے بیٹھے۔ اس وقت گھر پر جی نہیں لگتا۔ میرے میاں آفس سے کلب جا کر رات کے نو بجے گھر لوٹتے ہیں۔ دونوں لڑکے ہاسٹل میں رہتے ہیں۔ لڑکی اپنی سہیلیوں کے پاس چلی جاتی ہے۔ اس لیے میں شامیں زیبا کے پاس ہی گزارتی ہوں۔"

"یہ تو میرے حق میں اچھا ہے آنٹی کیوں کہ اب مجھے بھی شامیں یہیں گزارنے کی عادت جو پڑ گئی ہے۔ اگر کسی شام نہیں آسکتا تب بھی میری ساری توجہ ادھر ہی زرّین کی طرف لگی رہتی ہے۔ مگر کیا بات ہے آج زرّین نظر نہیں آرہی ہے۔"

"کچھ دیر میں آجائے گی۔ اس کے پاپا اسے کہیں لے گئے ہیں۔"

تب آنٹی کے قریب بیٹھتے ہوئے ذکی نے پوچھا۔

"ایک بات بتائیے آنٹی۔ مجھے زرّین کے ساتھ اتنا گھلا ملا دیکھ کر کہیں زیبا صاحبہ برا تو نہیں مانتیں۔

"نہیں بیٹے۔" آنٹی کی آنکھیں بھر آئیں۔ بھرائی ہوئی آواز میں انھوں نے کہا۔

"وہ یقیناً خوشی اور کچھ بے فکری محسوس کرتی ہوں گی کیوں کہ اس کی بھی کوئی زندگی ہے بیٹے۔ نہ کہیں آنے کی نہ جانے کی۔ نہ کوئی دوست سہیلی۔ بیشک کھانے اوڑھنے پہننے خرچ کرنے کی کوئی کمی یا تکلیف نہیں ہے اسے۔ مگر صرف یہی تو زندگی نہیں ہے۔ خود دیکھ لو کہ اس کے اطراف کتنی رونقیں پھیلی ہوئی ہیں۔ لوگ سیر و تفریح، سنیما، تھئیٹر، دوست احباب کے ہاں جاتے آتے رہتے ہیں۔ پکنکیں مناتے ہیں لیکن زیبا ایسا کچھ نہیں کر سکتی۔ ایسی ساری مسرتیں کھرچ کر پھینک دی ہیں اس نے اپنی زندگی سے۔ مگر کیا درحقیقت اس کا دل نہ ترستا ہوگا ان کے لیے۔"

"بے شک ان کی قربانی قابلِ ستائش ہے مگر کیوں آنٹی ایسے بچے اور بھی کئی گھروں میں ہوں گے تو کیا ان سب کے متعلقین نے بھی زیبا صاحبہ جیسا ہی رویہ اختیار کر رکھا ہو گا۔ میرے خیال میں تو نہیں۔"

"دوسروں کے بارے میں تو میں کچھ کہہ نہیں سکتی بیٹے لیکن زیبا ضرورت سے زیادہ حساس ہے اور ٹریجڈی یہ ہے کہ ہماری ترقی یافتہ میڈیکل سائنس ایسے ریٹارڈڈ بچوں کی صحت مندی کے سلسلے میں ہنوز بے بس ہے۔ کوئی بھی ایسا حتمی علاج ہنوز دریافت نہیں ہو سکا ہے جو ایسے بچوں کی ذہنی تندرستی مکمل طور پر سنبھال سکے۔ اسکولوں کی حالت الگ ابتر ہے۔ جیسی دیکھ بھال اور تربیت وہاں ہونی چاہیے ہوتی نہیں۔ بس رواداری میں سب کچھ ہوتا رہتا ہے لہٰذا بچوں کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچتا اور ان کے لواحقین ہمیشہ غیر یقینی حالات کا عذاب بھگتتے رہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ دنیا ان کے صحیح درد و کرب کا، مشکلات کا اندازہ کبھی نہیں کر سکتی صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو خود ایسے بچوں کا تجربہ رکھتے ہیں۔ بقیہ صرف تماشائی ہوتے ہیں۔ کوئی دیکھ کر ہنس پڑا۔ کسی نے افسوس کر لیا۔ بات ختم۔

"زرّین قریب قریب چار پانچ سال تک اسول بھی بھجوائی گئی مگر پھر وہاں کی لاپرواہیاں اور بے توجہی دیکھ کر زیبا نے اسے اسکول سے اٹھالیا۔ اب خود ہی رات سونے سے پہلے زرّین کو چھوٹے چھوٹے لفظ بولنے کی مشق کراتی ہے جیسے اللہ۔ ابّا۔ امّا وغیرہ۔"

"تو کیا زرّین نے کچھ سیکھ لیا ہے آنٹی؟"

"بمشکل دو چار لفظ۔ بس۔"

"کیا رنگ پہچان سکتی ہے؟"

"نہیں۔ بالکل نہیں۔ مگر اپنی پسند کے رنگ ضرور اشاروں سے بتا دیتی ہے۔"

"اگر دیر تک کسی کام میں لگی رہ جاتی ہے زیبا تو کام ختم ہوتے ہی زرّین کے ساتھ خوب کھیلتی ہے۔ اسے گدگدا کر ہنساتی ہے اپنے مہربان لمس سے اسے بھرپور

شفقت کا احساس دلاتی رہتی ہے مگر اب وہ صرف یہی دعا مانگنے لگی ہے کہ اگر زرّین صحت مند نہیں ہو سکتی تو خود اس کا اور زرّین کا خاتمہ ساتھ ساتھ ہو جائے تاکہ اس کے بعد زرّین خوار ہوتی نہ رہے۔"

"حد ہے آنٹی یہ تو۔ ٹو مچ۔ ارے ان کی ایک اور بہن تو ہے نا۔"

"ہے تو بیٹے اور بہت ہو نہار لڑکی ہے مگر زیبا نہیں چاہتی کہ اس کی طرح زیرک بھی اپنے حالات کے شکنجے میں پھنس کر رہ جائے۔

"یہ کوئی چند دنوں، چند مہینوں کی تو بات نہیں ہے۔ زندگی وقف کر دینے کا معاملہ ہے بیٹے اور زرّین کے پڑھنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ خود زیبا اپنی تعلیم مکمل نہیں کر سکی لہٰذا اب وہ چاہتی ہے کہ زیرک ہی خوب پڑھے۔ قابل ترین بن جائے۔ ناقابلِ شکست ہو جائے، تاکہ کم از کم اس کا مستقبل تو محفوظ ہو ہی جائے۔"

"یہ بڑا مستحسن اور نیک خیال ہے آنٹی لیکن ایسی کیا پرابلمس ہیں زرّین کی کہ کوئی اچھی ہمدرد ملازمہ معقول مشاہرے پر اسے سنبھال نہ سکے۔"

"میں خود کئی مرتبہ یہی مشورہ دے چکی ہوں زیبا کو مگر وہ نہیں مانتی۔ خود ہی لگی رہتی ہے زرّین کے ساتھ۔ ویسے تو فزیکلی بالکل فٹ ہے زرّین۔ مگر ذہنی کمزوری کی وجہ سے اس کا نروس سسٹم گڑبڑ ہے۔ اپنے معمولی کام بھی خود نہیں کر سکتی۔ نہلانا، منہ ہاتھ دھونا۔ بال بنانا۔ ناخن تراشنا حتیٰ کہ پیشاب اور رفع حاجت کے بعد طہارت بھی زیبا ہی دلاتی ہے اسے۔ اس کے علاوہ دکھ بیماری میں تیمارداری الگ ہے۔ تنہا اسے بہت دیر چھوڑا نہیں جا سکتا۔ کیوں کہ بوا کو گھر کے سبھی کام سنبھالنے ہوتے ہیں ویسے کہنے سننے میں یہ کام بہت دشوار یا اہم نہیں لگتے لیکن وقت اور توجہ لیتے ہی ہیں نا۔ ماں کی موت کے بعد سے یہی سب کچھ کرنے میں جٹی ہوئی ہے زیبا۔ اس کے والد دفتر کے بعد جتنی توجہ دے سکتے ہیں دیتے ہیں مگر ملازمت ترک کر کے گھر تو نہیں بیٹھ سکتے اور بہت سے کام ان کے کرنے کے ہیں بھی نہیں کوئی عورت ہی کر سکتی ہے۔ البتہ زیرک جب ہاسٹل سے آتی ہے تو عارضی آرام مل جاتا ہے زیبا کو مگر یہ کوئی مستقل حل تو نہیں ہے نا بیٹے۔"

"واقعی آنٹی۔" ذکی نے تاسف سے کہا۔ "پھر آخر کیا کیا جائے۔"

"کچھ نہیں کیا جا سکتا ہے بیٹے۔ مجبوری ہے۔ ہے بڑی محبت کرنے والی لیکن۔۔ بڑا مسئلہ زرّین کی دماغی کیفیت کا بھی ہے۔ عام حالت میں تو بے شک وہ تعاون کر لیتی ہے لیکن اگر موڈ بگڑا ہوا ہو تو کسی کی نہیں مانتی۔ اور جب فٹ پڑتا ہے تب تو اللہ اللہ۔ اس کی مینٹل ویوز اتنی منتشر ہو جاتی ہیں کہ اس کیفیت میں بالکل بپھری ہوئی شیرنی بن جاتی ہے۔ تب نہ زیبا کو پہچان سکتی ہے نہ اپنے والد کو نہ بوا کو نہ ہی مجھے۔ تب اس کی وحشت سنبھالے نہیں سنبھلتی۔"

"مطلب آنٹی؟"

"مار پیٹ نوچ کھسوٹ شروع کر دیتی ہے۔ سامان کو اٹھا اٹھا کر پھینکنے لگتی ہے۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ محلے بھر میں اس کی چیخیں گونجنے لگتی ہیں۔"

"مائی گاڈ۔" ذکی نے سراسیمگی سے کہا۔ "پھر آنٹی؟"

"پھر کیا یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے گھر والوں کو۔ جب کسی طرح نہیں سنبھلتی تو جھلا کر مار بھی دیتی ہے زیبا اسے۔"

"گویا مار کے ڈر سے سنبھل جاتی ہیں؟"

"کبھی سہم کر سنبھل بھی جاتی ہیں۔ کبھی پہلے سے زیادہ غصیلی اور تشدد پسند ہو جاتی ہے۔"

"باپ رے۔ پھر مینٹل ویوز کے کام ڈاؤن ہونے تک اس کی برہمی بنی ہی رہتی ہو گی؟"

"بالکل۔ بس۔ یہی سارا احوال ہے بیٹے۔ میں تو یہ سوچ سوچ کر گھبراتی ہوں کہ اگر مستقلاً اعصابی جھٹکے برداشت کرتے کرتے خود زیبا کو یا اس کے والد کو کچھ ہو گیا تو زرّین کا کیا بنے گا بیٹے کیوں کہ قوت برداشت کی ایک حد ہوتی ہے سب کی۔"

"بالکل آنٹی۔ میں سو فیصد متفق ہوں آپ سے۔" ذکی نے فکر مندی سے کہا اور اس کا دل اداس ہو گیا۔ کافی دیر تک زرّین کی واپسی کا انتظار کر کے وہ اس روز بے نیل و مرام لوٹ گیا۔

اپنے ملنے جلنے والوں سے اس نے ایب نارمل بچوں کے بارے میں سن ضرور رکھا تھا مگر ان کی مختلف کیفیات اور ''کن ول ژنس'' بچشم خود کبھی نہیں دیکھے تھے۔

پھر اتفاق سے اگلی ہی وزٹ میں ذکی کی یہ خواہش بھی پوری ہو گئی۔

اس روز وہ زرّین کے لیے ایک بہتر ڈریس اور کچھ امی ٹیشن کی عمدہ جویلری لے کر آیا تھا اور بحیثیت فیملی فرینڈ کے اب اس کی لائی سوغاتیں بغیر اعتراض یا احتجاج کے قبول بھی کی جانے لگی تھیں۔

زرّین اس وقت گاؤ تکیے سے ٹکی بوا کی مدد سے سوپ پی رہی تھی۔ ذکی کو دیکھتے ہی سوپ کا پیالہ منہ سے ہٹا کر اس نے اپنی باہیں پھیلا دیں۔

ذکی جلدی سے اس کے قریب بیٹھ کر اسے خود سوپ پلانے اور اس کی پیشانی چومنے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ سوپ ختم ہو جائے تو زرّین کو اس کا ڈریس اور جویلری دکھائے کہ سوپ پیتے پیتے اچھل کر ذکی کے کپڑوں پر گرا تو پیالہ اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا وہ خود بھی غیر شعوری طور پر اچھل کر پیچھے ہٹا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر زرّین کو دیکھنے لگا۔ زیبا اور بوا نے آکر فوراً زرّین کو سنبھالا اور بدقت اسے اٹھا کر بٹھلایا اور ذکی یہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ زرّین کا نرم و گداز بدن اعصابی تشنج کی وجہ سے اکڑ کر لکڑی کی طرح سخت ہو گیا تھا۔ حالتِ سکون میں ستاروں کی طرح دمکنے والی اس کی روشن روشن آنکھیں حالتِ فٹ میں اوپر کی طرف چڑھ کر ساکت ہو گئی تھیں۔ لب بھنچ گئے تھے جس کی وجہ سے اس کا پُر کشش دہانہ اعصابی کھچاؤ کے باعث بالکل ٹیڑھا ہو گیا تھا اور لبوں کی شہابی رنگت بتدریج نیلاہٹ اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اس کے معصوم چہرے کی تمام ساخت یکسر بدل کر رہ گئی تھی اور وہ بے توازن ہو کر شدت سے مٹھیاں جکڑ رہی تھی اور ادھر ادھر ہاتھ پاؤں پھینک رہی تھی۔

ذکی ٹپٹا گیا۔ مگر زیبا نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا رکھا تھا اور رہ رہ کر اس کی سر اور پیشانی کو چوم رہی تھی۔ اس کی پیٹھ سہلا رہی تھی۔ بوا کبھی زرّین کے ہاتھ تھام رہی تھی تو کبھی پاؤں۔ مگر ذکی تو جی جان سے کانپ رہا تھا اور جب تک فٹ جاری رہا

کانپتا رہا۔

خدا خدا کر کے فٹ ختم ہوا تو زرّین سنبھل کر زور زور سے دیوانہ وار قہقہے لگانے لگی۔

ذکی پھر تھرا گیا۔ اس نے ان قہقہوں کو جنون کی علامت سمجھا مگر شکر یہ ہوا کہ اس روز زرّین کو غصہ نہ آیا اور وہ آہستہ آہستہ نارمل ہونے لگی اور اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے ٹکر ٹکر ذکی کی طرف دیکھنے لگی جیسا کہ وہ بات سمجھنے کی کوشش میں اکثر دیکھا کرتی تھی تب ذکی کے دم میں دم آیا اور تبھی زیبا کو زیر لب مسکراتا دیکھ کر اسے اپنی ہیئت کذائی کا خیال بھی آیا۔ جھینپ کر وہ اپنے تر بتر کپڑوں کو رومال سے خشک کرنے لگا اور کپڑوں کے ساتھ ساتھ اپنی نم آنکھیں بھی پونچھ ڈالیں۔

وہ دوڑا دوڑا آنٹی کے گھر پہنچا اور بولا۔

''آج میں نے زرّین کو فٹ پڑتے دیکھ لیا آنٹی۔ ابھی ابھی سنبھلی ہے وہ۔ خدا کی پناہ۔ اگر دورانِ فٹ کبھی کوئی اس کے قریب نہ ہوتا تو کیا ہوتا ہے آنٹی؟''

''ہوتا کیا ہے بیٹے اگر کھڑی ہوئی ہو یا چلتے چلتے فٹ پڑ جاتا ہے تو کھڑے قد سے گر جاتی ہے۔ کیا تم نے اس کی پیشانی پر چوٹوں کے نشان نہیں دیکھے؟''

''اوہ۔ تو یہ اسی لیے ہے!''

''ہاں۔ اور اگر بیٹھی ہوئی ہو تو کسی نہ کسی پہلو اوندھ جاتی ہے۔ اسی لیے تو اسے تنہا نہیں چھوڑا جاتا۔ پھر بھی کبھی نہ کبھی ایسا ہو بھی جاتا ہے۔''

''یہ تو بڑی ڈینجرس صورتِ حال ہے آنٹی۔''

''ہے تو بیٹے۔ اسی لیے حتی الامکان کوشش یہی کی جاتی ہے کہ زرّین تنہا نہ رہے پھر بھی بھول چوک کی بات الگ ہے۔ چھوٹی تھی تو آسانی سے قابو میں آ جاتی تھی مگر اب اسے سنبھالنے کے لیے کم سے کم دو افراد ضروری ہیں۔ ان سے بھی اکثر نہیں سنبھلتی۔ یہ کہہ کر آنٹی ذکی سے معذرت کرتے ہوئے زرّین کے پاس دوڑ گئیں اور دہشت زدہ ذکی لوٹتے ہوئے سوچنے لگا کہ ایسے ذہنی جھٹکے برداشت کرتے کرتے آخر زیبا اور انکل ذہنی مریض کیسے نہ بن گئے؟

انکل تو پھر بھی آفس جا کر لوگوں کے ساتھ کچھ وقت گزار دیتے ہیں مگر زیبا؟

ایک ہی چہار دیواری میں بند ایک جیسے شب و روز گزارتے ہوئے......

اف!

ذکی کا دل الٹنے لگا۔ سر گھومنے لگا۔ کاش وہ ان کی کوئی مدد کر سکتا مگر وہ بھی تو انھیں کی طرح بے بس تھا۔ اس معاملے میں اسے لگا، اس کے اندر زبردست شیلنگ ہو رہی ہے اور وہ خود کو محفوظ رکھنے سے قاصر ہے۔

صغریٰ مہدی

صغریٰ مہدی ۸ اگست ۱۹۳۸ء کو بھوپال میں پیدا ہوئیں۔ ان کی تعلیمی قابلیت ایم۔اے، بی ایڈ اور پی۔ایچ۔ڈی ہے۔

صغریٰ مہدی خواتین اردو ادب کی ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ انھوں نے ادب کی مختلف اصناف، جن میں ناول، افسانے، تنقید، تراجم اور سفر نامے شامل ہیں، کو اپنے خیالات کی ترسیل کا ذریعہ بنایا ہے۔ انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز تقریباً ۱۹۶۰ء سے کیا اور جب سے برابر لکھ رہی ہیں۔

صغریٰ مہدی کے ناول اور افسانے سماجی اور اصلاحی ہیں۔ ان کی تحریروں کے خصوصی موضوعات میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی، انسان دوستی، مذہبی رواداری اور خواتین کے مسائل شامل ہیں۔ انھیں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب پر فخر ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس تہذیب کا وارث گردانتی ہیں۔

ان کے ناول 'پابہ جولاں'، 'دھند'، 'پروائی'، 'راگ بھوپالی' اور 'جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو' خاصے مقبول ہو چکے ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں 'پتھر کا شہزادہ'، اور 'جو میرا وہ راجا کا نہیں' شامل ہیں۔ اکبر الہ آبادی کی شاعری پر ان کا تجزیہ 'اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ' اردو تنقید میں ایک اہم اضافہ ہے۔

انھوں نے سفر نامے، بچوں کے لیے خصوصی سوانحی اور معلوماتی کتابچے اور انگریزی زبان میں لکھی گئی کتابوں کے اردو تراجم بھی شایع کیے ہیں۔

صغریٰ مہدی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو سے بہ حیثیت پروفیسر ریٹائر ہو کر ہمہ وقت تخلیقی اور تحقیقی کاموں میں مصروف ہیں۔ وہ دلّی میں مقیم ہیں۔

صغریٰ مہدی

سمجھوتہ

جہاز اڑا چلا جارہا تھا۔ کھڑکیوں پر پردے ڈال دیے گئے تھے۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ خطرات کی صورت میں کیا تدابیر کرنی چاہئیں اس کا ڈیمانسٹریشن بھی ہو چکا تھا، جوس سرد ہو چکا تھا، دوسری طرف انگریزی کی کوئی فلم چل رہی تھی مگر ان کے دماغ کے پردے پر گزرے دنوں کی فلم الگ چل رہی تھی۔ یہ سب کیا ہوا؟ کیا غلطی ان کی تھی۔ وہ تو یہی سمجھتے ہیں۔

یاد ہے میں نے کیا کہا تھا؟

ہاں مگر مجھے کیا معلوم تھا۔

تو معلوم ہونا چاہیے، انھوں نے غصے میں کہا تھا، یہ یاد کر کے ان کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔ انھوں نے اب تک جو کیا تھا اس کا کوئی حساب نہیں۔ یہ سب کرنے کے باوجود سب کا خیال ہے کہ انھوں نے سمجھوتہ نہیں کیا بدلتے حالات سے، نئی نسل سے۔ انھیں گزرے دنوں کی ایک ایک بات یاد آ رہی تھی جب خالد کو باہر جانے کا وظیفہ ملا تو وہ پھولی نہ سمائیں کہ ان کا قابل اور ذہین بیٹا باہر جائے گا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرے گا۔ واپس آ کر اسے اعلیٰ سے اعلیٰ نوکری ملے گی۔ پیسہ، عزت، شہرت اور پھر چاند سی بہو لائیں گی، خالد کے جانے کے بعد ثمرین بھی چلی گئی، اس کو بھی وظیفہ

ملا تھا۔ انھوں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر سمجھالیا کہ اب لڑکے اور لڑکی میں کیا فرق ہے۔ ہاں انھوں نے یہ خواہش ضرور ظاہر کی تھی کم از کم اس کی منگنی کر دیں مگر وہ نہ مانی تو وہ چپ ہو گئیں۔ اب وہ دونوں اکیلے رہ گئے۔ اس امید پر دن کاٹنے لگے کہ ان کے بچے جلدی پردیس سے واپس آئیں گے۔ وہ چپکے چپکے لڑکی کا جہیز اور لڑکے کی بَری خریدتی رہیں۔ تھوڑے بہت پیسے لگا کر گھر کو ٹھیک کراتی رہیں کہ بچے آخر اس میں آرام سے رہیں گے۔ ان کی تعلیم ختم ہو گئی، تو لڑکے نے اطلاع دی کہ وہ آئے گا ضرور مگر اسے یہاں بہت اچھی نوکری مل گئی ہے۔ اس لیے ماں باپ سے مل کر واپس چلا جائے گا۔ یہ سن کر ان کو بہت صدمہ ہوا، روئیں، پیٹیں، مگر پھر یہی کہہ کر دل کو سمجھایا کہ جہاں رہیں خوش رہیں اور جب بیٹا آیا تو اس سے انھوں نے شکایت بھی نہیں کی۔ نہ اس پر یہ ظاہر ہونے دیا کہ انھیں اس کے فیصلے نے اتنا ناامید اور مایوس کیا ہے اور دو سال بعد یہی اطلاع بیٹی نے بھی دے دی۔ وہ اس پر بھی راضی بہ رضا ہو گئیں۔ اب وہ سال کے سال آتے تو ان کے ویران گھر میں بہار آجاتی، جب وہ شادی کی بات کرتیں تو دونوں ٹال جاتے۔ اور پھر باری باری دونوں نے اپنی شادی کی اطلاع دے دی۔ بیٹے نے تو خیر اپنے ہی وطن کی لڑکی سے شادی کی تھی مگر بیٹی نے اپنے لیے غیر ملکی شوہر پسند کیا تھا۔ انھوں نے اس پر نہ صرف صبر کیا اسے قبول کیا بلکہ معترضین کو ان کی طرف سے جواب بھی دیے۔

کیا ہوا ارے اس نے تو اپنا مذہب بدل لیا ہے۔
اور نو مسلموں سے شادی کرنا تو ثواب ہے۔
انھوں نے اس کا نام سب کو عبداللہ بتایا تھا۔

اور جب وہ اپنے غیر ملکی غیر مذہب داماد سے ملیں تو انھوں نے اس کی بلائیں بھی لیں اور سلامی بھی دی۔ ”آداب عرض ہے۔ جناب مزاج کیسا ہے آپ کا۔“ اس کے منہ سے یہ سن کر باغ باغ بھی ہوئیں۔ داماد کو بھی مما بہت پسند آئیں انھوں نے یہ سب نہ صرف برداشت کیا بلکہ خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ انھوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ کیا ہوا جو انھوں نے دوسرے ملک کو بسالیا ہے وہ ہمارا خیال کتنا رکھتے ہیں۔ دونوں

نے پیسے کی بھرمار کرر کھی ہے، ان کا غریبا مؤ گھر ایک شاندار کوٹھی میں تبدیل ہو گیا، جب آتے ہیں کبھی موٹر خرید کر دے جاتے ہیں، کبھی رنگین T.V۔ کبھی کپڑے دھونے کی مشین تو کبھی V.C.R اور تو اور جنریٹر خرید کر دے گئے کہ بار بار بجلی جانے سے آپ لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ اب وہ ہاتھ کھول کر خرچ کرتیں، فلاحی اداروں کو بڑی بڑی رقمیں چندے کی دیتیں، آخر یہ سب کس کی بدولت؟ اور پھر وہ باہر رہ کر ملک کا نام بھی تو روشن کرر ہے ہیں۔ ایک ہفتے ایک کا فون آتا ہے دوسرے ہفتے دوسرے کا۔ گھنٹوں باتیں کرتے ہیں اور یہ یقین دلاتے ہیں کہ آپ جب کہیں گی ہم آپ کے پاس ضرور پہنچیں گے اور جلدی پہنچیں گے۔ انھوں نے اس صورتِ حال کا نہ صرف خود کو عادی بنالیا بلکہ ہمیشہ اس کا روشن ترین پہلو سامنے رکھا اور دوسروں کے سامنے اس کو بہترین بنا کر پیش کیا۔

پھر وہ دونوں سال دو سال میں خود بھی بیٹے بیٹی کے پاس جانے لگے۔ انھوں نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی بھی سیکھ لی تھی۔ مغربی تہذیب کی خوبیاں بھی وہ جان گئی تھیں۔ وہ جب مہینے دو مہینے پرائے ملک رہ کر آتیں تو سب کو وہاں کے جادوئی قصے سناتیں لوگوں کو بتاتیں کہ کس طرح ان کے بچوں نے غیر ملک میں اپنے مذہب اپنی تہذیب کو فراموش نہیں کیا ہے۔ بھئی کیا ملک ہے کیا آسانیاں ہیں کیا لوگ ہیں۔

حالانکہ وہ جانتی تھیں کہ ان کو اپنی پوتی کو کلمہ سکھانے میں کیا مشکل پیش آئی تھی۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ ان کے بیٹے اور بیٹی کے گھر میں روز رات کے کھانے سے پہلے جو عرق پیا جاتا ہے وہ عرق نہیں ہے۔ ان کو اس کا علم بھی تھا کہ وہ چیزیں جن کو انھوں نے زندگی بھر حرام سمجھا تھا وہ ان کے بیٹے اور بیٹی کے گھر میں نہ صرف آتی ہیں بلکہ ان سے ان کا فرج بھرا رہتا ہے۔ مگر ان باتوں کو وہ اپنے آپ سے چھپا لیتی تھیں۔

اسی طرح وقت گزرتا گیا۔ دونوں کمزور اور بوڑھے ہو گئے اور ہر سال کا جانا تو اب ان کے لیے آسان نہیں تھا مگر پچھلے مہینے جب خالد کا فون آیا کہ ان کی بیٹی کلثوم کی شادی طے ہو گئی ہے۔ لڑکا ہم مذہب ہے مگر غیر ملکی ہے اور اس میں آپ دونوں کی

شرکت ضروری ہے تو انھوں نے میاں کے منع کرنے کے باوجود جانے کا فیصلہ کر لیا اور کپڑے، زیور، مٹھائیوں، میووں سے لدی پھندی وہ بیٹے کے پاس سات سمندر پار پہنچ گئیں، ان لوگوں نے بہت منع کیا تھا کہ یہاں سب چیزیں مل جاتی ہیں مگر وہ اپنے ساتھ مہندی، کلاوہ، ابٹن سبھی کچھ لے آئی تھیں۔ ان کو بہو بیٹے نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں تھی کہ باقاعدہ باورچی مقرر کیا گیا تھا جو طرح طرح کے ہندوستانی کھانے پکا رہا تھا۔ گھر میں شادی کے گانے ہوئے تھے اور لڑکی کو مانجھے بھی بٹھایا گیا تھا، یہ اور بات ہے کہ مانجھے بیٹھنے کے بعد بھی وہ دن بھر ہونے والے دولہا کے ساتھ گھومتی تھی۔ روز جب شادی کے گانے ہوتے تو ان کا غیر ملکی داماد بھی بیٹھ کر سنتا اور جب اس کا مطلب دولہا کو اور اس کو انگریزی میں سمجھایا جاتا تو اس کی سمجھ میں یہ بات کسی صورت نہ آتی تھی کہ بیچارے دولہا کے فیملی کے لوگوں کو برا بھلا کیوں کہا جا رہا ہے۔ ساس کے بھاگنے کا کیا مطلب ہے اور بول کیسے ہارے جاتے ہیں۔ پھولوں کی سیج کا کیا مطلب ہے اور چندن ہار کس کو کہتے ہیں۔ وہ ان سب باتوں سے محظوظ ہوتی رہیں اور پھر شادی کا دن آ گیا۔ شادی ایک بہت بڑے ہوٹل میں تھی۔ یہاں داخل ہونے سے پہلے مہمانوں کو کارڈز لینے ہوتے جن پر ان کے نام لکھے تھے۔ اسٹیج پر دولہا دولہن اور ان کے ماں باپ کے ساتھ دادا دادی کو بھی بٹھایا گیا تھا۔ مائک پر مولوی صاحب نے نکاح پڑھایا۔ شادی کا کیک دولہا دولہن نے کاٹا پھر آرسی مصحف ہوا۔ اور پھر سب نے نئے شادی شدہ جوڑے کے ساتھ ان کو بھی مبارکباد دی۔ پھر کھانا شروع ہوا پہلے دولہا دولہن پھر دادا دادی، ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں نے کھانا کھایا اور پھر مہمانوں کی باری آئی۔ انھیں یہ برا لگ رہا تھا کہ مہمان بیٹھے ہوں اور گھر والے کھانا کھالیں مگر وہ یہ سوچ کر چپ رہیں کہ جیسا دیس ویسا بھیس، یہاں کی یہی ریت ہے۔ وہ بہت خوش تھیں کہ شادی کی تقریب بخیر و خوبی انجام پائی اور انھوں نے اپنا کردار بخوبی نبھایا۔ بچے بھی خوش تھے۔ نئی نویلی دلہن بھی بار بار آ کر دادی اماں کو پیار کر رہی تھی۔ وہ بہت تھک گئی تھیں۔ دل چاہ رہا تھا کسی طرح گھر پہنچیں۔ مگر وہ چونک پڑی یہ دیکھ کر ہال سے میزیں ہٹادی گئی تھیں۔ انگریزی دھنیں بجنے لگی تھیں، ڈانس فلور پر دولہا اور

دلہن ڈانس کے لیے بلائے جارہے تھے۔ ان کا دل ایک دم گھبرانے لگا۔ وہ جلدی سے اپنے شوہر کے پاس آئیں، چلیے یہاں سے جلدی چلیے۔ ان کو اختلاج ہو رہا تھا۔

وہ کچھ جواب بھی نہیں دے پائے کہ ایک غیر ملکی ان کی طرف بڑھا اور ان کا ہاتھ پکڑ لیا، وہ پورے جسم سے لرز گئیں۔ انھوں نے جھٹکے سے اس سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور پھر انھوں نے کیا کہا انھیں کچھ یاد نہیں، وہ کتنا چیخیں انھیں اس کا احساس نہیں تھا۔ بس جب وہ اپنے حواسوں میں آئیں تو ان کے میاں سامان سمیٹ رہے تھے۔ لڑکی اور لڑکا جھینپے جھینپے کھڑے تھے کھسیائے سے۔ انھوں نے جلدی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں، ان سے آنکھیں ملانے کی ان میں سکت نہیں تھی۔ یہ کیا ہوا، کیسے ہوا۔ نہ جانے وہ اس وقت یہ کیسے بھول گئیں کہ وہ خالد کی ماں اور کلثوم کی گرینی ہیں اور انھیں یہ کیوں یاد آگیا کہ وہ میر دلدار حسین کی بیٹی سید شمشاد حسین کی بہو ہیں۔ وہ خود حیران تھیں کہ انھیں اس غیر ملک کے ہوٹل میں یہ کیوں یاد رہا کہ بارہ بنکی ان کا وطن ہے۔ اور ان کے گھرانوں کی عورتیں پینسوں اور پالکیوں میں نکلتی تھیں اور ان کا پلو بھی کسی مرد نے نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو یہ سب یاد آنے کی جگہ نہیں تھی! وہ خود حیران تھیں اور بار بار خود سے یہ سوال کر رہی تھیں ایسا کیوں ہوا؟

واجدہ تبسم

واجدہ تبسم امراوتی (برار) میں پیدا ہوئیں۔ ان کی تعلیمی قابلیت ایم۔ اے ہے۔ انھوں نے ۱۹۶۰ء کے آس پاس اپنا تخلیقی سفر شروع کیا۔ ان کی پہلی تخلیق ''شیر اور شیرنی کی کہانی'' صبا میں شایع ہوئی۔

واجدہ تبسم نے مسلم سماج کے ایک مخصوص طبقے، یعنی نوابوں کے استحصالی نظام کو بے نقاب کر کے خاصی شہرت حاصل کی۔ اس لحاظ سے ان کا افسانہ، 'اترن' اعلیٰ ادبی اہمیت کا حامل ہے۔ واجدہ تبسم نے استحصالی طبقے کے وضع کردہ اصولوں اور روایتوں کو، جن کا براہِ راست تعلق اور اثر خواتین پر ہے، اپنے تیروں کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کے ناول اور افسانے گو ایک مخصوص تہذیبی اور معاشرتی پس منظر میں لکھے گئے ہیں، تاہم یہ تحریریں موضوعات اور زبان و بیان کے اعتبار سے خواتین اردو ادب میں ایک منفرد اور بے باک رجحان کا اعلان کرتی ہیں۔

واجدہ تبسم کے افسانوں کے مجموعے 'شہر ممنوعہ'، 'آیا بسنت سکھی'، 'نتھ اترائی'، 'اترن'، 'نتھ کا بوجھ' اور ناول 'نتھ کا غرور' خاصے مقبول ہو چکے ہیں۔

واجدہ تبسم ممبئی میں مقیم ہیں۔

واجدہ تبسم

اُترن

"نکو اللہ، میرے کو بہوت شرم لگتی۔"
"آئیو اس میں شرم کی کیا بات ہے؟ میں نئیں اتاری کیا اپنے کپڑے؟"
"اوں......" چمکی شرمائی۔
"اب اتارتی کی بولوں لنابی کو؟" شہزادی پاشا جن کی رگ رگ میں حکم چلانے کی عادت رچی ہوئی تھی، چلا کر بولیں۔
چمکی نے کچھ ڈرتے ڈرتے، کچھ شرماتے شرماتے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے پہلے تو اپنا کرتہ اتارا پھر پاجامہ، شہزادی پاشا کے حکم پر جھاگوں بھرے ٹب میں ان کے ساتھ کود پڑیں۔
دونوں نہا چکیں تو شہزادی پاشا ایسی محبت سے جس میں غرور اور مالکن پن کی گہری چھاپ تھی، مسکرا کر بولیں۔
"ہور یہ تو بتا کی اب تو کپڑے کون سے پین رئی؟"
"کپڑے ـــــ؟"
چمکی بے حد متانت سے بولی۔
"یہی اچ میرا نیلا کرتا پاجامہ ـــــ"

"یہی اِچ؟" شہزادی پاشا حیرت سے چلا کر ناک سکوڑتے ہوئے بولیں۔
"اتّے گندے۔ بدبو والے کپڑے؟ پھر پانی نہانے کا فائدہ؟"
چمکی نے جواب دینے کے بجائے الٹا ایک سوال جڑ دیا۔ "ہور آپ کیا پہن رئے پاشا؟"
"میں؟" شہزادی پاشا بڑے اطمینان اور فخر سے بولیں۔
"وہ میری بسم اللہ کے دخت چمک چمک کا جوڑا دادی ماں نے بنائے تھے، وئی اِچ ___ مگر تو نے کائے کو پوچھی ___؟"
چمکی ایک لمحے کو تو سوچ میں پڑ گئی، پھر ہنس کر بولی۔
"میں سوچ رئی تھی......" وہ کہتے کہتے رک گئی۔
"کیا سوچ رئی تھی؟" شہزادی پاشا نے بے حد تجسس سے پوچھا۔
ایک دم ادھر سے لالی کی تیز چنگھاڑ سنائی دی۔
"ہو، پاشا، یہ میرے کو حمام میں سے بھگا لے کو تم اجاڑ مار چوٹی کے ساتھ کیا مٹا خے مار لیتے بیٹھیں؟ جلدی نکلو، نئیں تو بی پاشا کو جا کو بولتیوں۔"
اپنی سوچی ہوئی بات چمکی نے جلدی سی کہہ سنائی۔ "پاشا میں سوچ رہی تھی کہ کبھی آپ ہور میں اوڑھنی بدل، بہنا بن گئے تو آپ کے کپڑے میں بھی پہن لے سکتی نا؟"
"میرے کپڑے؟ تیرا مطلب ہے کہ وہ سارے کپڑے جو میرے صندوخاں میں بھر بھر کر رکھے پڑے ہیں؟"
جواب میں چمکی نے ذرا اڈر کر سر ہلایا۔
شہزادی پاشا ہنستے ہنستے دہری ہو گئی ___ ایو کتی بے خوف چھوکری ہے! آگے تو تو نوکرانی ہے۔ تو تو میری اترن پہنتی ہے، ہور عمر بھر اترن ہی پہنیں گی۔" پھر شہزادی پاشا نے بے حد محبت سے جس میں غرور اور فخر زیادہ اور خلوص کم تھا، اپنا ابھی ابھی کا، نہانے کے لیے اتارا جوڑا چمکی کی طرف اچھال دیا۔
"یہ لے اترن پہن لے۔ میرے پاس تو بہت کپڑے ہیں۔"

چمکی کو غصہ آگیا۔ میں کائے کو پہنوں، آپ پہنونا میرا یہ جوڑا۔ "اس نے اپنے میلے جوڑے کی طرف اشارہ کیا۔

شہزادی پاشا غصّے سے ہنکاری، "اناّبی! اناّبی...... "

اناّبی نے زور سے دروازہ کو بھڑ بھڑایا اور دروازہ جو صرف ہلکا سا بھڑا ہوا تھا، پاٹوں پاٹ کھل گیا۔

"اچھا تو آپ صاحبان ابھی تک ننگے اچ کھڑے وے ہیں!" اناّبی ناک پر انگلی رکھ کر بناوٹی غصّے سے بولیں۔

شہزادی پاشا نے جھٹ اسٹینڈ پر ٹنگا ہوا نرم نرم گلابی تولیہ اٹھا کر اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیا ـــــ چمکی یوں ہی کھڑی رہی۔

اناّبی نے اپنی بیٹی کی طرف ذرا غور سے دیکھا۔ "ہور تو پاشالوں گا کے حمام میں کائے کو پانی نہانے کو آن مری۔ "

"یہ انوں شہزادی پاشا نے بولے کی تو بھی میرے ساتھ پانی نہا۔ "

اناّبی نے ڈرتے ڈرتے ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی دیکھ نہ رہا ہو۔ پھر جلدی سے اسے حمام سے باہر کھینچ کر بولیں۔ چل، جلدی سے جا کو نوکر خانے میں ـــــ نیں تو سردی وردی لگ گئی تو مرے گی۔ "

"اب یہ چلکٹ گوند کپڑے نکو پین' وہ لال پیٹی میں شہزادی پاشا پرسوں اپنا کرتا، پاجامہ دیے تھے، وہ جا کو پین لے۔ "

وہیں ننگی کھڑی وہ سات برس کی ننھی سی جان، بڑی گہری سوچ کے ساتھ رک رک کر بولی۔

"امنی جب میں ہور شہزادی پاشا ایک برابر کے ہیں تو انوں میری اترن کیوں نئیں پہنتے۔؟ "

"ٹھہر ذرا، میں مماّ کو جا کے بولتیوں کی چمکی میرے کو ایسا بولی...... "

لیکن اناّبی نے ڈر کر اسے گود میں اٹھالیا۔ "اگے پاشا اِنے تو چھنال پاگل ہو گئی ہے۔ ایسے دیوانی کے باتاں کائے کو اپنے مماّ سے بولتے آپ؟ اس کے سنگات کھیلنا، نہ

بات کرتا، چپ اس کے نام پر جوتی مار دیو آپ" شہزادی پاشا کو کپڑے پہنا کر، کنگھی چوٹی کر کے کھانا وانا کھلا کر جب سارے کاموں سے نچنت ہو کر انابی اپنے کمرے میں پہنچیں تو دیکھا کہ چمکی ابھی تک ننگا جھاڑ بنی کھڑی ہے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، آتے ہی انھوں نے اپنی بیٹی کو دُھنکنا شروع کر دیا۔

"جس کا کھاتی اسی سے لڑائیاں مول لیتی ـــــ چھنال، گھوڑی! ابھی کبھی بڑے سرکار نکال باہر کر دیے تو کدھر جائیں گے اِتّے نخرے؟"

انابی کے حسابوں تو یہ بڑی خوش نصیبی تھی کہ وہ شہزادی پاشا کو دودھ پلانے کے واسطے رکھی گئی تھیں۔ ان کے کھانے پینے کا معیار تو لازماً وہی تھا جو بیگمات کا تھا کہ بھئی آخر وہ نواب صاحب کی اکلوتی بچی کو اپنا دودھ پلاتی تھیں۔ کپڑا لتّا بھی بے حساب تھا کہ دودھ پلانے والی کے لیے صاف ستھرا رہنا لازمی تھا اور سب سے زیادہ مزے تو یہ تھے کہ ان کی اپنی بچّی کو شہزادی پاشا کی بے حساب اترن ملتی تھی۔ کپڑے لتّے ملنا تو ایک طے شدہ بات تھی، حد یہ کہ اکثر چاندی کے زیور اور کھلونے تک بھی اترن میں دے دیے تھے۔ ادھر وہ حرافہ تھی کہ جب سے ذرا ہوش سنبھال رہی تھی یہی ضد کیے جاتی تھی کہ میں بی پاشا کی اترن کیوں پہنوں؟ کبھی کبھار تو آئینہ دیکھ کر بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ کہتی "امّی میں تو بی پاشا سے بھی زیادہ خوب صورت ہوں نا؟ پھر تو اُنوں میری اُترن پہنتانا؟"

انابی ہر گھڑی ہولتی تھیں۔ بڑے لوگ تو بڑے لوگ ہی ٹھہرے۔ اگر کسی نے سن گن پائی کہ موئی انانا اصل کی بیٹی ایسے ایسے بول بولتی ہے تو ناک چوٹی کاٹ کر نکال باہر نہ کریں گے؟ ویسے بھی دودھ پلانے کا زمانہ تو مدت ہوئی بیت گیا تھا۔ وہ دیوڑھی کی روایت کہیے کہ انالوگوں کی مرے بعد ہی چھٹی کی جاتی تھی۔ لیکن قصور بھی معاف کیے جانے کے قابل ہو، تو ہی معافی ملتی ہے۔ ایسا بھی کیا؟ انابی نے چمکی کے کان مروڑ کر اسے سمجھایا۔

"آگے سے کچھ بولی تو یاد رکھ کہ ـــــ تیرے کو عمر بھر بی پاشا کی اُترن پہننا ہے۔ سمجھی کہ نئیں، گدھے کی اولیاد۔"

گدھے کی اولیاد، نے اس وقت زبان سی لی لیکن ذہن میں لاوا پکتا ہی رہا۔

تیرہ برس کی ہوئیں تو شہزادی پاشا کی پہلی بار نماز قضا ہوئی۔ آٹھویں دن گل پوشی ہوئی تو ایسا زرتار، جھم جھما جوڑا امّا نے سلوایا کہ آنکھ ٹھہرتی نہ تھی۔ جگہ جگہ سونے کے گھنگھروؤں کی جوڑیاں ٹنکوائیں کہ جب بی پاشا چلتیں تو چھن چھن پازیبیں سی بجتیں۔ ڈیوڑھی کے دستور کے مطابق وہ حد سے سوا قیمتی جوڑا بھی اترن میں صدقہ دے دیا گیا۔ انابی خوشی خوشی وہ سوغات لے کر پہنچیں تو چمکی جو اپنی عمر سے کہیں زیادہ سمجھدار اور حساس ہو چکی تھی، دکھ سے بولی "امّی مجبوری ناطے لینا ہور بات ہے مگر آپ ایسے چیزاں کو لے کر خوش مت ہوا کرو۔"

"اگے بٹیا ـــــ" وہ رازداری سے بولیں۔ "یہ جوڑا اگر بکانے کو بھی بیٹھے تو دو سو کلدار روپے تو کہیں نئیں گئے۔ اپن لوگاں نصیبے والے ہیں کہ ایسی ڈیوڑھی میں پڑے۔"

"امّی" چمکی نے بڑی حسرت سے کہا "میرا کیا جی بولتا کی میں بھی کبھی بی پاشا کو اپنی اترن دیوں؟"

انابی نے سر پیٹ لیا ـــــ اگے تو بھی اب جوان ہو گئی گے ذرا عقل پکڑ، ایسی ویسی باتاں کوئی سن لیا تو میں کیا کروں گی ماں۔ ذرا میرے بڑھے چونڈے پو رحم کر ـــــ"

چمکی ماں کو روتا دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

مولوی صاحب نے دونوں کو ساتھ ہی ساتھ قرآن شریف اور اردو قاعدہ شروع کرایا تھا۔ بی پاشا نے کم اور چمکی نے زیادہ تیزی دکھائی۔ دونوں نے جب پہلی بار قرآن شریف کا دور ختم کیا تو بڑی پاشا نے ازراہِ عنایت چمکی کو بھی ایک ہلکے کپڑے کا نیا جوڑا سلوا دیا تھا۔ ہر چند کہ بعد میں اسے بی پاشا کا بھاری جوڑا بھی اترن میں مل گیا تھا لیکن اسے اپنا وہ جوڑا جان سے زیادہ عزیز تھا۔ اس جوڑے سے اسے کسی قسم کی ذلّت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ہلکے زعفرانی رنگ کا سوتی جوڑا جو کتنے ہی سارے جگمگاتے، لس لس کرتے جوڑوں سے سوا تھا۔

اب جب کہ خیر سے شہزادی پاشا ضرورت بھر پڑھ لکھ بھی چکی تھیں، جوان بھی ہو چکی تھیں، ان کا گھر بسانے کی فکریں کی جا رہی تھیں۔ ڈیوڑھی سناروں، درزیوں، بیوپاریوں کا مسکن بن چکی تھی۔ چمکی یہی سوچے جاتی تھی کہ وہ شادی کے اتنے بڑے ہنگامے کے دوران بھی اپنا وہی جوڑا پہنے گی جو کسی کی اُترن نہیں تھا۔

بڑی پاشا، جو واقعی بڑی مہربان خاتون تھیں، ہمیشہ اپنے نوکروں کا اپنی اولاد ہی کی طرح خیال رکھتی تھیں۔ اس لیے شہزادی پاشا کے ساتھ وہ چمکی کی شادی کے لیے بھی اتنی ہی فکر مند تھیں۔ آخر نواب صاحب سے کہہ سن کر انھوں نے ایک مناسب لڑکا چمکی کے لیے تلاش کر ہی لیا۔ سوچا کہ شہزادی پاشا کی شادی کے بعد اسی جھوڑ جھمکے میں چمکی کا بھی عقد پڑھادیا جائے۔

اس دن جب شہزادی پاشا کے عقد کو صرف ایک دن رہ گیا تھا اور ڈیوڑھی مہمانوں سے ٹھسا ٹھس بھری پڑی تھی اور لڑکیوں کا ٹِڈی دل ڈیوڑھی کو سر پر اٹھائے ہوئے تھا، اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ہوئی شہزادی پاشا پیروں میں مہندی لگواتے ہوئے چمکی سے کہنے لگی۔ "تو سسرال جائے گی تو تیرے پیروں کو میں مہندی لگاؤں گی۔"

"ایو خدا نہ کرے!" انابی نے پیار سے کہا "اس کے پاؤاں آپ کے دشمناں چھوئیں۔ آپ ایسا بولے سو بس ہے۔ بس اتّی دعا کرنا پاشا کہ آپ کے دولھے میاں ویسا شریف دولہا اس کا نکل آجائے۔"

مگر اس کی شادی کب ہورئی جی؟" کوئی چلبلی لڑکی پوچھ بیٹھی۔

شہزادی پاشا وہی بچپن والی غرور بھری ہنسی ہنس کر بولیں۔ "میری اتّی ساری اُترن نکلے گی تو اس کا جہیز تیار سمجھو۔"

اُترن —— اُترن —— اُترن —— کئی ہزار سوئیوں کی باریک باریک نوکیں جیسے اس کے دل کو چھید گئیں۔ وہ آنسو پیتے ہوئے اپنے کمرے میں آکر چپ چاپ پڑ گئی۔

سر شام ہی لڑکیوں نے پھر ڈھولک سنبھال لی۔ ایک واہیات گانا گایا جا رہا تھا

پچھلی رات رَت جگا ہوا تھا۔ آج پھر ہونے والا تھا۔ پرلی طرف صحن میں ڈھیروں چولہے جلائے، باورچی لوگ انواع و اقسام کے کھانے تیار کرنے میں مشغول تھے۔ ڈیوڑھی پر رات ہی سے دن کا گمان ہو رہا تھا۔

چمکی کا روتا ہوا حسن نارنجی جوڑے میں اور کھل اٹھا تھا۔ یہ جوڑا وہ جوڑا تھا جو اسے احساسِ کمتری کے پاتال سے اٹھا کر عرش کی بلندیوں پر بٹھا دیتا تھا۔ یہ جوڑا کسی کی اترن نہیں تھا۔ نئے کپڑوں سے سلا ہوا جوڑا، جو اسے زندگی بھر میں ایک ہی بار نصیب ہوا تھا، ورنہ ساری عمر تو شہزادی پاشا کی اترن پہنتے ہی گزری تھی اور اب چونکہ جہیز بھی تمام تر ان کی اُترن ہی پر مشتمل تھا، اس لیے باقی کی ساری عمر بھی اسے اترن ہی استعمال کرنی ہو گی۔

"لیکن بی پاشا ـــــ ایک سیّد زادی کہاں تک پہنچ سکتی ہے۔ یہ تم بھی دیکھ لینا۔ تمے ایک سے ایک پرانی چیز مجھے استعمال کرنے کو دیئے نا؟ اب تم دیکھنا......"

ملیدے کا تھال اٹھائے وہ دولہا والوں کی کوٹھی میں داخل ہوئی ـــــ ہر طرف چراغاں ہو رہا تھا۔ یہاں بھی وہی چہل پہل تھی جو دولہا والوں کے محل میں تھی۔ صبح ہی عقد خوانی جو تھی۔

اتنے بڑے ہنگامے اور اتنی بڑی کوٹھی میں کسی نے اس کا نوٹس بھی نہ لیا۔ پوچھتی پاچھتی وہ سیدھے دولہا میاں کے کمرے میں جا پہنچی۔ ہلدی مہندی کی رتیوں رسموں سے تھکے تھکائے دولہاں میاں اپنی مسہری پر دراز تھے۔ پردہ ہلا تو وہ مڑے اور دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

گھٹنوں تک لمبا زعفرانی کرتا۔ کسی کسی پنڈلیوں پر منڈھا ہوا تنگ پاجامہ ـــــ ہلکی ہلکی کامدانی کا کڑھا ہوا زعفرانی دوپٹہ ـــــ روئی روئی، بھیگی بھیگی گلابی آنکھیں۔ چھوٹی چھوٹی آستینوں والے کرتے میں سے جھانکتی گداز بانہیں۔ بالوں میں موتیا کے گجرے ـــــ ہونٹوں پر ایک قاتل سی مسکراہٹ ـــــ یہ سب نیا نہیں تھا۔ لیکن ایک مرد جس کی پچھلی کئی راتیں کسی عورت کے تصور میں بیتی ہوں ـــــ شادی

سے ایک رات پہلے بہت خطرناک ہو جاتا ہے ـــــ چاہے وہ کیسا ہی شریف ہو۔

رات جو دعوتِ گناہ ہوتی ہے۔

تنہائی جو گناہوں کی ہمّت بڑھاتی ہے۔

چمکی نے انھیں یوں دیکھا کہ وہ جگہ جگہ سے ٹوٹ گئے۔ چمکی جان بوجھ کو منہ موڑ کر کھڑی ہو گئی ـــــ وہ تلملائے سے اپنی جگہ سے اٹھے، اور ٹھیک اس کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ آنکھوں کے گوشے سے چمکی نے انھیں یوں دیکھا کہ وہ ڈھیر ہو گئے۔

"تمھارا نام؟" انھوں نے تھوک نگل کر کہا۔

"چمکی!" اور ایک چمکیلی ہنسی نے اس کے پیارے پیارے چہرے کو چاند کر دیا۔

"واقعی تم میں جو چمک ہے اس کا تقاضا یہی تھا کہ تمارا نام چمکی ہوتا......"

انھوں نے ڈرتے ڈرتے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا ـــــ خالص مردوں والے لہجے میں، جو کسی لڑکی کو پٹانے سے پہلے خواہ مخواہ کی ادھر ادھر کی ہانکتے ہیں۔ لرزتے ہوئے اپنا ہاتھ شانے سے ہٹا کر اس کے ہاتھ کو پکڑتے ہوئے بولے۔

"یہ تھال میں کیا ہے ـــــ؟"

چمکی نے قصداً ان کی ہمّت بڑھائی ـــــ "آپ کے واسطے ملیدہ لائی ہوں۔ رت جگا تھا نہ رات کو!" اور اس نے تلوار کے بغیر انھیں گھائل کر دیا۔

"مونہہ میٹھا کرنے کو ـــــ" وہ مسکرائی۔

"ہم ملیدے ولیدے سے مونہہ میٹھا کرنے کے قائل نہیں ہیں ـــــ ہم تو......ہاں......" اور انھوں نے ہونٹوں کے شہد سے اپنا منہ میٹھا کرنے کو اپنے ہونٹ بڑھا دیے اور چمکی ان کی بانہوں میں ڈھیر ہو گئی ـــــ ان کی پاکیزگی لوٹنے ـــــ خود لٹنے ـــــ اور انھیں لوٹنے کے لیے۔

دواع کے دوسرے دن ڈیوڑھی کے دستور کے مطابق جب شہزادی پاشا اپنی اُترن، اپنا سہاگ کا جوڑا، اپنی انّا، اپنی کھلائی کی بٹیا کو دینے گئیں تو چمکی نے مسکرا کر کہا:

"پاشا...... میں...... میں
"میں زندگی بھرآپ کی اُترن استعمال کرتی آئی ـــــ مگراب آپ بھی......"
اور وہ دیوانوں کی طرح ہنسنے لگی۔ "میری استعمال کری ہوئی چیز اب زندگی بھرآپ بھی......" اس کی ہنسی تھمتی ہی نہ تھی۔
سب لوگ یہی سمجھے کہ بچپن سے ساتھ کھیلی سہیلی کی جدائی کے غم نے عارضی طور سے چمکی کو پاگل کر دیا ہے۔

ذکیہ مشہدی

ذکیہ مشہدی (پورا نام ذکیہ سلطانہ مشہدی) لکھنؤ میں ۱۹۴۵ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کی تعلیمی قابلیت ایم۔اے (نفسیات) ہے۔ انھوں نے کئی سال نفسیات کی لکچرر کی حیثیت سے کام کیا۔

ذکیہ مشہدی پچھلی تین دہائیوں سے افسانے لکھ رہی ہیں۔ ان کے دو افسانوی مجموعے 'پرائے چہرے' اور 'تاریک راہوں کے مسافر' شایع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے رام لعل کے افسانوں کا ہندی ترجمہ اور ایک ہندی ناول 'نیلا چاند' کا اردو ترجمہ ساہتیہ اکادمی، دلّی کے لیے کیا ہے۔

ذکیہ مشہدی کے موضوعات عام طور پر نفسیاتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ سماجی قدروں اور ثقافتی معیاروں پر ان کی گہری نظر ہے۔ ان کی تحریروں کے سلسلے میں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ وہ پدر سری سماج کے وضع کردہ اصولوں، ترجیحات اور موضوعات کو للکارتی ہیں۔ وہ ان سماجی قدروں (social values) کو جن کا شکار خواتین ہیں، خاص طور سے اپنا نشانہ بناتی ہیں۔ ان کے حال ہی میں شایع شدہ افسانے ان کے متحرک شعور کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ افسانے اردو ادیباؤں کے تئیں آج کل کے سیاسی حالات اور سماج پر ان کے اثرات کے ادراک کا پتہ دیتے ہیں،

جوار دو ادب کے لیے ایک نیک فال ہے۔

ذکیہ مشہدی آج کل پٹنہ میں مقیم ہیں۔ وہ تعلیم بالغاں(adult education) کے پروگراموں میں فعال ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ تخلیق کے کاموں میں برابر مصروف ہیں۔ ان کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ عنقریب شایع ہونے والا ہے۔

ذکیہ مشہدی

چرایا ہوا سکھ

ہمیشہ کی طرح آج بھی اجیت نے سونے سے پہلے کافی کا پیالہ ختم کیا۔ پھر دو تین سگریٹ پھونکے۔ لیکن ہمیشہ کی طرح اس نے اپنیتا کے گرد بازوؤں کا حلقہ نہیں بنایا۔ بہت دیر تک وہ چھت کی طرف یونہی بے مقصد دیکھتا رہا۔ انتظار کرتے کرتے اپنیتا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو وہ خود ہی قریب آ گئی اور اجیت کی چوڑی چھاتی پر بالوں کا آبشار بکھر گیا۔ اجیت کو نتھنوں میں چبھن کا احساس ہوا۔ خوں خوں کرتے ہوئے اس نے بال پیچھے ہٹائے مگر اپنیتا کسی ضدی بچے کی طرح اس سے چمٹی رہی۔

"اجیت ڈارلنگ، جب تک میں تمھارے بہت قریب نہ آجاؤں مجھے نیند نہیں آتی۔"

"یہ بال تو پیچھے کرو۔ ناک میں گھسے آتے ہیں۔" اجیت کچھ جھلا کر بولا۔
"آخر تم بال باندھ کر کیوں نہیں سوتی ہو؟"

اسے مسز کھنہ کے بغیر مانگ کے اونچے بنے ہوئے بالوں کی کس کر گوندھی ہوئی چوٹی یاد آ گئی۔ ایک دن جب وہ گئی رات ان کے ہاں ٹیسٹ میچ کا اسکور پوچھنے گیا تو مسز کھنہ سونے کی تیار کر رہی تھیں۔ اونچے بالوں اور سخت گوندھی ہوئی چوٹی میں ان کا بیضوی چہرہ اور تیکھے نقوش زیادہ واضح ہو اٹھے۔ بڑی چور سی مسکراہٹ اجیت کے

ہونٹوں پر پھیل گئی۔

اپنا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ آج یہ نئی بات کیا۔ اجیت ہی تو کہتا تھا کہ اسے اپنا کے گھنے بال کھلے ہوئے ہی اچھے لگتے ہیں۔ پھر دن میں ان سے کھیلنے کا موقع ملتا بھی کہاں تھا۔ وہ رات کو اپنا سر اس کی چوڑی چکلی چھاتی پر ٹکاتی تو اجیت کی آنکھیں دیر تک اس کے بالوں میں الجھی رہتیں۔

''تمھیں نے تو کہا تھا۔'' وہ دھیرے سے بولی ''کہ رات کو بال کھلے رکھا کرو۔''

''میں نے؟ میں نے کب کہا تھا؟'' اجیت صاف مکر گیا۔

''تمھاری طبیعت کچھ خراب ہے کیا؟ متفکر ہو؟'' اپنا نے ہولے سے سر اس کے سینے سے ہٹالیا۔ بالوں کو سمیٹتے ہوئے اس نے پہلے اجیت کے ماتھے پر ہاتھ رکھا پھر نرم نرم ہونٹ ٹکادیے۔ اجیت کی جھنجھلاہٹ غصے میں تبدیل ہونے لگی مگر وہ خاموش رہا۔ یہ عورت کی ذات اگر شک میں مبتلا ہوجائے تو اس کی سانسوں تک میں زہر گھل جائے گا۔ کالے ناگ کی طرح خوں خوں کرتی، زہر اگلتی ناچتی پھرے گی۔ کب کس کو ڈس لے۔

اپنا کی انگلیاں اس کے بالوں میں گھوم رہی تھیں۔ لانبی لانبی نرم انگلیاں اسے میٹھی سی خنکی کا احساس ہوا۔ نیند دھیرے دھیرے اس پر غلبہ پارہی تھی۔ کبھی آنکھیں کھلتیں، کبھی بند ہوتیں، نیند کی آتی جاتی ترنگوں پر مسز کھنہ کا چہرہ کبھی اوپر آتا کبھی نیچے جاتا۔ اپنا کیسی اچھی ہے، موڈ پہچانتی ہے۔ اجیت کو متفکر دیکھا تو خاموشی سے ہٹ گئی۔ ہوگا کوئی آفس کا مسئلہ۔ زیادہ سے زیادہ اس نے یہی سوچا ہوگا۔ اجیت کے دل میں سویا ہوا پیار پل کے پل جاگا۔ جب سے اس کے مکان کے اوپر والے حصے میں مسز کھنہ آن کر رہی تھیں، یہی ہورہا تھا۔ اپنا کے لیے کبھی اس کا دل جھنجھلاہٹ سے بھر اٹھتا، کبھی غصے سے اور کبھی پیار سے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنے ان احساسات کو کس خانے میں رکھے۔

بڑی مشکل سے وہ اپنے خوب صورت دو منزلہ مکان کی اوپری منزل سے اُس موٹے ان کلچرڈ کرایہ دار کو ہٹاپایا تھا۔ سارے ڈرائنگ روم میں کیلیں ٹھونک

ٹھونک کر لال پیلے کلنڈر لٹکا رکھے تھے۔ اوپر سے کبھی کدو کے چھلکوں کی بارش ہوتی کبھی شریفے کے بیجوں کی، کبھی "صرف" راکھ کی۔ بد تمیز بچّے لان پر کھلے ہوئے گلاب توڑ لے جاتے۔ نوکر سلیقے سے تراشی ہوئی گھاس پر ان کے دو مہینے کے ننھے سے بچّے کے پوتڑے پھیلا جاتا۔ "ادھر دھوپ نہیں آتی جی۔" وہ دانت نکوس کر کہتا۔ سیٹھ کی بیوی اینتا کے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیز نہیں کھاتی تھی۔ "تم مانس مچھلی کھاتی ہو، ہم ٹھہرے ساتوِک بھوجن والے۔" وہ ناک چڑھا کر کہتی اور اجیت غصے سے لال پیلا ہو جاتا۔ بڑی مشکل سے جان چھوٹی۔ سَرن کے توسط سے نئے کرایہ دار آئے تو اجیت کو لگا کرایہ دار نہیں آئے، ڈرائنگ روم کے لیے ڈیکوریشن پیس خریدا گیا۔ کھنہ صاحب تو اسمارٹ تھے ہی، ان کی بیوی کا بھی جواب نہ تھا۔ واہ، واہ! گوری بھی بہت عورتیں ہوتی ہیں، تیکھی سی، چھوٹی سی ناک بھی بہت سی عورتوں کی ہوتی ہے مگر ان تمام چیزوں کا صحیح مقدار میں امتزاج اور اس امتزاج کا صحیح استعمال شاید سب میں نہیں ہوتا جیسے قورے کی بنیادی ترکیب تو ایک ہی ہوتی ہے، کچھ مرچیں، کچھ گرم مسالہ، کچھ دہی، کچھ پیاز، نرم ملائم گوشت لیکن ان کا صحیح امتزاج کچھ ہی لوگوں کو آتا ہے، ورنہ ہر باورچی کے پکائے ہوئے سالن کے ذائقے میں فرق کیوں پایا جاتا۔ اجیت کا جی چاہتا ذرا اس ہانڈی کو بھی سونگھ کر دیکھے۔

بلائے جان ہے غالب اس کی ہر بات

بس آج کل اجیت کے ذہن میں یہ مصرعہ یوں ہی گونجتا رہتا تھا جیسے کسی پرانے ریکارڈ پر سوئی آکر ٹک جائے۔ بلائے جان ہے غالب، بلائے جان ہے غالب۔ نیند سے بوجھل آواز میں وہ غیر شعوری طور پر یہی گنگنانے لگا۔ دھت تیری کی۔ اینتا سوچے گی کہ ابھی تو جھنجھلا رہے تھے اب غالب کا شعر پڑھنے لگے۔ پھر کان کھانا شروع کردے گی۔ ہے بھگوان تو نے عورت کیوں بنائی۔ اس نے آنکھوں کے کونوں سے چور انداز میں جھانک کر دیکھا۔ اینتا تقریباً سو چکی تھی۔ اس نے شکر ادا کیا۔ اچھا ہے سو گئی۔ اب کم از کم جاگتی آنکھوں کے خوابوں پر پردہ تو نہیں بٹھائے گی۔

مسز کھنہ کی ناک میں پڑی ہوئی ہیرے کی جگر جگر کرتی لونگ پھر اندھیرے

میں کوندنے لگی۔ اجیت آج کل کچھ زیادہ ہی کنفیوزڈ ہو رہا تھا۔ کل کی بات ـــــ امیتا نے کہا تھا۔

"اجیت ڈارلنگ! ذرا مسز کھنہ سے ان کا کافی پرکولیٹر تو مانگ لاؤ، میں نہانے جا رہی ہوں۔" اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھوٹی سی پلاسٹک کی ٹرے پر نہ جانے کیا کیا ڈھیر تھا، کریم کی شیشیاں، شیمپو، نیل فائل، کلینزنگ مِلک، ابلتے ہوئے پانی کا جگ......

تو امیتا تفصیل سے نہانے جا رہی ہے ایک گھنٹے کی چھٹی ـــــ مارے خوشی کے اجیت نے اس کے گال پر چٹکی بھری اور ایک ایک قدم میں دو دو سیڑھیاں پھلانگتا اوپر پہنچا۔ دیوان پر دراز مسز کھنہ فلم فیئر کی ورق گردانی کر رہی تھیں اور اپنے سجے سجائے ڈرائنگ روم کا ایک حصہ ہی معلوم ہو رہی تھیں۔

"ہائی ـــــ" انھوں نے اپنے موتی جیسے دانت چمکا کر کہا۔

"مسز کھنہ وہ بات یہ ہے کہ امیتا کو......"

انھوں نے بات کاٹ دی۔ "دیکھیے ہم لوگوں کو ایک دوسرے کو جانتے ہوئے چھ مہینے سے زیادہ ہو گئے ہیں اور آپ ابھی تک اس قدر تکلّف برتتے ہیں۔ میرا نام شیلا ہے۔"

"بات یہ ہے......" اجیت ان کا نام لیتے ہوئے ہکلا گیا۔

"بات وات کچھ نہیں شیلا کہیے تب ہی سنوں گی۔"

"اچھا تو شیلا جی۔" اجیت کی سمجھ میں نہ آیا کہ ابلتے ہوئے احساس کو کیا نام دے۔ خون کنپٹیوں پر ٹھوکریں مار رہا تھا ـــــ شیلا جی میں اس لیے آیا تھا کہ امیتا کو آپ کا کافی پرکولیٹر چاہیے۔"

"ضرور ـــــ وہ تو میں دے ہی دوں گی مگر آپ پہلے یہاں ہی کافی پی لیں ـــــ؟" اور انھوں نے نوکر کو آواز دی۔

اجیت سنبھل کر بیٹھ گیا۔ پھر گئیں چلیں تو چلیں۔ ساتھ بیٹھنے کے مواقع بہت کم آتے تھے مگر ایک طرف کھنہ جی ہوتے تھے دوسری طرف امیتا۔ یہ موقع اپنی

نوعیت کا دوسرا ہی تھا۔ تنہائی کا دوسرا موقع آیا تھا تو تکلف کی دیوار خاصی موٹی تھی۔ اس مرتبہ اس میں رخنے پڑتے دیکھائی دے رہے تھے۔ شاید اگلی بار ایسا موقع آئے تو کچھ اور رخنے پڑیں، اور پھر شاید بیٹھ ہی جائے۔ ہوں ـــــ بلی کے خواب میں چھیچھڑے ـــــ چھی چھی ـــــ میں یہ کیا سوچ رہا ہوں۔ ایتا جیسی بیوی کے ہوتے ہوئے ـــــ اجیت نے اپنے اوپر لعنت بھیجنی چاہی تھی کہ ان کا نوکر کافی لے کر آگیا۔ بھلا مسز کھنہ کو خود اٹھ کر پیالہ بڑھانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ قریب آکر جھکیں تو ان کے گہرے کٹے ہوئے بلاؤز کا گریبان کچھ اور نیچا ہو گیا اور بڑی مدھم بڑی پیاری سی خوشبو اجیت کی ناک سے ٹکرا کر اس کے حواسوں پر سوار ہو گئی اور اس وقت تک سوار رہی جب تک ایتا نے نیچے سے ہانک نہیں لگائی۔

"میں نے کہا میں نے تو صرف پر کولیٹر منگایا تھا، تم خود کافی بنانے بیٹھ گئے کیا؟"

ایتا کے لہجے میں فطری خوش مزاجی سے پیدا ہونے والی شوخی تھی مگر اجیت کے دل میں چھپے چور نے اسے گھور کر دیکھا۔ یہ خوش مزاجی سچی ہے یا جھوٹی، جملہ کھرا ہے یا طنز میں ڈوبا ہوا۔ اس کا ذہن ترازو لے کر ایتا کو تولنے لگا۔ وہ پر کولیٹر لے کر کچن میں گھس گئی۔

"سنو میتو! مسز کھنہ پوچھ رہی تھیں کہ آپ کی مسز نے انٹیریر ڈیکوریشن میں کوئی ڈپلوما لیا ہے کیا۔ آپ کا گھر بے حد سلیقے سے سجایا ہوا ہوتا ہے؟"

ایتا کا مسرور چہرہ کچن سے جھانکا۔ اجیت نے اطمینان کا سانس لیا۔ 'بھگوان تیرا شکر ہے۔ عورت بنائی تھی سو بنائی تھی اگر اسے عقل بھی دے دی ہوتی تو مجھ جیسے مردوں کو تو مر جانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہتا۔' اطمینان کا سانس لیتا ہوا وہ تولیہ اٹھا کر غسل خانے میں گھس گیا۔ جسم پر صابن رگڑتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ مسز کھنہ کی بے تکلفی کو کس خانے میں فٹ کرے۔ محض خوش مزاجی، صاف دلی یا کہیں ـــــ کہیں ان کے دل میں بھی نرم گوشے جاگ رہے ہیں۔ اجیت کے دل میں انار چھوٹنے لگے۔ صابن رگڑ رگڑ کر اس نے آدھا کر دیا۔ وہ تو شاید پورا ہی گھس دیتا اگر ایتا کافی تیار

ہو جانے کی اطلاع نہ دیتی۔

قسمت آزمانے میں کیا حرج ہے۔ اجیت نے نرمی سے سوئی ہوئی امیتا کے بازو گلے سے ہٹاتے ہوئے سوچا۔ دیکھیں گے اس ہانڈی کا قورمہ کیسا ہے۔ وہ اپنی باریک تراشی ہوئی مونچھوں میں مسکرایا۔

صبح اجیت کی آنکھ کھلی تو امیتا چائے کی ٹرے لیے دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ بستر کے پاس تپائی رکھ کر اس نے چائے رکھی اور نازک سنہری پیالیوں میں چائے ڈالنے لگی۔ اجیت کا ڈریسنگ گاؤن اس کے سرہانے ٹنگا ہوا تھا۔ سلیپر مسہری کے نیچے موجود تھے۔ امیتا کے چہرے پر بڑی میٹھی سی مسکراہٹ تھی۔ رات کی تلخ گفتگو وہ یکسر بھول چکی تھی۔ اس کے تازے شیمپو کیے ہوئے بالوں سے ہلکی ہلکی خوشبو آرہی تھی۔ اجیت نے پھر اپنے اوپر لعنت بھیجی۔ کیسی اچھی بیوی ہے۔ بھلا میں کہاں پرائی عورت کے چکر میں پڑ رہا ہوں۔ لیکن چائے پی کر نیند کا خمار اترا تو حواسوں پر وہی آٹھ انچ گہرے بلاؤز کا گلا ناچ گیا۔ مسز کھنہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ لان پر کھڑی تھیں۔

"میں نے کہا اجیت جی! شام کو فرصت ہو تو چائے اوپر ہی پی لیجیے گا۔ کھنہ صاحب ٹور پر جارہے ہیں۔ مجھے تنہا چائے پینا بالکل اچھا نہیں لگتا۔"

اجیت کو لگا کہ اس کے سر پر ایسا بم پھٹا جس میں رنگ برنگے تارے بھرے ہوئے تھے۔ وہ سارے تارے اب اس کی آنکھوں کے سامنے تھرک رہے تھے۔

"آپ آرہے ہیں نا؟" مسز کھنہ نے سوال دہرایا۔

"شام کو امیتا کی سہیلی کی شادی کی سالگرہ ہے، ہم دونوں وہاں مدعو ہیں۔" اجیت بڑی مری ہوئی آواز میں بولا۔

وہ اپنی نقرئی ہنسی ہنس کر بولیں :

"تو یہ تقریب تو امیتا جی کی سہیلی کی ہوئی۔ آپ کی سہیلی کی تو نہیں ـــــ آپ انھیں جانے دیجیے۔ ہم لوگ چائے پئیں گے۔"

اجیت بالکل ہی حواس باختہ ہو گیا۔ یہ سوا نیزے پر آیا ہوا آفتاب اس کے سر

پر گر رہا ہے کیا۔ شام کو اجیت نے سر درد کا بہانہ کر لیا اور ثبوت کے طور پر وہ امیتا کو دکھا کر اے۔پی۔سی کی دو ٹکیاں اکٹھی کھا گیا۔

"متھو ڈارلنگ! تم چلی جاؤ۔ ان کی شادی کی پہلی سالگرہ ہے۔ تمھارا جانا بھی ضروری ہے۔ میں ذرا آرام چاہتا ہوں۔ کچھ Nausea بھی معلوم ہو رہا ہے ____"

امیتا کا چہرہ فکر سے بھر اٹھا۔ دوپہر میں کیا کھایا تھا؟ آفس کینٹین سے کچھ الٹا سیدھا لے لیا ہوگا۔ میں نے چکن سینڈوِچ دیے تھے وہ بدمعاش انور کھا گیا ہوگا۔ تم فوراً ڈاکٹر سکینہ کو فون کر لو۔ تم بھلا کیا کرو گے، میں ہی کیے دیتی ہوں۔ زیادہ تکلیف ہو تو میں بھی نہیں جاؤں گی۔" وہ حسبِ عادت ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئی۔

مارے غصّے کے اجیت کی مونچھیں پھڑپھڑانے لگیں۔ اس کا بس چلتا تو امیتا کی ایک ایک بوٹی علیٰحدہ کر دیتا۔ ناک الگ، آنکھیں الگ، بازو الگ اور سب کو بالکل علیٰحدہ علیٰحدہ دفن کرتا تاکہ وہ کبھی ایک جگہ جمع ہو کر پھر امیتا کی شکل اختیار نہ کر سکیں۔

غصہ دبا کر جلد سے بولا۔

"نہ نہ۔ تم ضرور جاؤ ڈارلنگ۔ میں صرف ہنگامے سے بچنا چاہتا ہوں۔ سر میں درد کوئی ایسی بڑی بات تو نہیں۔" پھر بائیں آنکھ دبا کر بولا۔

"ویسے رکنا چاہو تو رک بھی سکتی ہو۔ ہم بھی آج اپنی شادی کی سالگرہ منالیں۔ بالکل دلہن نظر آ رہی ہو۔"

امیتا فکر بھول کر ہنسنے لگی :

"بدمعاش! اچھا آرام کرو۔" اور ایک ہوائی بوسہ پھینکتی ہوئی باہر نکل گئی۔

اس کے جاتے ہی اجیت نے کمبل پھینکا۔ آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور حسبِ معمول ایک قدم میں دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر چڑھ گیا۔

ڈرائنگ روم میں سناٹا تھا۔ ڈرائنگ روم سے متصل بیڈروم سے مسز کھنہ کے گنگنانے کی آواز آ رہی تھی۔

"بالم آئے بسو میرے من میں۔"

اس نے پکارا "شیلا جی!"

"یس۔ کم اِن۔" کھنکتی ہوئی آواز میں جواب ملا۔
وہ جھجکا۔ ان کے بیڈ روم میں کبھی داخل نہیں ہوا تھا۔

"آیئے بھئی کیا سوچ رہے ہیں؟" کھڑکی کا پردہ اٹھا۔ مسز کھنہ کی ناک کی لونگ جگمگائی۔

اجیت اندر داخل ہوا۔ کمرے کی ہر چیز میاں بیوی کے نفیس ذوق اور آرام طلب مزاج کی غماز تھی۔ اس نے ایک نظر مسز کھنہ پر ڈالی۔ وہ بے نیازی سے بالوں میں برش پھرا رہی تھیں۔ تقریباً بیک لیس چولی سے اس کی سنہری کمر جھانک رہی تھی۔ اجیت پر پھر وہی دورہ پڑا۔ جی چاہا انھیں چھو کر دیکھے۔ کچھ لوگ اصلی نہیں معلوم ہوتے۔ تخیل کا واہمہ محسوس ہوتے ہیں۔

"آپ کی خاطر میں نے امیتا کو تنہا ہی بھیج دیا۔" اجیت "آپ کی خاطر" پر زور دیتا ہوا بولا۔

"تھینک یو، اجیت جی! آپ بے حد اچھے انسان ہیں۔ بے حد اچھے یقیناً آپ کی بیوی خوش قسمت ہے جو اسے آپ جیسا شوہر ملا۔ ایک کھنہ جی ہیں، روز ٹور، روز ٹور۔ پتہ نہیں یہ سارے ٹور آفیشیل ہوتے بھی ہیں یا پردۂ زنگاری میں کسی معشوق کو چھپا رکھا ہے۔ اجیت کی تعریف کرتے ہوئے مسز کھنہ کی آواز میں طنز کا شائبہ بھی نہ تھا۔ بے حد اپنائیت تھی اور بے حد قریب آکر سیدھے سیدھے ان کی آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔ اس کو اپنے چہرے پر ان کی سانسوں کے لمس کا احساس ہوا اور اس کے اندر خون شراب بن کر جھاگ دینے لگا۔

عورت اور مرد کے اس ازلی رشتے کا یہ کمزور لمحہ کب اور کیسے ان کے درمیان سرک گیا، اجیت کچھ سمجھ ہی نہیں سکا۔ جب مسز کھنہ کے بازو اس کے گلے سے علیحدہ ہوئے تو اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ ایک ہارا ہوا جواری ہے۔ مسز کھنہ کا کاجل پھیل گیا تھا۔ اڑے ہوئے پاؤڈر کے دھبے برص کے داغ لگ رہے تھے۔ لپ اسٹک ہونٹوں کے درمیانی حصے سے غائب ہو کر باچھوں میں بھر گئی تھی۔ ان کے چہرے پہ وہی طمانیت تھی جو موٹا سا چوہا پایا جانے والی بلّی کے چہرے پر ہوتی ہے۔

بڑی حیرت سے آنکھیں پٹپٹا کر اجیت نے سوچا کہ یہ عورت اسے اس قدر انوکھی، اچھوتی، آسمان سے اتری ہوئی مخلوق کیوں معلوم ہو رہی تھی۔ یہ عورت جو کسی بھی عام عورت سے الگ نہیں ہے ـــــ کیا یہ چرایا ہوا سکھ امیتا سے ملنے والے سکھ سے کچھ الگ تھا؟ حساب لگایا تو سارے جمع، ضرب، تقسیم کا جواب ایک ہی آیا۔ پھر بھلا چھ مہینوں سے اس نے اپنی نیندیں کیوں حرام کر رکھی تھیں؟ محض بند لفافے کو کھولنے کے لیے؟ ایک بیمار سے تجسّس کی تسکین کے لیے؟ یا اس لیے کہ وہ ایک ناقابلِ حصول شے معلوم ہوتی تھی اور اجیت کے لیے ایک چیلنج۔ اسے امیتا یاد آئی جو اَب آتی ہی ہو گی۔ ایک سیدھی سادی معصوم سی گھریلو بیوی جسے وہ پچھلے چھ مہینوں سے ٹھگتا آ رہا تھا۔ وہ آہستہ سے اٹھا اور ان کا ڈریسنگ گاؤن ان پر ڈالتا ہوا نظریں چار کیے بغیر کمرے سے نکل گیا۔

پارٹی سے لوٹ کر رات کو جب امیتا میک اپ اتارنے کے بعد اپنے بالوں کو کس کر چوٹی میں گوندھ رہی تھی تو اجیت نے اپنا چہرہ اس کے شانوں میں ڈبوتے ہوئے کہا:

"امیتا ان بالوں کو کھلا ہی رہنے دو۔ یہ ایسے ہی اچھے لگتے ہیں۔ پھر دن میں ان سے کھیلنے کا موقع ملتا بھی کہاں ہے؟"

آشا پربھات

آشا پربھات ۲۱ جولائی ۱۹۵۸ء کو رکسول، مشرقی چمپارن (بہار) میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے بی۔اے تک تعلیم حاصل کی ہے۔

آشا پربھات نثر اور نظم دونوں اصناف میں طبع آزمائی کرتی ہیں۔ وہ ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھ رہی ہیں۔ انھوں نے افسانے اور انشائیے لکھے ہیں۔ ان کا ایک ناول 'دھند میں اگا پیڑ' شائع ہو چکا ہے۔

آشا پربھات کے افسانے سماجی نوعیت کے ہیں۔ خواتین کا استحصال ان کا خصوصی موضوع ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں ان تمام عناصر کو بے نقاب کرتی ہیں جو عورت کے استحصال کے ذمہ دار ہیں۔ آشا پربھات برابر لکھ رہی ہیں۔

وہ آج کل سیتامڑھی، بہار میں مقیم ہیں۔

آشا پربھات

ایکوریم

ائیر بیگ کندھے پر لٹکائے جب میں کمرہ میں داخل ہوئی تو وہ صوفے پر بیٹھے کسی کتاب کے مطالعے میں مشغول تھے۔ گوری چمکتی پیشانی، آنکھوں پر گولڈن فریم کا چشمہ، ریشمی میرون گاؤن اور منہ میں دبا قیمتی سگار جس کے دھوئیں سے کمرہ میں ایک عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔

کمرہ کی آرائش میں سادگی کے ساتھ ساتھ نفاست بھی جھلک رہی تھی۔ مسٹرڈ کلر کے مخملی صوفوں کے اوپر ہلکے مسٹرڈ کلر کے بیک کور اور اسی میچنگ کے کھڑکیوں، دروازوں کے بھاری پردے...... صوفوں کے درمیان بچھے قالین کا رنگ بھی اودا نیلا اور سفید میچنگ کا تھا۔ ایک گوشہ میں بونسائی کا گملا اور دوسرے کونے میں پامڑی کا پودا انھیں فطرت کا رسیا ثابت کر رہا تھا۔ کہیں بھی گہرے رنگ کا سہارا نہ لینے کے باوجود کمرہ کا ماحول بے حد دلکش اور پُر سکون تھا۔

عجیب دلکشی کے عالم میں چند لمحے میں دروازے پر ساکت رہ گئی تھی۔ میرے پاؤں آگے بڑھ ہی نہیں رہے تھے۔ شاید ان کے انہماک کے ٹوٹنے کے ڈر سے یا ان کی شخصیت کا اثر زائل ہونے کے خوف سے۔ جانے یہ کیفیت مجھ پر اور کتنی دیر طاری رہتی، انھوں نے کتاب سے سر اٹھایا تھا اور میری طرف دیکھ کر چونکے تھے۔

"ارے شویتا تم۔ کب آئیں؟" وہ اور سنبھل کر بیٹھ گئے تھے۔ ان کا اس قدر بیدار ہونا مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا تھا، جیسے یہ رویّہ ان کی شخصیت کے بالکل برعکس رویّہ تھا۔

"جی ابھی آ رہی ہوں۔"

"تو وہاں کیوں کھڑی ہو، آؤ۔ بیٹھو!" کتاب سینٹر ٹیبل پر رکھ کر انھوں نے سگار ایشٹرے میں بجھا دیا۔

"جی" بیگ کو ایک طرف ڈالتی میں سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ان کا کلین شیوڈ چہرہ بالکل غیر مُبدل تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری آمد سے وہ خوش نہیں ہوئے ہوں، یا مجھے ہی محسوس نہ ہو رہا ہو۔

گھنٹی دبا کر انھوں نے ملازم کو بلایا تھا۔ نمکین اور چائے لانے کو کہہ کر وہ میری طرف مخاطب ہوئے۔

"پاپا نہیں آئے؟" آہستہ سے انھوں نے پوچھا۔

"جی نہیں، اکیلی آئی ہوں۔"

"گڈ، ویری گڈ...... ایسا ہی ہونا چاہیے" ان کی آواز میں پُرجوش لرزش تھی۔

"جی ایسا کیا ہونا چاہیے؟" دفعتاً میرے منہ سے پھسل پڑا، اس میں تجسّس اور سوال دونوں پوشیدہ تھے۔ فوراً میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسا کیا ہونا چاہیے۔ یا ان کا اشارہ کس طرف تھا۔

"لڑکیوں کو خود اعتماد ہونا ہی چاہیے۔"

"جی ہاں، بالکل۔" جھجک کے ساتھ ان کی بات کی تائید کرتے ہوئے میں نے کہا لیکن فوراً ہی یہ بات مجھے چبھ گئی کہ آج بھی ہر جگہ عورتوں کی دیو نیچر کی تھیوری ہی کیوں قائم ہے۔ خاص طور سے یہاں...... ان سے تو مجھے ایسی اُمّید قطعی نہیں تھی، یا کہ ان کا کہنا اپنی جگہ صحیح تھا۔ میری ہی توقعات زیادہ تھیں۔ وہ تو تجربہ کار لوگ ہیں، یا کہ میں یہ بھلا دینا چاہتی تھی کہ اس دنیا میں عورت اور مرد دو فرقوں کی شکل میں موجود ہیں۔

"تمھاری تعلیم کیسی چل رہی ہے؟"

"ایم۔اے کا امتحان گزشتہ دنوں ختم ہوا ہے۔"

"سجیکٹ کیا تھا؟"

"تواریخ۔"

"اوہ......اچھا، اچھا۔" انھوں نے جملہ کو ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ ایسا لگا کہ وہ کچھ اور پوچھیں گے۔ میرے اندر بہت کچھ کھدبدا رہا تھا، موقع کی تلاش کر رہا تھا باہر نکلنے کے لیے۔ سینہ پر بارِ گراں پڑا، میرے صبر کو چیلنج کر رہا تھا۔

"پہلی مرتبہ کلکتہ آئی ہو؟"

"نہیں، دوسری دفعہ، تقریباً چھ سات سال قبل بھی پاپا کے ساتھ آئی تھی۔"

"ہاں، ہاں یاد آیا۔ اس وقت میں یہاں نہیں تھا۔ امریکہ میں رما کے پاس تھا۔"

چائے آگئی تھی۔ ہماری گفتگو میں خلل پیدا ہو گیا تھا۔ وہ چائے بنانے لگے تھے۔ رسماً میں نے چائے بنانے کی پیش کش کی۔ انھوں نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

براؤن کلر کی چائے نفیس پیالیوں میں ڈال کر دودھ ڈالتے ہوئے انھوں نے پوچھا۔

"شکر کتنی دوں؟"

"ایک چمچہ!"

"صرف ایک چمچہ......؟"

"جی ایک چمچہ ہی، کیا یہ کچھ زیادہ ہے؟"

"نہیں بہت کم، اس عمر میں اتنی کم شکر، تعجب ہے۔" پیالہ میری طرف بڑھاتے ہوئے انھوں نے کہا۔

ہم چائے کی چسکیاں لینے لگے تھے۔ میرا بیگ ابھی تک اسی جگہ پڑا اس گھر میں مجھے اجنبی ثابت کر رہا تھا۔ ویسے ان سے یہ میری اولین ملاقات نہیں تھی۔ کالج

لائف سے ہی یہ پاپا کے جگری دوست تھے۔ وقت کی مار نے دونوں کو جدا کر دیا تھا لیکن چھٹیوں میں اکثر یہ مسوری آجایا کرتے تھے۔ ہمارا چھوٹا سا گھر تھا مگر گزارا ہو جاتا تھا۔ دیر رات تک دونوں کی گفتگو چلتی رہتی اور میں خاموشی سے دونوں کی باتیں سنتی رہتی۔ فلسفہ کے ساتھ ساتھ انھیں علم نفسیات پر بھی کافی عبور تھا۔ میں ان کی زبردست فین تھی۔ اس وقت میری زندگی کے دن پنکھ لگا کر پرواز کر رہے تھے کہ دفعتاً سُشانت میرا عزیز دوست میرا ساتھی، جو چند روز بعد میرا شریکِ حیات بننے والا تھا، مجھے تنہا چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے منہ موڑ گیا تھا۔ وہ ایسی جگہ چلا گیا تھا جہاں اس پر میری چیخ پکار کا کوئی اثر نہیں پڑنے والا تھا۔ میں اداسیوں کی دھند میں کھونے لگی تھی۔ میرے سامنے جینے کا اب کوئی مقصد نہیں رہ گیا تھا۔ شروع سے ہی پاپا کے عہدہ اور بود و باش کا معیار اتنا اعلیٰ تھا کہ عام لڑکیاں میری دوست بننے سے کتراتی تھیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد پاپا کی دنیا کتب و باغبانی تک سمٹ گئی تھی۔ لاشعوری طور پر میں بھی پاپا کے ان معمولاتِ روزمرّہ میں شریک ہو گئی تھی۔

جب تلک تعلیم کی منزل باقی تھی یا سُشانت زندہ تھا مصروفیات کسی ظالم افسر کی طرح ہمیشہ سر پر سوار رہتی تھیں۔ صبح اٹھنا۔ پاپا کے ساتھ چائے لینا۔ باغبانی میں ان کا ہاتھ بٹانا...... کالج جانا...... سشانت سے ملنا۔ لائبریری سے کتابیں لانا، نوٹس تیار کرنا...... اور کھانے کی میز پر پاپا سے ڈسکس کرنا...... جہاں کبھی کبھی سشانت بھی موجود ہوتا تھا لیکن سشانت کا سدا کے لیے چلے جانا...... اور مصروفیات کا بہانا، امتحان کا ختم ہو جانا، میرے دل و دماغ میں اداسیوں کا انبار بھرتا جا رہا تھا۔ شاید پاپا میری اداسی سے ڈر گئے تھے تبھی تو خود تنہا رہنا گوارا کرنے کے بجائے مجھے یہاں آنے پر مجبور کر دیا تھا۔

چائے ختم ہو گئی تھی۔ ملازم کو آواز دے کر انھوں نے ہدایت دی تھی کہ میرا سامان ان کی بیٹی رما کے کمرہ میں پہنچا دے۔ اپنی بیٹی رما کے کمرہ میں جگہ دے کر انھوں نے مجھے رما دیدی کی جگہ پر قائم کر دیا تھا۔

کمرہ بے حد ہوادار اور صاف ستھرا تھا۔ باہر دور دور تک کھلا میدان...... پھر

چہار دیواری، اس کے بعد ناریل کے درخت، کیاریوں میں ہر رنگ، ہر قسم کے پھولوں کے پودے۔ چند لمحے تازی ہوا میں سانس لے کر۔۔ تازہ دم ہونے کے لیے میں باتھ روم میں گھس گئی تھی۔

ڈنر کے بعد لان میں کرسیاں لگ گئی تھیں۔ رات کی رانی اور شببو کی خوشبو کے درمیان ہندوستانی اور مغربی فلسفہ پر ان کی تقریر سن کر ایسا محسوس ہوا تھا کہ کیا انسان میں اتنی ساری خوبیاں ممکن ہیں؟ کیا یہ کوئی مسیحا ہیں؟ پہلا دن اولین شب کی شروعات، پاپا کی قربت سے دور، کسی انجان جگہ...... ناآشنا ماحول میں بالکل اجنبی محسوس نہ ہونا......

رات بھیگتی رہی تھی۔ ان کی باتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ میں خاموشی اوڑھے گھونٹ گھونٹ ان کے خیالات پیتی رہی تھی اور جب گھڑیال نے بارہ کا گھنٹہ بجایا تھا ہم بیدار ہوئے تھے۔ بیچارہ بوڑھا ملازم برآمدہ میں کھمبے کے سہارے بیٹھا اونگھ رہا تھا کہ کب سرکار کو کس چیز کی ضرورت آن پڑے۔

دفعتاً وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور میرے قریب آکر شب بخیر کہتے ہوئے میری پیشانی چوم لی تھی، بالکل پاپا کی طرح پیار بھرا اور پُر خلوص لمس۔ چاندنی شب، ان کی باتوں کا اثر، پہلی بار سشانت کی یادوں کا بھولنا۔ ماورائی حالت میں گرفتار ہوگئی تھی۔

پاپا بالکل صحیح کہتے تھے "تمھاری اداسیوں کا علاج صرف اَنل کے پاس ہے۔ وہ کوئی نہیں، مسیحا ہے مسیحا......"

آہستہ آہستہ اپنے کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے میں نے غور کیا۔ ان کی شخصیت کی طرح یہ گھر بھی عظیم الشان تھا جس کے کسی کمرے میں نہ دروازہ ہی بند تھا اور نہ قفل ہی۔ سب کے سب بالکل کھلے ہوئے اپنے مالک کی طرح بے باکی اور رواداری کا مظہر...... کس طرح یہ زندگی جیتے ہیں...... یا اسے سب اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتے ہیں۔ جیسے زندگی ان کی باندی ہو۔

آئندہ روز دوپہر کے کھانے کے بعد کلکتہ کی خاص دیدنی جگہوں کو دیکھنے کا

پروگرام طے ہوا۔ ریس کورس، ایڈن گارڈن، دیکھنے کے بعد ہم وکٹوریہ میموریل کی شاندار عمارت کے قریب کھڑے تھے۔ سطح سے لے کر تیسری منزل تک کھنگالنے کے بعد ہم نیچے اترے۔ ہر سو شام کی سیاہی پھیلنے لگی تھی۔ نصف چاند آسمان پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ جھیل میں وکٹوریہ میموریل کا عکس دیکھتے ہوئے دفعتاً انھوں نے پوچھا۔

"کیسا لگا وکٹورین ہتھیاروں کا مظاہرہ؟" ان کے سوال پر چونک کر میں نے تجسس سے ان کی طرف دیکھا...... اس سوال میں کئی اور سوال پوشیدہ محسوس ہوئے۔ ہتھیاروں کا مظاہرہ...... خواہ کسی بھی عہد کا ہو ضرور شقاوت کی نشاندہی کرتا ہے۔ کیا انسان بھی انسان کے دوست نہیں ہو سکتے، انسانیت کے دشمن یہی ہوتے ہیں۔ شاید انسان نے عقل کے ساتھ ہی ہتھیاروں کا تصور بھی کیا ہوگا، کیونکہ عقل ہی خون کی پہچان ہوتی ہے لیکن یہ باتیں میں ان سے کہنا نہیں چاہتی تھی۔ میرے خیالات ان کو مرغوب نہ ہوں گے، ہو سکتا ہے اس موضوع پر ان کا کچھ اور نظریہ ہو لہٰذا ان سے یہی کچھ بات جاننے کی غرض سے کہا۔

"اچھا بھی اور برا بھی۔"

"ہوں" وہ چند لمحے خاموش رہ گئے تھے۔ شاید میرا جواب انھیں طفلانہ محسوس ہوا تھا۔

"اچھا بھی اور برا بھی؟" بھلا وہ کس طرح۔ اچانک انھوں نے پھر پوچھا۔

"اچھا سے میری مراد تھی کہ وہ اوّلین اچھا ہتھیار رہا ہوگا جس سے پھل توڑ کر یا جنس اگا کر اپنی بھوک مٹائی گئی ہوگی اور وہ اولین برا ہتھیار رہا ہوگا جس سے اس نے کسی معصوم کی جان لی ہوگی۔"

"اتنی گہرائی ہے تمھارے خیالات میں؟" انھوں نے کہا۔ ان کی آواز میں پوشیدہ حیرت کو ہمدردی سمجھ کر میں خوش ہو گئی تھی۔

کبھی چڑیا خانہ، کبھی عجائب گھر، کبھی کالی باڑی گھومنے جاتے۔ دس دن گزر گئے تھے۔ اپنا قیمتی وقت خوشی سے وہ مجھ پر نثار کر رہے تھے۔ ایک ایک دیدنی جگہ کی اہمیت، اس کی وضاحت۔ ہر زاویے سے اس کا تجزیہ، ان جگہوں کے علم میں اضافہ کر دیتا تھا۔

ان کی عظیم الشان شخصیت کے بوجھ کے نیچے میں دبتی جارہی تھی۔

علی الصبح آنکھ کھل گئی تھی۔ سشانت کے خواب نے مجھ کو جھنجھوڑ کر جگا دیا تھا۔ دس روز میں پہلی مرتبہ سشانت کے خواب سے سینہ میں دفن درد کی ٹیس پھر سے محسوس ہوئی۔ بستر سے اٹھ کر کاریڈور سے ہوتے ہوئے لان میں نکل آئی۔ مغرب میں چاند اپنی شکل بناکر آرام کی تیاری کر رہا تھا۔ سارا ماحول سناٹے کی گود میں دبکا پڑا میٹھی نیند سو رہا تھا۔ بادِ مشرق کا مخملی لمس سشانت کی یادوں کو اور بھڑکا رہا تھا۔ کاش، اس خوبصورت و حسین جگہ پر سشانت بھی میرے قریب ہوتا۔ درد اشکوں میں ڈھل کر میرے رخسار پر بہہ چلا۔ اگر انسان اتنا ہی طاقتور ہے تو کسی کی یادوں پر فتح حاصل کیوں نہیں کر لیتا؟ بہت سے چہرے ارد گرد ہوتے ہوئے بھی بس ایک ہی چہرہ کیوں...... "اوہ سشانت......" میرے ہونٹوں سے کچھ الفاظ پھسل پڑے۔ دفعتاً محسوس ہوا کہ میرے پیچھے کوئی کھڑا ہے جس کی سانسیں مجھے چھو رہی تھیں۔ شاید سشانت کی روح ہو۔ اچانک پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ پڑا۔ چونک کر میں مڑی۔ وہ کھڑے تھے۔ بالکل میرے قریب......

وہ بولے "تم رو رہی ہو؟" اپنے سینے سے لگاتے ہوئے انھوں نے پوچھا۔ لمحہ بھر کے لیے میں ششدر رہ گئی۔ پھر تڑپ کر ان کی بانہوں سے آزاد ہوتے ہوئے بولی۔

"نہیں۔ نہیں تو۔"

"اتنی بولڈ ہو کر بھی تم رو رہی ہو، یہ اشک تمھاری آنکھوں میں اچھے نہیں لگ رہے۔ آؤ چلیں، چائے کا وقت ہو گیا ہے۔" وہ مڑ گئے تھے۔

"کب جانا ہے تمھیں مسوری؟" چائے کا پیالہ میز پر رکھتے ہوئے دفعتاً انھوں نے پوچھا۔

"ایک دو روز میں۔"

"یہاں دل نہیں لگ رہا؟"

کہنا تو یہ چاہتی تھی کہ یہاں سے جانے کا دل ہی نہیں کر رہا، آپ کی قربت کا

ہی نتیجہ ہے جو میں زندگی کو پھر سے زندگی کی طرح جی رہی ہوں، ورنہ سشانت کی یادوں نے تو پگھلا ہی دیا تھا مجھے...... پاپا سچ ہی کہتے تھے۔ "انل عظیم الشان انسان ہے، تمھیں وہاں میری کمی بالکل محسوس نہیں ہوگی، یہاں سے جانے کے بعد یادوں کا وہی بھنور پھر سے اپنے میں ڈبو لے گا مجھے۔"

"دل تو نہیں چاہتا جانے کو، لیکن پاپا۔"

"اوہ......" انھوں نے لمبا سانس کھینچا۔ ان کے سرد سانسوں سے ایسا لگا جیسے پاپا کی تنہائی انھیں یاد آگئی ہو۔ پھر آہستہ سے اٹھ کر وہ میرے پیچھے آکر کھڑے ہوگئے تھے اور ان کی انگلیاں میرے گیسوؤں کو سہلانے لگی تھیں۔ گیسوؤں سے پھسل کر پیشانی پر...... پھر رخسار پر...... اور پھر ہونٹوں پر...... اس سے اور نیچے اترتیں...... مگر میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ مجھے اٹھتا دیکھ کر وہ بیدار ہوئے تھے جیسے نیند سے جاگے ہوں اور آہستہ سے آکر کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ میں بھوچکارہ گئی تھی۔ وہ اٹھ کر چلے گئے تھے جیسے نیند میں چل رہے ہوں۔

یہ کیسی حرکت تھی ان کی؟ کیا وہ میری واپسی کی خبر سے پریشان ہوگئے تھے، یا اپنی تنہائی سے ڈر گئے تھے؟ پاپا کی طرح۔ پاپا بھی تو کہتے ہیں کہ شادی کے بعد بھی وہ مجھے سسرال نہیں جانے دیں گے...... لیکن ان جیسا زندگی سے لبریز انسان تنہائی سے کیسے گھبرا سکتا ہے بھلا؟ سیکڑوں سوالوں میں الجھی ہوئی بوجھل قدموں سے میں اپنے کمرہ میں آکر بستر پر گر پڑی تھی۔

اونچی عمارتوں سے پھسلتی شام پلاش کے پیڑوں پر ٹھہر گئی تھی۔ آسمان سرخ ہو اٹھا تھا۔ پرندے گھونسلوں میں لوٹنے لگے تھے۔ ماحول میں اوس بڑھ گئی تھی، کمرہ سے نکل کر میں بالکنی میں رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ کمرے کی بہ نسبت یہاں کچھ زیادہ سکون تھا۔ "تم یہاں بیٹھی ہو؟ کیا مارکیٹ نہیں چلنا ہے؟ اٹھو تیار ہو جاؤ، میں گاڑی نکالتا ہوں۔" ایک ساتھ ہی اتنے جملے۔ پوچھنا چاہتی تھی کہ دوپہر کے کھانے کے دوران کہاں تھے۔ پھر لگا، یہ فالتو سوال ہوگا؟

کلکتہ کی مصروف شام۔ چہل پہل اور شور و غل کے درمیان چھوٹی چھوٹی

جنسوں کی خریداری کرنے کے بعد پاپا کے لیے سیاہ پتھر کی نٹراج کی مورتی خرید کر ہم لوٹ رہے تھے کہ اچانک ایکوریم کی دکان پر میری نگاہ ٹھہر گئی۔ ہر سائز کا ایکوریم رنگ برنگی مچھلیوں والا۔

"تمھارا ایکوریم کیسا ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ہے۔"

"مچھلیاں سب زندہ ہیں نا؟"

"جی بالکل......"

ان کی یادداشت پر رشک آیا، تین سال قبل ایک روز میں پاپا سے اچھا سا ایکوریم خریدنے کے لیے ضد کر رہی تھی، یہ آگئے تھے۔ شاید انھوں نے ہماری باتیں سن لی تھیں اور شام کو بہت ہی خوبصورت اور بڑا سا ایکوریم لے کر آپہنچے تھے۔ من پسند ایکوریم دیکھ کر میں خوشی سے اچھل پڑی تھی لیکن منہ سے ایک بھی شکریہ کا لفظ نہیں پھوٹا تھا۔ اس وقت سے ابھی تک وہ میرے بیڈروم میں میز پر خاص اینگل سے رکھا ان کی اپنائیت اور برادری کی یاد دلاتا رہا تھا۔ بلب کی روشنی میں رنگ برنگی مچھلیاں پانی میں اٹھکھیلیاں کرتیں اتنی پیاری لگتیں۔ فرصت کے لمحوں میں انھیں غور سے نہارا کرتی اور تب ان کی میں اور بھی ممنون ہو اٹھتی۔

رات آہستہ آہستہ شباب پر پہنچ رہی تھی۔ ہم لوگ گھر کی جانب لوٹ رہے تھے۔ وہ گلیوں، بازاروں کی جانکاری دے رہے تھے۔ میں خاموشی سے انھیں سن رہی تھی۔ اور دنوں کے مقابلے میں آج وہ زیادہ خوش اور پرجوش لگ رہے تھے۔ شاید میرے جیسا سامع پاکر۔

گاڑی بنگلہ پر رکی تو مجھے ایسا احساس ہوا کہ آج کی تفریح نے بری طرح پست کر ڈالا ہے۔ فریش ہونے کے بعد کھانا کھا کر اٹھنا ہی چاہتی تھی کہ وہ گڈنائٹ کہتے ہوئے اپنے کمرہ کی طرف بڑھ گئے۔ شاید وہ بھی آج تھک گئے تھے۔ میں بھی یہی چاہتی تھی۔ آج نہ کچھ پوچھنے کا موڈ تھا اور نہ کچھ سننے کا......

کمرے میں آکر کپڑے چینج کر کے فوراً بستر پر لیٹ گئی۔ بیڈ سوئچ دبا کر لائٹ

آف کی اور چادر سینے تک کھینچ لی۔ نیند کب آئی پتہ ہی نہ چلا۔

دفعتاً ایسا محسوس ہوا جیسے میرا پورا جسم کسی اژدہے کی لپیٹ میں آگیا ہے۔ سانسیں رک رہی ہیں۔ زور لگا کر اژدہے کو جھٹکنے کی کوشش کی تو جکڑن اور بڑھ گئی، چیخنے کی کوشش کی...... فوراً ایک ہتھیلی میرے منہ پر آپڑی...... چھٹپٹاہٹ سے پکڑ کچھ ڈھیلی پڑی...... فوراً میں نے ٹٹول کر بیڈ سوئچ دبادیا...... روشنی کے ساتھ ہی میری آنکھیں یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ بستر پر وہ تھے۔ ان کی آغوش میں مَیں قید تھی۔ کمرے میں ہر سُو پاپا کے یقین...... میرے اعتقاد اور ان کے امیج کی دھجیاں اڑ رہی تھیں۔ محسوس ہوا جیسے اس لمحے وہ صرف ایک مرد تھے اور ان کے لیے میں صرف ایک عورت۔ مسیحا کے چہرے پر شیطان کا چہرہ چسپاں تھا۔ جگر میں نیزہ سا چبھا اور درد سے آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ کاش، کل ہی میں یہاں سے چلی گئی ہوتی تو یہ سب کچھ دیکھنے کو نہ ملتا۔

ان کے ہاتھوں کو سختی سے جھٹک کر میں غسل خانے میں گھس گئی تھی۔ پورے جسم میں ہزاروں چھپکلیاں سی رینگ رہی تھیں۔ ابکائی کا احساس ہوا۔ ایسا لگا جیسا کسی بجبجاتے نالے سے نکل آئی ہوں۔

معلوم نہیں، کتنی دیر شاور کے نیچے بیٹھی رہی...... پرندوں نے چہچہانا شروع کر دیا۔ غنودگی ختم ہوئی۔ باتھ روم سے نکل کر کسی بھی طرح کپڑے وغیرہ سمیٹ کر اسٹیشن کے لیے چل پڑی۔

اچانک اپنے سامنے دیکھ کر پاپا خوشی اور حیرانی سے چیخ پڑے۔

"شویتا تم، اتنی جلدی؟ ابھی تو تمھاری چھٹی کے پانچ دن اور باقی ہیں۔"

"آپ کی یاد آگئی تھی پاپا۔" پاپا کے سوالات کو ٹالنے کی نیت سے میں نے کہا اور ان سے نظریں بچانے لگیں جن میں پانی بھر آیا تھا۔

"انل خیریت سے ہے نا؟"

"جی ہاں!"

"میں نے کہا تھا نا کہ وہاں جا کر تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔ انل انسان نہیں

دیوتا ہے دیوتا۔"

"جی" کہتے کہتے میرا گلہ بھر آیا۔ "پاپا کیا جانے یقین کا ٹوٹنا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میں ٹھیک ہو کر نہیں بلکہ درد لے کر لوٹی ہوں...... وہ بھی آپ کے اعتمادوں کے قتل کا۔"

"لگتا ہے تم بہت تھک گئی ہو۔ جاؤ اپنے کمرے میں فریش ہولو۔ میں چائے تیار کرواتا ہوں۔"

"جی پاپا......"

کمرے میں آکر میں کٹے پیڑ کی مانند بستر پر گر پڑی تھی۔ پاپا انھیں کتنا عظیم الشان سمجھتے ہیں اور ایک وہ ہیں...... دفعتاً میری نظر ایکوریم پر پڑی...... دماغ میں کچھ چبھتا ہوا سا محسوس ہوا...... ایسا لگا جیسے ایکوریم سے نکل کر سرخ زبان لپلپاتا ہوا میری جانب بڑھ رہا ہے۔ بہت گھناؤنا...... لجلجا سا۔ جھپٹ کر میں اٹھی۔ ایکوریم تک پہنچی۔ اسے دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھایا اور فرش پر پٹک دیا۔

شیشہ ریزہ ریزہ ہو گیا...... پانی بکھر گیا...... اور رنگ برنگی مچھلیاں چھٹک کر تڑپنے لگیں۔

"شویتا بیٹے، کیا ہوا؟" نیچے سے پاپا کی آواز آئی۔

"کچھ نہیں......"

"تم خیریت سے ہو نا؟"

"جی پاپا......" کہہ کر میں خاموشی سے لیٹ گئی۔

نگار عظیم

نگار عظیم (اصلی نام مہر نگار) ۹ ستمبر ۱۹۵۱ء کو میرٹھ (یو۔پی) میں پیدا ہوئیں۔ان کی تعلیمی قابلیت ایم۔اے (فائن آرٹس) اور اردو میں پی۔ایچ۔ڈی ہے۔

نگار عظیم پچھلی دو دہائیوں سے افسانے لکھ رہی ہیں۔ان کے دو افسانوی مجموعے 'عکس' اور 'گہن' شایع ہو چکے ہیں۔ان کے موضوعات نفسیاتی اور سماجی ہیں۔ وہ بیشتر افسانوں میں نچلے متوسط مسلم سماج کے مسائل کی عکس بندی کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔وہ ترقی پسند تحریک سے خاصی متاثر نظر آتی ہیں۔

نگار عظیم برابر کہانیاں تخلیق کر رہی ہیں ان سے مزید بہتر کہانیوں کی توقع کی جا سکتی ہے۔وہ آج کل دلّی میں مقیم ہیں۔

نگار عظیم

سنگین جرم

لوگوں کا خیال تھا کہ ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی دس پندرہ دن میں حالات معمول پر آجائیں گے، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بیس دن گزر جانے کے بعد بھی ہواؤں کا زور بڑھتا ہی جارہا تھا۔ پچاس پچاس برس سے رہنے والے لوگ اپنے اپنے گھر چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ دونوں فریقین کو پکا یقین تھا کہ یہ سب عارضی ہے۔ کچھ دن گزر جانے کے بعد ہواؤں کا رخ بھی بدل جائے گا اور وہ پھر اپنے آشیانے آباد کریں گے۔

حاجی عبدالودود ریٹائرڈ ڈی۔ سی۔ پی اپنے جدی مکان میں پچھلے تین برس سے فالج زدہ پڑے تھے۔ ان کی دونوں ٹانگیں مفلوج ہو گئی تھیں۔ چھوٹے سے خاندان میں بیوی اور تین بیٹیوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

پہلی بیٹی حسین دوسری امرین اور تیسری آفرین۔ حسین ۲۳ سال کی تھی۔ بی اے بی ایڈ کے بعد مقامی اسکول میں ٹیچر ہو گئی تھی۔ پچھلے برس اس کی منگنی بھی ہو گئی تھی۔ انتظار اس بات کا تھا کہ امرین کی ملازمت لگ جائے تو حسین کی شادی کر دی جائے۔ امرین نے آرکیٹکٹ کا ڈپلوما کیا تھا۔ ان دنوں نوکری کی تلاش میں سرگرداں تھی۔

آفرین چودہ برس کی تھی۔ نویں جماعت میں پڑھ رہی تھی۔ حاجی جی اور ان کی بیگم اونچے خاندان، اچھی شکل و صورت اور عمدہ شخصیت کے مالک تھے۔ اس لیے لڑکیاں بھی ماشاء اللہ ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ بیٹا کوئی نہیں تھا۔ لیکن حاجی صاحب کو اس بات کا کوئی غم نہیں تھا۔ اپنی نوکری کے دوران تو انھیں معلوم ہی نہیں چلا کہ وقت کب اور کیسے گزر گیا۔ جب سے بیمار ہوئے تھے ایک ایک دن کاٹنا مشکل ہو گیا تھا۔

سات دسمبر سے فساد شروع ہوا تو گھر میں راشن پانی ڈال کر بے فکر ہو گئے۔ مکان چھوڑ کر بھاگنے کا خیال انھیں کبھی نہیں آیا۔ وہ اپنی جگہ مطمئن تھے لیکن بیوی اور بیٹیاں اس فساد سے کافی پریشان اور خوف زدہ تھیں، کیوں کہ کئی روز سے رات کے گھپ اندھیرے میں آگ کے بھڑکتے شعلے دیکھ کر ایسا لگتا کہ یہ شعلے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔ اللہ اکبر۔ ہر ہر مہادیو۔ جے بجرنگ بلی کے نعروں سے ماحول ایسا خوفناک ہو جاتا کہ مکان کے در و دیوار سے بھی وحشت برسنے لگتی۔

بیگم صاحبہ اور تینوں بیٹیاں حاجی جی کے ارد گرد ہی منڈلاتی رہتیں۔ جب کبھی فائر بریگیڈ کی ٹن ٹن سنائی دیتی تو ماحول اور ہولناک ہو جاتا۔ ایسے میں خود بخود کسی نہ کسی کے قدم چھت کی طرف اٹھ جاتے اور آنکھیں کسی نہ کسی روزن سے باہر کا خوفناک منظر دیکھنے لگتیں۔ اب دو دن سے سب کچھ خاموش تھا۔ چاروں طرف قبرستان کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بیٹیاں باپ کے پلنگ کی پٹی سے لگی بیٹھی رہتیں۔ فائر بریگیڈ کی آواز بھی اب آنا بند ہو گئی تھی۔ بجلی اور ٹیلی فون کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا تھا۔ رات کے اس خوفناک سناٹے میں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی اب مدھم پڑ گئی تھیں۔ بیوی اور بیٹیوں کے پیلے چہرے دیکھ کر حاجی جی کے چہرے کا اطمینان بھی چغلی کھانے لگا تھا۔ شاید وہ خطرے کو بھانپ گئے تھے۔ انھوں نے اپنی بیگم کو مشورہ دیا کہ رات کی خاموشی میں تینوں بیٹیوں کو وہاں سے نکال لے جائیں۔ ان کی آواز رندھ گئی...... "میں یہیں پڑا رہوں گا...... حالات درست ہو جائیں گے تو......" ان کی بات بیچ میں ہی رہ گئی...... کہ حسین بھاگی ہوئی آئی...... وہ بری طرح ہانپ رہی

تھی...... امی وہ سب ادھر ہی آرہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں مشعلیں ہیں، بندوقیں ہیں، وہ بہت سارے ہیں۔ اب کیا ہوگا ابا؟ تینوں بیٹیاں باپ سے چمٹ کر رونے لگیں۔ ماں نے دروازے کی جھری سے باہر جھانک کر دیکھا۔ نکل بھاگنے کا موقع بھی نہ تھا۔ اتنی ہی دیر میں دھڑ دھڑ ادھڑ...... دھڑ دھڑ...... دروازہ پیٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔ چوکھٹ کی بنیادیں ہلنے لگیں۔ سب ادھر ادھر بھاگ کر چھپنے لگے۔ دروازہ زوردار دھڑام کی آواز کے ساتھ اندر کی طرف گر گیا۔ ایک جم غفیر مکان کے اندر داخل ہوا۔ پل بھر میں ہی وہاں کی ہر چیز بدل گئی۔ حاجی جی ہاتھ جوڑ کر لرزتے ہوئے ہونٹوں سے کہا "بھائی جو کچھ تمھیں لینا ہے لے لو۔۔ آگ نہ لگاؤ۔"

پولیس کی وردی میں کئی لوگوں کو دیکھ کر حاجی جی بولے "میں بھی تمھاری ہی طرح...... "" "چپ بڈھے۔۔" "لیکن جیسے ہی کسی نے بڈھے پر ٹارچ سے روشنی ڈالی تو انھیں بڈھے کے پیچھے کوئی کلبلاتا ہوا محسوس ہوا۔ انھوں نے کالی گھٹاؤں جیسے بالوں کو پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ بے ترتیب بالوں میں ایک خوب صورت چاند چمکا...... جس کی چاندنی پیلی پڑ چکی تھی حاجی جی گڑگڑائے۔۔ "یہ میری بیٹی ہے...... میری بیٹی ہے یہ۔۔ تم سب کچھ لے لو۔۔ سب کچھ۔۔ لیکن اسے......" باپ کے گڑگڑانے کی آواز مدھم ہوتی چلی گئی۔ آفرین کی چیخیں اندر ہی اندر گھٹ کر اب بند ہو گئیں۔۔ پہلے ایک۔۔ پھر دوسرا۔۔ پھر تیسرا۔۔ اور اسی طرح سلسلہ چلتا رہا...... نہ معلوم کب تک۔۔

طوفان تھما تو ادھر ادھر سے چھپی ہوئی حسین، امرین اور ماں باہر نکلے۔۔ پلنگ سے باہر لٹکا ہوا باپ کا مردہ جسم دیکھ کر بھی کسی کا آنسو نہیں نکلا۔۔ آفرین کے تن پر ایک چیتھڑا بھی نہیں تھا۔ اس کی نچی کھسٹی لاش نہ صرف داغدار تھی بلکہ ایسا لگتا تھا جیسے جنگلی جانوروں نے اس کے پورے جسم کو بھنبھوڑ ڈالا ہے۔ کئی دن تک تینوں ماں بیٹیاں گڈھے کھود کھود کر دونوں لاشوں کو دفناتی رہیں۔ ہر ایک زبان گنگ تھی۔ کوئی کسی سے نہ بولتا تھا۔ نہ کھاتا تھا نہ پیتا تھا۔ تین دن اسی سناٹے کے عالم میں قبر کی طرح سے گزر گئے۔ چوتھے دن پھر ہنگامہ سنائی دیا...... اڑوس پڑوس کے مکانات سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ شاید ان مکانوں کے تمام افراد یا تو لقمۂ اجل بن گئے تھے یا بھاگ گئے

تھے یا پھر زندہ یا مردہ ان مکانوں میں جل رہے تھے۔ ضرور ان کے مکان کی بھی باری آئے گی۔ لوٹ کھسوٹ کے بعد اب آگ زنی کا دور شروع ہوا تھا۔ وہ رات تو آنکھوں میں آنکھوں گزر گئی...... دوسرے دن شام کو ٹوٹے دروازے سے ایک بھیڑ پھر اندر داخل ہوئی۔۔ ابھی وہ ڈیوڑھی بھی پار نہ کر پائے تھے کہ ٹھائیں ٹھائیں کی آواز ہوئی اور اندر داخل ہونے والے لوگوں میں سے ایک کے بعد ایک دو تین گر پڑے۔ حملہ آوروں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ وہ واپس بھاگنے لگے۔ حسین کے ہاتھوں میں باپ کی بندوق تھی۔ اور وہ نشانہ تانے دالان کی چھت پر کھلنے والی کھڑکی کے درمیان کھڑی تھی۔ دَنادَن پولیس کی گاڑیاں آگئیں۔۔ تین افراد کے قتل کے الزام میں تینوں ماں بیٹیوں کو گرفتار کر کے گاڑی میں لے گئیں...... کیوں کہ جرم بہت سنگین تھا۔

غزال ضیغم

غزال ضیغم ۱۷ دسمبر ۱۹۶۵ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ ان کی تعلیمی قابلیت ایم،ایس، سی (نباتات)، قانون میں ڈگری اور اردو ادب میں ایم۔اے ہے۔

غزال ضیغم ایک افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ 'ایک ٹکڑا دھوپ کا' شایع ہو چکا ہے۔ ان کے افسانوں کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اپنی تہذیبی جڑوں کی تلاش ہے۔ اس عمل میں وہ اپنی پوری تہذیبی اور ثقافتی وراثت اور اقدار کا از سرِ نو جائزہ لے کر اپنے نتائج اخذ کرتی ہیں۔ ان کے ذہن کا تجسس ان کے روشن مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے۔

غزال ضیغم محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ لکھنؤ، اتر پردیش میں فلم آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔

غزال ضیغم

سوریہ ونشی چندر ونشی

یہ سارا جھگڑا اس وقت شروع ہوگیا جب روحی خان ولد مرحوم محمد عباس خان بھالے سلطان نے بڑے چچا کی الماری صاف کرتے کرتے مقدمے کی بھاری فائل گرادی۔ پھر اٹھاکر رکھنے لگیں تو ٹکڑے ٹکڑے شکستہ کپڑے پر چھپے خاندانی شجرے پر نظر پڑ گئی۔ تجسس بڑھا! جانکاری بڑھی! اصل میں یہ جانکاری ہی انسان کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ نہ انسان جانے نہ سوچے نہ سمجھے بس جیے جائے تو جینا کتنا آسان، کتنا سہل ہے۔ جو بزرگوں نے کہہ دیا اس کو آنکھ بند کر کے قبول کرتا جائے۔ ذرا سا لیک سے ہٹا نہیں کہ ہنگامہ شروع۔

روحی کی نظریں خاندانی شجرے پر جم گئیں۔ فوراً قلم کاغذ لے کر بیٹھ گئی اور کپڑے کے ٹکڑوں کو جوڑ کر شکستہ دستاویز کو سفید کاغذ پر اتارنے لگی۔ بڑے چچا نے ٹوکا۔ امی نے سمجھایا۔ اقبال بھیا نے منع کیا۔ بڑے ابا نے آنکھیں دکھائیں۔ لیکن روحی تو سدا کی ضدی تھی۔ جس بات کی دھن سوار ہو جائے! شجرہ اس نے رات کے اندھیرے میں لالٹین کی مدھم روشنی میں پھر ایک بار پڑھا......

سوریہ ونشی چھتریوں کے قومی اور گوتری شجرے اور ان کا مورثِ اعلیٰ بیومت منو (جناب نوح) اور ان کے لڑکے اکشواس جس نے اجودھیا کو آباد کیا اس سے

راجا رام چندر
لو
کش
بسین
برگوجر
گوہل
راٹھور
گھاوت
کاٹھی
بھالے سلطان
کجلوئی
راجکمار
رائے برار
راج سنگھ
کنور سنگھ
برہم دیو سنگھ
پالی دیو
راگھورائے
ناہر سنگھ
معروف بہ
ملک پال خان
ہم خان
تتار خان
جمشید خاں (شیعہ ہوئے)
اعظم خان
اصغر خان
(لاولد)
حسن خان
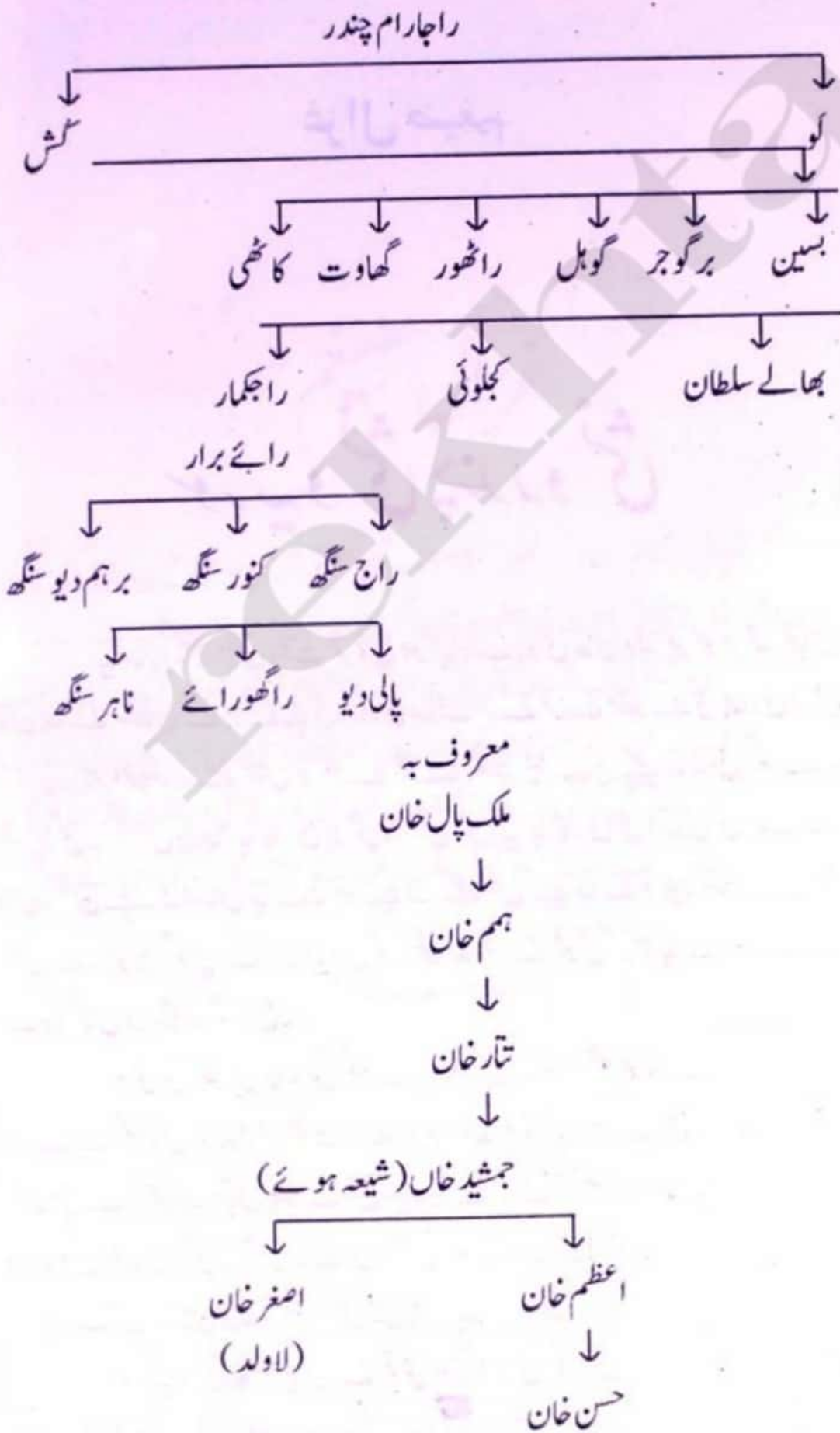
لے کر راجا رام چندر جی تک کل ۵۷ پشتیں ہوتی ہیں (بقول کرنل ٹاڈ)
راجا رام چندر جی سے شالباہن تک ۳۰ پشتیں ہوتی ہیں۔ شالباہن سے
رائے برار تک ۴۳ پشتیں ہوتی ہیں۔

"او...... گاڈ...... میں سوریہ ونشی ہوں!" اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل
گئی۔

"ہوں......" اماں جانی نے ہنکاری بھری۔

"اماں میں سوریہ ونشی ہوں۔"

اماں نے جھلا کر ہاتھ پنکھا پھینک کر مارا۔ "بد تمیز لڑکی...... اللہ سے ڈر......"

"ارے میں رام چندر کی اولاد ہوں......"

"خدا غارت کرے تمھیں۔" اماں صلواتیں سنانے لگیں۔ وہ منہ تک چادر
اوڑھ کر ہنستے ہنستے سو گئی۔

صبح اٹھتے ہی اس نے اقبال بھیا کو پکڑ لیا۔ "یہ لڑکیوں کا نام شجرے میں کیوں
نہیں ہوتا؟"

اقبال بھیا نے گھور کر دیکھا "حد میں رہو لڑکی۔"

"میرا نام ضرور لکھوا دیجیے نہیں تو میں خود ہی لکھ دوں گی۔"

"بکو مت" اقبال بھیا کھسک لیے۔

"ہم پانچ پشت سے ہی تو شیعہ ہوئے ہیں چچا۔"

"ہوں۔" چچا گنگنائے "پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں۔"

"یہ بحث کرنے کے بجائے روحی بیگم باورچی خانے میں جا کر چچی کے ساتھ
شامی کباب بنواؤ۔" اماں جانی نے سر و تا پنک کر ٹوکا۔

وہ جھٹ اپنے کورس کی کتابیں سمیٹ کر کوٹھے پر چڑھ گئی جہاں وہ اطمینان
سے پڑھ سکتی تھی۔ وہ خاندان کی پہلی لڑکی تھی جس کو کالج میں تعلیم دلائی جا رہی تھی۔
نیچے اماں جانی چلاتی رہیں۔ وہ اوپر چڑھ کر نوٹس بناتی رہی۔ بی۔ اے میں اس نے پورے

قصبے میں امتیازی نمبر پائے اور شہر میں جا کر قانون پڑھنے کی ضد باندھ لی۔

پورا خاندان قانون پڑھنے کے خلاف۔ "یہ بھلا لڑکیوں کے پڑھنے کی کوئی چیز ہے؟" بڑے چچا چیخے۔

"بڑے چچا یہ چیز نہیں ہے کوئی، علم ہے اور علم حاصل کرنا میرا حق ہے۔" اس نے بے خوف ہو کر کہا۔

"حق...... ؟ یہ ابھی سے حق کی بات کرنے لگیں۔ جانتی بھی ہو لڑکیوں کا کوئی حق نہیں ہوتا۔" اقبال بھیا بگڑے۔

"یہ میں کیسے مان لوں کہ لڑکیوں کا کوئی حق نہیں ہوتا؟ یہی جاننے کے لیے تو میں قانون پڑھوں گی۔"

اور ضدی روحی نے ابیؔ کو راضی کر لیا، کیوں کہ ان کو منانا سب سے زیادہ آسان تھا اور وہ تعلیمِ نسواں کے خلاف بھی نہیں تھے۔ لیکن ہاسٹل میں رہنے کی اجازت نہیں ملی۔ روحی نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ اماں جانی کا اختلاج بڑھ گیا اور بڑے ابا کا بلڈ پریشر۔ جھک مار کر اجازت دے دی گئی۔ بی روحی اپنی جیت پر خوش خوش ہاسٹل آ گئیں۔ سخت ہدایتیں دی گئیں کہ کسی قسم کی خرافات نہ کرنا، صرف پڑھائی سے مطلب رکھنا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ساری ہدایتیں طاق پر رکھ کر روحی شہر کی رونق میں کھو گئیں اور چند ہی مہینوں میں آل انڈیا اسٹوڈنٹ فیڈریشن کی لیڈر بن گئیں۔ اخبارات میں اس نے نظامِ سرمایہ داری کی مخالفت میں مضامین لکھنا شروع کیے۔ شہر میں ان مضامین نے تہلکا مچا دیا۔ ایک جاگیردار گھرانے کی لڑکی اتنی روشن خیال...... شہر کی ساری خبریں اقبال بھیا قصبے میں پہنچانے کا کام نہایت تندہی سے کرتے رہے۔ خود بے چارے دس سال شہر میں رہ کر بھی بی۔ اے پاس نہ کر پائے۔ مڈل تو قصباتی ماسٹروں نے نقل کرا کے پاس کرا دیا تھا۔ زمیندار گھرانے سے کس کو دشمنی مول لینی تھی۔

دھیرے دھیرے اس نے سارے خاندان کی ہمدردیاں کھو دیں۔ اس سے ملنے لمبی چھٹیوں میں بھی کوئی نہیں آتا تھا۔ اس نے بھی گھر کے بارے میں سوچنا

چھوڑ دیا تھا۔ لیکن برسات کی رات میں جب کوئی جگنواس کے کمرے میں آجاتا تواس کو اپنا بچپن اور گھر بری طرح یاد آنے لگتے۔ اس کا تکیہ روتے روتے بھیگ جاتا۔ اس کی روم پاٹنر سریتاسریواستو ہی اس کے آنسوؤں کی نمی کو محسوس کرتی اور تسلی دیتی۔

"ابھی ہمیں بہت لمبی لڑائی لڑنی ہے بی کم بولڈ ڈیر (Become bold dear) اس کی اُداسی سے عاجز آکر ایک دن سریتا کہہ ہی بیٹھی۔ "چلی کیوں نہیں جاتی ہو گھر کچھ دنوں کے لیے؟ تمھارا جی بھی بہل جائے گا......"

"پچھلی بار جب میں گھر گئی تھی تو میرے بڑے بھائی نے اپنے بچّے کے ساتھ کرکٹ کھیل رہے گاؤں کے ایک بچے کو صرف اس لیے بیٹ مار مار کر نیلا کر دیا تھا کہ اس نے ان کے بچّے سے زیادہ رن بنا لیے تھے اور ان کا بچّہ رو دیا تھا۔ مار کھا کر لڑکے کے منہ سے خون نکل آیا تھا اور مجھ سے کئی دن کھانا نہیں کھایا گیا۔ بھائی جان نے مجھے سمجھایا تھا کہ 'تم تو ان باریکیوں کو نہیں سمجھ پاؤ گی۔ تم شہر میں رہتی ہو۔ یہ ہماری رعایا ہے اور اگر ان سور کے بچّوں کو سبق نہ دوں تو کل کو یہ ہمارے خاندان کے وقار کو بھلادیں گے' ____ پھر میں نے ان کو گھر کی ایک کمسن ملازمہ سے چوری چھپے ملتے دیکھا تو مجھے اتنی نفرت محسوس ہوئی کہ میں نے بلڈ ریلیشن پر یقین کرنا ہی چھوڑ دیا۔ جہاں انسانیت کے کوئی معنی نہ ہوں وہاں رشتے کیا اہمیت رکھتے ہیں؟" اس نے سریتا سے پوچھا۔

سریتا نے اس کے گھنے کالے بالوں کی چٹیا باندھ کر اس کو بستر پر دھکیل دیا "اب جلدی سوجاؤ، فضول باتیں نہ سوچو بٹیارانی۔ صبح مجھے زیرو پیریڈ اٹینڈ کرنا ہے۔"

یہ ان کا قانون کا آخری سال تھا اور ان کو اچھے نمبر لانا تھے۔ پھر اسکالرشپ کا مقابلہ بھی نکالنا تھا، کیوں کہ بڑے ابّا نے اقبال بھیا کی باتوں کا اعتبار کر کے اس کو منی آرڈر بھیجنا بند کر دیا تھا تاکہ وہ اپنی پڑھائی بھی بند کر دے۔ آج کل سریتا اس کا خرچ بھی اٹھا رہی تھی۔ دونوں ایک ہی منی آرڈر کے انتظار میں رہتی تھیں۔ سریتاسریواستو کے گھر کے حالات بھی اچھے نہیں تھے۔ نہ ہی وہ زیادہ روپیہ منگا سکتی تھی۔ اس کے والد بیمار رہتے تھے اور ماں ایک پرائمری اسکول میں دور دراز گاؤں میں پڑھاتی تھیں۔ وہی

اس کا خرچ بھی بھیجتی تھیں۔ دونوں ناشتے میں بغیر دودھ کی کالی چائے پیتیں اور اُبلے چنے کھاکر پیٹ بھر تیں۔ کتابیں خریدنے کی قوت نہیں تھی اس لیے ایک طالب علم دوست کی دکان سے کتابیں لاکر رات بھر جاگ کر نوٹس بناتیں اور علی الصبح واپس کر آتی تھیں۔

اسکالرشپ کا رزلٹ آگیا۔ دونوں کو ناکامی حاصل ہوئی۔ قانون کا آخری سال بڑی مشکل سے گزرا۔ اس بیچ اُسے ریڈیو پر پارٹ ٹائم کام ملا تو کچھ راحت محسوس ہوئی۔ دونوں نے سکنڈ کلاس میں قانون کی ڈگری حاصل کرلی۔ سریتا گھر چلی گئی اور روحی نے مشہور وکیل وجے سنگھ کے انڈر میں ہائی کورٹ جوائن کرلیا۔ وجے سنگھ اسے کچھ نہ کچھ مالی امداد بھی دیتے رہتے۔

دسمبر کی ایک ڈھند بھری سمٹی شرمائی سی صبح میں روحی نے کورٹ جانے کے لیے کالا کوٹ زیب تن کیا اور ہاسٹل کے گیٹ کی طرف بڑھی ہی تھی کہ اقبال بھیا آتے دکھائی دیے۔ 'خیریت؟' اتنے دنوں بعد ان کو دیکھ کر اس کا دل انجانے خطرے سے دھک دھک کرنے لگا۔

"فوراً گھر چلو، اماں جانی سخت بیمار ہیں۔" وہ روتی ہوئی گھر کے لیے چل پڑی۔ یکے سے اترتے ہی اس کے کانوں میں شادیانوں کے بول پڑے جنھیں میراثنیں روایتی انداز میں دہرا رہی تھیں۔ گھر کی رونق باہر ہی سے اعلان کر رہی تھی کہ کسی کی شادی کا ہنگامہ ہے۔

"کس کی شادی کا انتظام ہو رہا ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ کی" اقبال بھیا بڑی کمینگی سے مسکرائے۔

"مجھ سے پوچھے بغیر؟ آپ نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟...... کہ اماں جانی......؟" غصہ اور رنج سے اس کا حلق خشک ہو گیا، آواز پھٹ سی گئی۔

"اگر میں سچ بولتا تو کیا وکیلنی صاحبہ تشریف لاتیں؟" انھوں نے کلیجے میں برچھی کی انی لگادی۔ اس نے غصے میں پیر پٹخ ڈالے۔ سب نے اس کو نرغے میں لے لیا۔ روتے روتے اس کو اپنی بے بسی پر ہنسی آنے لگی۔ دل کڑا کر کے اس نے مورچہ

سنبھال لیا۔

''اے بی بی گھر کا دیکھا بھالا لڑکا ہے، چچا کی اولاد...... انجینئر۔''

''اماں جانی وہ انجینئر نہیں جونیئر انجینئر ہے۔ ڈپلومہ پاس'' اس نے نتھنے پھلائے۔

''اے...... تمھاری طرح کالج کی پڑھی لکھی نہیں۔ لیکن یہ سمجھ لو کہ تم کو خاندان کے بزرگوں کی بات ماننی ہے۔''

''جی نہیں، شادی مجھے کرنی ہے، فیصلہ میں خود کروں گی۔''

''ہم لوگ یوں ماں باپ سے زبان نہیں لڑاتے تھے۔ جو کہتے تھے مان لیتے تھے۔'' چچی پھسپھسائیں۔

''تبھی تو چچا سے آپ کی کبھی نہیں بنی۔ وہ صالحہ پھوپھی کو آج بھی چاہتے ہیں اور آپ ان کو قابو میں کرنے کے لیے رات دن وظیفے پڑھتی ہیں۔''

''خدا کے لیے زبان کو لگام دو روحی...... یہ آوازیں باہر جائیں گی تو مردانے میں سب کیا سمجھیں گے۔ شہر میں کسی مردوئے کو چاہنے تو نہیں لگیں تم؟'' بڑی اماں نے کہنی ماری۔

''کہنی مار کر مجھے خاموش نہیں کرا سکتیں آپ بڑی اماں۔ میں شہر میں کسی کمبخت کا منہ بھی نہیں دیکھتی۔ لیکن ابھی چیخ چیخ کر کہہ دوں گی کہ مجھے عادل جیسے دبّو رئیس سے شادی نہیں کرنی...... نہیں کرنی......''

''کیوں...... کیوں نہیں کرنی...... تم میں سُرخاب کے پر لگے ہیں؟'' اماں جانی کھول اٹھیں۔

''ہاں مجھ میں سُرخاب کے پر لگے ہیں۔ میں ہرگز شادی نہیں کروں گی۔ زہر کھالوں گی۔ میں آپ کی زمین کا قطعہ نہیں ہوں کہ جس کو چاہے آپ دے دیجیے۔ اکیس سال کی لڑکی ہوں۔ قانونی حق ہے میرے پاس بالغ ہونے کا......''

اماں جانی کو اختلاج کا دورہ پڑ گیا۔

اس نے فیصلہ ابّی کے سامنے پیش کر دیا۔ ''آپ لوگ اپنی مرضی کر لیجیے۔

میں آپ لوگوں کے خلاف مقدمہ لڑوں گی۔ یہ نکاح ناجائز ہوگا۔"
"لیکن کیوں بیٹی؟" ابیّ نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کی نفرت کا آتش فشاں پھٹ پڑا۔
"ابیّ یہ بد عقل میری زندگی عذاب کر دے گا۔ بڑی چچی کے طعنے مجھے گھٹ گھٹ کر مرنے کو مجبور کر دیں گے۔ سعودی عرب کا سنہرا پنجرہ مجھے راس نہیں آسکتا۔ مجھے آزادی چاہیے۔ میرا پورا کیریئر چوپٹ ہو جائے گا......"
ابیّ ایک دم گم صم ہوگئے۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور باہر نکل کر بڑے چچا کے یہاں انکار کہلا دیا۔ گھر بھر میں محشر بپا ہو گیا خوب رونا پیٹنا مچا۔ بڑے ابّا اپنے مکمل چنگیزی جلال کے ساتھ دہاڑتے ہوئے نکلے۔ خوب صلواتیں پڑیں اس پر۔ وہ سر جھکائے سب کی آوازیں سنتی رہی۔ غنودگی سی طاری ہو گئی اس پر۔ لگا ڈھیر ساری مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔ صبح پہلی بس سے وہ ہاسٹل واپس آگئی۔ ہاسٹل آتے ہی اس کو سریتا سریواستو کا خط ملا کہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا ہے اور وہ ماں کے اسکول میں ہی پرائمری کلاسیں پڑھانے لگی ہے کیوں کہ اب اس پر چھوٹے بھائی بہنوں کی ذمہ داری بھی آگئی ہے۔
"سنا تھا اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔" روحی نے چپکے سے سوچا اور دل مضبوط کر کے وجے سنگھ کے مقدموں کی فائل پڑھنے لگی۔ ہندو لا اور مسلم لا کا موازنہ کرتے ہوئے اس نے لکھا۔ نکاح ایک معاہدہ ہے جو کہ دو پارٹیوں کے بیچ کیا جاتا ہے (Nikah is a contract) اور اس کو توڑا بھی جاسکتا ہے، طلاق کی صورت میں۔ جب کہ ہندو لا میں شادی ایک مکمل مذہبی رسم ہے جس کو توڑا نہیں جاسکتا۔ مذہبی طور پر، ہاں عدالت سے طلاق حاصل کیا جاسکتا ہے۔
شاید وجے سنگھ نے اس کو کسی کولیگ سے کہتے سن لیا تھا کہ وہ سوریہ ونشی ہے اور کنورٹیڈ مسلم ہے۔ "میں چندر ونشی ہوں" انھوں نے ایک دن اس کو بتایا تھا۔ اس کو یہ خبر پا کر ہنسی جیسا کوئی ردِ عمل نہیں ہوا کیوں کہ عرصہ ہوا اس نے ہنسنا چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ وہ ٹھیک سے ہنس بھی نہ سکی۔ ایک نیوٹرل زون میں وہ کافی عرصے

سے جی رہی تھی۔ ابیّ اور لمّاں جانی کے انتقال کی خبر ملے اس کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔

ایک اداس سی برسات کی شام تھی، نیم کے کسیلے پھولوں کی نرم مہک۔ بھیگی بھادوں کی ہوا۔ بارش کے قطرے درختوں پر ٹھہرے سے گئے تھے۔ اچانک چیمبر میں بجلی چلی گئی۔ کمرے میں تنہا وجے سنگھ اور روحی خان ہی تھے۔ وجے سنگھ نے ماچس کی تیلی جلائی۔ چیمبر میں سناٹا سائیں سائیں کرنے لگا۔ اس کا دل زور سے دھڑکا۔ ماچس کی تیلی بجھ گئی۔

کرانک بیچلر۔ وجے سنگھ نے سرگوشی میں اس کو پروپوز کردیا۔ گھبراہٹ میں اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہوگئے۔ یہ حادثہ بھی میری زندگی میں ہونا تھا؟ اس نے بے کسی سے سوچا۔ اگلے دن اس نے سریتا کو ایک طویل خط میں یہ حادثہ بھی لکھا۔ فوراً ہی جواب آگیا۔ سریتا نے لکھا تم ۳۵ کے اوپر ہوچکی ہو۔ فیصلہ کرلو تو بہتر ہے۔ کب تک اکیلی زندگی سے جوجھتی رہو گی۔ پھر ایک دن ہائی کورٹ میں ہی چند دوستوں کی موجودگی میں روحی خان مسز سنگھ بن گئیں۔ لیکن وہ اپنی ضد کے لیے ہمیشہ روحی خان ہی لکھاتیں۔ حالاں کہ اس کو شکست کا احساس ہونے لگا تھا۔ سریتا سریواستو کہتی بھی تھی۔

کب تک بھٹکتی رہو گی؟
جب تک سنبھلوں گی نہیں!
کب سنبھلو گی؟
جب بھٹکنا چھوڑ دوں گی!

اور شاید وہ بے منزل تلاش میں بھٹک گئی تھی، سوتی تھی تو عجیب عجیب خواب آتے۔ بار بار آنکھ کھل جاتی۔ پسینے سے نہا جاتی تھی۔ پاس لیٹے وجے کو اٹھانا چاہ کر بھی نہ اٹھا پاتی۔ جگا بھی دیتی تو وہ اس کو سیز و فرونک کہہ کر جھڑک دیتا۔

نیند کے خمار میں لگتا دلدل میں پھنستی جارہی ہے۔ وہاں اپنے ریزہ ریزہ ہوتے ہوئے وجود کو سمیٹنا چاہتی تو وہ اور بکھر جاتا۔ آوازیں، کردار سب ہیولے بن جاتے۔

دھند میں چہرے گم ہو جاتے۔

"السلام علیکم ......" "بڑے چچا آرہے ہیں۔

دماغ میں مندر کا گھنٹہ ٹن بولتا۔ بوڑھے پنڈت کے بول گونج جاتے :

سنکٹ ہرے مٹے سب پیرا

جو سُمرے ہنومت بل بیرا

ابّی کے چہرے کی جھریاں مسکراتیں۔ سبھی کردار ماضی میں تحلیل ہو جاتے۔ اذان کی آواز میں شنکھ کی آواز شامل ہو جاتی۔

روحانی طمانیت کی گھڑی...... لیکن وہ اور مضطرب ہو جاتی۔ اشلوک صاف طور پر سنائی دیتے۔

کیا بے کراں خلا میں بھٹکنا ہی زندگی ہے؟ وہ چونک کر اٹھ بیٹھتی۔ وجے کے خرّاٹے گونجتے رہتے۔ اس کی نظر اپنی شادی کی تصویر کے فریم پر جم جاتی جس پر گرد بیٹھ رہی تھی اور تصویر کا کاغذ بوسیدہ ہو کر زردی مائل ہوتا جا رہا تھا۔

ترنم ریاض

شہر

پلاسٹک کی میز پر چڑھ کر سونو نے نعمت خانے کی الماری کا چھوٹا سا کواڑ وا کیا تو اندر قسم قسم کے بسکٹ، نمک پارے، شکرپارے اور نہ جانے کیا کیا نعمتیں رکھی تھیں۔ پل بھر کو وہ ننھے سے دل پر کچوکے لگاتا ہوا غم بھول کر مسکرا دیا اور نائٹ سوٹ کی لمبی آستین سے، خشک آنسوؤں بھرے رخسار پر ایک اور تازہ بہا ہوا آنسو پونچھ کر اس نے بسکٹ کا ڈبہ ہاتھ میں لے لیا اور اپنے پانچ سالہ وجود کا بوجھ سنبھالتا ہوا میز سے نیچے اتر آیا۔ اسے بھوک بھی بہت لگی تھی۔ آج صبح سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا، اس کی چھوٹی سی ڈھائی برس کی بہن ثوبیہ بھی صبح سے بھوکی تھی۔ سارا دن وہ مسہری پر لیٹی اپنی ممی کو پکار پکار کر تھک گئی تھی اور بہت زیادہ روتے رہنے کے باعث نڈھال سی ہو کر اس نے اپنا گھنگھریالے بالوں والا ننھا سا سر اپنی امی کے پھیلے ہوئے بازو پر رکھ چھوڑا تھا۔ دن بھر شاید وہ سوتی رہی تھی اور کچھ دیر پہلے ہی اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آئی تھی۔

اس شہر میں آئے انھیں صرف ایک ہفتہ ہوا تھا۔

امان کو بہت عرصے سے اس شہر میں اپنی تبدیلی کروانے کی خواہش تھی لیکن اس میں بس ایک ہی پریشانی تھی کہ رہائش کا انتظام نہایت مشکل تھا۔ اس کے قصبے کے

انوار صاحب بھی اسی کمپنی میں کام کرتے تھے مگر وہ ہیڈ آفس سے وابستہ تھے اور شہر میں رہائش پذیر تھے۔ رہائش بھی کمپنی کی طرف سے ملی ہوئی تھی کیوں کہ وہ پچیس برس سے اسی دفتر میں تھے۔ اس کے بعد آنے والے ملازمین میں سے بہت کم کو فلیٹ میسّر آیا۔ غیر شادی شدہ لوگ تو ایک کمرے والی سکونت میں دو یا تین تین کے حساب سے ہوسٹل کی طرح کمرہ بانٹ لیتے تھے مگر فیملی والے ارکان کے لیے یہ مسئلہ سب سے پیچیدہ تھا۔

امان اپنے قصبے میں کمپنی کا برانچ منیجر تھا۔ انوار صاحب ہر تین ماہ کے بعد اپنی کمپنی کا کوئی کام نکال کر اپنے آبائی گھر آتے۔ بزرگ والدین سے ملاقات بھی ہو جاتی اور کمپنی کا کام بھی نبٹا لیتے۔

اس بار انوار صاحب اپنے ساتھ امان کے لیے کچھ سپنے بھی لے آئے تھے۔ بڑے شہر میں رہنے کے، بچوں کو بڑے بڑے اسکولوں میں تعلیم دلوانے کے اور ہیڈ آفس میں رہ کر ترقی کے نئے راستے وا ہونے کے۔

وہ ریٹائرمینٹ لے رہے تھے اور امان کے لیے ٹرانسفر کی بات بھی کر آئے تھے۔

امان اگر بروقت نہ پہنچتا تو اسے اور کچھ برس انتظار کرنا پڑتا اور فیملی فلیٹ اسے جب ہی ملتا جب فیملی ساتھ ہوتی ورنہ اسے بیچلر رومز میں رہنا تھا۔ انوار صاحب نے فلیٹ کی چابی ابھی دفتر میں جمع نہیں کرائی تھی۔ وہ یہ کام امان کی موجودگی میں کرنا چاہتے تھے۔ ڈپٹی ڈائرکٹر ان کی عزت کرتے تھے، انھیں یقین تھا کہ وہ ان کی بات مان لیں گے اور اس سے پہلے کہ کوئی دوسرا آنے کی کوشش کرتا وہ کسی کی علیت سے پیشتر امان کے حق میں فیصلہ کروانا چاہتے تھے۔

امان نے دو دن کے اندر ساری تیاریاں مکمل کرلیں اور مہ بابرا اور بچوں کے شہر روانہ ہو گیا۔

انوار صاحب کا فلیٹ ۱۴ منزلہ عمارت کا سب سے اوپری فلیٹ تھا۔ عمارت کی ہر منزل پر تین تین فلیٹ تھے مگر سب سے اوپر والی منزل میں یہی ایک

فلیٹ تھا۔ کیوں کہ ایک طرف ڈش انٹینا تھا اور دوسری طرف پانی کی ٹنکیاں۔ درمیان میں یہ ایک فلیٹ ہی بن پایا تھا۔ اس کے اوپر بڑا سا کشادہ ٹیرس تھا جس میں تقریبات وغیرہ ہوا کرتیں۔ وہاں سے نیچے دیکھنے پر سارا شہر دلہن کے ستارے لگے آنچل کی طرح نظر آتا۔

اس سے نیچے کے تین فلیٹس میں سے دو آباد تھے اور ایک پر کچھ تنازعہ چل رہا تھا۔ ایک فلیٹ کے مکین کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور ایک میں امان کی ہی کمپنی میں کام کرنے والے وکرم بھسین رہتے تھے۔

بابرا کو فلیٹ اور امان کو شہر بہت پسند آیا۔ فلیٹ کشادہ تھا۔ تین خوابگاہوں، ڈرائنگ روم اور باورچی خانے پر مشتمل۔ ہر کمرے کے ساتھ ملحقہ غسل خانہ، اور لباس بدلنے کے لیے چھوٹا سا احاطہ۔ اونچی چھتیں، بڑی بڑی کھڑکیاں، لمبے لمبے دروازے۔ تین دن میں فلیٹ سج گیا۔ ضروریات کا سامان آگیا سوائے ٹیلی فون کے۔ ٹیلی فون کی فیس پچھلے تین ماہ سے ادا نہیں ہوئی تھی اور ان مہربانیوں کے بدلے امان کو انوار صاحب کے لیے اتنا تو کرنا ہی تھا۔ ورنہ خواہ مخواہ انوار صاحب کی گریجویٹی وغیرہ متاثر ہوتی، بلکہ امان کو توکئی مہینے کا بجلی کا بل بھی بھرنا پڑا تھا جب جا کر بجلی بحال ہوئی۔ ٹیلی فون کا بل ادا کرنے کا وقت نہیں تھا کیوں کہ امان نے پہلے دن آفس جوائن کرنے کے بعد دوبارہ آفس کا رخ نہیں کیا تھا کہ بغیر بجلی کے اس شہر میں ایک دن کے لیے بھی رہنا مشکل تھا اور سارا وقت اسے بجلی کے ہی سلسلے میں ادھر ادھر بھٹکنا پڑا تھا۔

کوئی پانچویں دن امان دفتر گیا کہ بھسین صاحب کے فلیٹ میں اس کے لیے فون آیا تھا۔ اسے سائٹ پر جانا تھا اور واپسی دوسرے دن کی تھی۔ وہاں کچھ ایسا کام پڑ گیا کہ امان دوسرے دن نہ آسکا۔

صبح دروازے کی گھنٹی بجی تھی تو سونو کی آنکھ اسی آواز سے کھل گئی تھی۔ ممی اور ثوبیہ سو رہی تھی۔ سونو دروازے تک گیا اور اس نے دروازے کی نچلی چٹخنی بھی کھولی تھی مگر میز پر کھڑے ہونے کے باوجود اس کا ہاتھ دروازے کے اوپر والی چٹخنی تک نہ

پہنچ سکا۔

"جی کون ہے؟" اس نے پکارا بھی تھا مگر باہر سے کوئی جواب نہ آیا۔ آنے والے نے شاید اس کی آواز نہیں سنی تھی۔ اور دروازہ نہ کھلنے پر لوٹ گیا تھا۔

"ممّی۔ کوئی گھنٹی بجا رہا ہے۔ ممّی۔ ممّی" اس نے کئی بار ممی کو پکارا تھا مگر ممی جانے آج کیسی نیند سو رہی تھیں۔ جاگ ہی نہیں رہی تھیں۔

"ممّی۔۔ ممّی جی۔۔ کوئی دروازے کی گھنٹی بجا رہا ہے۔" اس نے اونچی آواز میں پکارا تو ثوبیہ نے ابروؤں کے رخ پر خمیدہ پلکوں والی مُنی مُنی آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آنکھیں جھپک جھپک کر ادھر ادھر دیکھا اور بھائی کو ممی پکارتے سن کر خود بھی ممی ممی پکارنا شروع کر دیا۔

مگر ممی بول ہی نہیں رہی تھیں۔ ممی کے دہانے کے چاروں طرف کوئی سفید سی چیز جمی ہوئی تھی۔ ہاتھ پاؤں بھی کچھ عجیب طرح سے پھیلے ہوئے تھے۔

ثوبیہ نے ماں کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر رونا شروع کر دیا۔

"چپ ہو جانا۔ روتی کیوں ہے۔" سونو نے جھلا کر کہا تو ثوبیہ اور زور زور سے رونے لگی۔

"ممی سو رہی ہیں ثوبی۔" وہ بہن کو سمجھانے کے انداز میں بولا۔

"ممی۔ ممی۔ اٹھیے نا۔" سونو نے پھر ماں کو جگانے کی کوشش کی جب تک دروازے کی گھنٹی دوبارہ بجنے لگی تھی۔

"کون ہے۔۔" وہ دروازے کے قریب جا کر اور اونچی آواز میں بولا۔ کوئی جواب نہ آیا۔

وہ واپس کمرے میں آیا۔ ثوبیہ باقاعدہ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ سونو کچھ دیر ماں کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ پھر روتی ہوئی بہن کو بغور دیکھنے لگا۔

"ممی" اس نے ممی کو پوری طاقت سے جھنجھوڑا مگر ممی بے حس و حرکت پڑی رہیں۔

وہ کچھ دیر گم صم سا بیٹھا رہا، پھر ثوبیہ کے قریب جا کر اس نے اپنے چھوٹے

چھوٹے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے۔

''نہیں رونا ثوبی۔ ممی سو رہی ہیں۔'' مگر ثوبی تھی کہ چپ ہی نہیں ہو رہی تھی۔

''چپ ہو جا۔'' وہ چیخا اور ساتھ ہی دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

جانے کب تک دونوں بہن بھائی روتے رہے مگر امی نے چپ ہی کرایا نہ کچھ بولیں۔

ثوبیہ کوئی گھنٹہ بھر روتی رہی۔ پھر تھک کر سو گئی۔

وہ سو گئی تو سونو پھر ماں کے قریب گیا۔ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر دائیں بائیں ہلانے لگا۔

''ممی'' اس نے زور زور سے ممی کا سر ہلایا ''مم۔ ممی جی'' اس نے آنسوؤں میں بھیگی آواز میں محبت گھول کر پکارا۔ ممی نے کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ دیر بعد اٹھ کر وہ ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ پردہ سرکا کر کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھنے لگا۔

سامنے ایک بڑا سا پارک تھا جس میں چھوٹے چھوٹے کھلونوں جیسے رنگ برنگے بچے کھیل رہے تھے۔ پارک میں کئی طرح کے چھوٹے بڑے جھولے لگے ہوئے تھے ادھر ادھر آئس کریم اور ویفرس کے پیکٹ والے اپنی چھوٹی چھوٹی ہاتھ گاڑیاں لیے ہوئے گھوم رہے تھے ایک ریڑھی پر نہایت ننھی ننھی بوتلوں میں کولڈ ڈرنک سجی ہوئی تھیں۔ پارک کی دوسرے جانب لمبی سی سڑک پر چھوٹی چھوٹی بے شمار گاڑیاں بھاگ رہی تھیں۔ سونو نے یہ ساری چیزیں اس قدر چھوٹی جسامت میں آج سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھیں۔ اس کے ذہن میں عجیب عجیب سوال اور خیال ابھرنے لگے۔ وہ کمرے میں لوٹ آیا۔

''ممی جی'' اس کے ننھے سے سینے سے درد بھری کراہ نکلی اور اس نے اپنا چھوٹا سا سر ممی کے سینے پر رکھ دیا اور دھیرے دھیرے سسکنے لگا۔ اس کے آنسوؤں سے ممی کے شب خوابی کے لباس کا گریبان بھیگ گیا مگر ممی نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ رو رو کر جب وہ ہلکان ہو گیا تو جانے کب اسے نیند آ گئی۔

جانے کتنا وقت وہ سوتا رہا۔

"چھوچھو" نیند میں اس کے کانوں میں ثوبیہ کی آواز پڑی تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"چھوچھو" ثوبیہ نے ممی کی طرف سے نظر ہٹا کر بھائی کو دیکھ کر کہا۔

"سُوسُو کرنا ہے" سونو نے پوچھا تو اس نے سر ہلا دیا۔ سونو نے غسل خانے کے دروازے کا دستہ گھما کر دروازہ کھول دیا۔

باہر شام ہو چلی تھی۔

ثوبیہ باتھ روم سے آکر ماں کے پاس لیٹ گئی۔

"ممی۔۔ مم۔۔ ممی" ثوبیہ نے اپنی شہادت کی انگلی سے ماں کی آنکھ کھولنے کی کوشش کی۔۔ وہ ناکام ہو کر پھر رونے لگی۔

"ممی ی ی...... " وہ ممی کو پکارتی ہوئی ہچکیاں لینے لگی۔

سونو بہن کو بے بسی سے دیکھتا رہا۔

"ممی اٹھیے نا۔۔ ممی جی۔۔ ثوبی رو رہی ہے۔ اسے بھوک لگی ہے۔"

وہ گلوگیر آواز میں ماں سے مخاطب ہوا۔۔ اسے خود بھی بھوک لگی تھی مگر جب تک اس نے ثوبیہ کی بھوک کا ذکر نہ کیا تھا، اس طرف اس کا خیال نہ گیا تھا۔

اب اسے بھوک کا احساس ہونے لگا۔

وہ ماں کے پاس سے اٹھ کر باورچی خانے میں چلا گیا۔ تمام برتن دھلے دھلائے رکھے تھے۔ کسی میں کچھ کھانے کو نہ تھا۔

اس نے فرج کھولا۔۔ اس میں سیب رکھے تھے۔۔ وہ دو سیب اٹھا کر کمرے میں آگیا۔

ایک سیب کو خود کترنے لگا اور دوسرا ثوبیہ کو پکڑوایا۔ ثوبیہ اسے کھانے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر اس کے منہ میں اُگے آٹھ دانت سیب کے سخت چھلکے کے ساتھ انصاف نہ کر سکے اور وہ محض سیب کی سطح پر ایک آدھ نشان لگا کر رہ گئی اور چپ چاپ بھائی کو دیکھنے لگی۔ سونو نے سیب کا ایک ٹکڑا توڑ کر دیا تو وہ اسے چبانے کی کوشش

میں ادھر ادھر گھماتی رہی اور آخر کار نگل گئی۔

دونوں سیب ختم ہو گئے تو سونو فرج میں پڑا آخری سیب اٹھالایا۔۔ کچھ دیر دونوں سیب پر زور آزمائی کرتے رہے اس سے فارغ ہو کر پھر ممی کو جگانے کی کوشش کرنے لگے۔

ممی کچھ نہ بولی تو دونوں رورو کر ممی کو ہلانے لگے۔ گھر میں اتنی گرمی تھی مگر ممی کا بدن ایک دم ٹھنڈا پڑا ہوا تھا...... پتہ نہیں کیوں...... پھر کسی وقت انھیں نیند آگئی......

دوسری صبح بھی ممی نہیں اٹھیں۔۔ دروازے کی گھنٹی دوبار بجی تھی۔ جس سے سونو جاگ گیا تھا۔

''جی ۔۔ ی ی۔۔ کون ہے'' کوئی جواب نہ آیا۔۔ شاید مضبوط دیواروں اور بھاری دروازے کے اس پار اس کی کمزور آواز پہنچ نہیں پائی تھی اور آنے والا پھر لوٹ گیا تھا۔

ثوبیہ نے جاگتے ہی رونا شروع کر دیا تھا اور ممی کے پاس جا کر زور زور سے چیختے ہوئے رورو کر جب مایوس ہو گئی تو ہچکیاں لیتی ہوئی باہر آگئی۔

اس کا پھول سا چہرہ کمھلا گیا تھا۔

باورچی خانے میں سونو فرج کھولے بغور اندر دیکھ رہا تھا۔ پرسوں کا پڑا ہوا دودھ پھٹ چکا تھا۔ ثوبیہ کو قریب دیکھ کر اس نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''دُوڈُو پیئے گی۔'' اس نے ممی کی طرح پوچھا تھا۔

''ہوں'' وہ زور سے سر ہلا کر بولی۔

اس نے پھٹا ہوا دودھ چمچ سے ثوبیہ کے فیڈر میں ڈالنے کی کوشش میں بہت سارا دودھ گرا کر تھوڑا سا ڈالنے میں کامیابی حاصل کر لی تو فیڈر بہن کے بڑھے ہوئے ہاتھوں میں تھما دیا۔

ثوبیہ وہیں فرش پر چت لیٹ کر دودھ پینے لگی۔ جب پھٹے ہوئے دودھ کا

کوئی ٹکڑا نپل کے چھید کو بند کرنے لگتا تو وہ پیر پٹخ پٹخ کر پوری طاقت سے نپل کو چوسنے لگتی اور رونے لگتی۔۔ پھر چپ ہو جاتی۔

سونو نے دودھ کے کچھ بچے ہوئے چمچ خود بھی پیئے اور ثوبیہ کے پاس جا بیٹھا۔ بوتل خالی ہوئی تو ثوبیہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔۔ پھر کھڑی ہو کر ممی ممی پکارتی ہوئی خواب گاہ میں چلی گئی۔

سونو بھی کمرے میں آ گیا اور کچھ دیر دروازے کے پاس کھڑا ہو کر ماں کو دیکھنے لگا۔ ممی کی شکل آج اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

مسز بھسین کی جز وقتی ملازمہ صبح اوپر آئی تھی تو کسی نے دروازہ نہیں کھولا تھا۔۔ دراصل امان نے اُن کے ہاں فون کیا تھا کہ بابرا کو بتا دیں کہ وہ ایک دن اور رک گیا ہے اور کل آ جائے گا کہ بابرا بہت جلد گھبرا جاتی ہے۔۔ ملازمہ سے دروازہ نہ کھلنے کی خبر سن کر مسز بھسین نے سوچا تھا کہ پڑوسی کہیں گھومنے گئے ہوں گے۔ یا شاید سو رہے ہوں۔ یا جو بھی۔۔

"ثوبی! آ جا اندر بیٹھیں۔" سونو نے ثوبیہ سے کہا۔

"کھڑکی سے باہر دیکھیں گے۔" وہ سر اوپر سے نیچے کی طرف ہلا کر بولا۔

"نہیں۔۔ ممی پاش۔۔" وہ جھٹکے سے نفی میں سر ہلا کر بولی۔۔

"ممی تو بولتی ہی نہیں۔۔ تو میرے پاس آ جا۔" وہ اداس سا ہو کر بولا۔ اس کا چہرہ آج پیلا نظر آ رہا تھا چھوٹے چھوٹے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔۔

"آ نا ثوبی۔۔ آ جا" وہ دھیرے دھیرے سسکنے لگا۔۔ ثوبیہ ماں کے پھیلے ہوئے بازو پر سر رکھے اپنا منّا سا انگوٹھا چوستی رہی اور چھوٹا سا سر نفی میں ہلا ہلا کر بھائی کو دیکھتی رہی۔۔

سونو اس کے قریب جا کر اسے اٹھانے لگا تو اسے محسوس ہوا کہ ممی کے پاس سے خراب سی بو آ رہی تھی۔ ممی نہائی نہیں نا کل سے۔۔ کپڑے بھی نہیں بدلے۔۔ ہم بھی نہیں نہائے۔۔ اس نے اپنا گریبان سونگھا۔ وہاں اسے پرسوں کے لگائے بے بی پاؤڈر کی ہلکی سی مہک آئی۔۔ اس نے پھر ممی کی طرف دیکھا۔۔ ممی کی شکل

بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ ایک دو الٹے قدم اٹھاتا ہوا دیوار سے لگ گیا۔۔ اس کی نظریں ماں کے چہرے پر گڑی تھیں۔۔ وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا کمرے کے دوسرے کونے میں پہنچ گیا۔۔ اور دیوار سے پھسلتا ہوا فرش پر بیٹھ گیا۔ اس کے دل میں عجیب قسم کا خوف سا چھا رہا تھا۔ اسے نیند سی بھی آ رہی تھی۔ مگر وہ پتہ نہیں کیا سوچ رہا تھا۔ خود اس کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا۔ آنکھ لگنے لگتی تو فوراً آنکھیں کھول کر ماں کے چہرے کو دیکھنے لگتا...... دور بیٹھا ہوا...... وہاں سے ماں کے تلوے نظر آ رہے تھے اور پھر ماں کا باقی جسم۔ بعد میں چہرہ...... ٹھوڑی سے شروع ہوتا ہوا۔ اس کا ننھا سا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنی انکھوں پر رکھ دیے اور...... پھر پتہ نہیں کب وہ دیوار سے لگا لگا فرش پر آ رہا اور داہنی کروٹ گول گڑی مڑی سا لیٹ گیا، اس کے گھٹنے اس کے سینے سے لگے ہوئے تھے اور وہ سو چکا تھا۔

صبح پھر دروازے کی کال بیل لگاتار کچھ پل بجی تو وہ ہی بیدار ہوا۔ دروازے تک گیا اور بے چارگی سے اسے دیکھتا رہا۔ کچھ منٹ بعد لوٹ آیا...... گھر میں ہوتا تو کھڑکی سے نانی کو آواز لگاتا۔ یہاں تو نہ وہ دروازہ کھول سکتا تھا نہ کھڑکی۔ کھڑکی کھول بھی لیتا تو اس کی آواز کون سن پاتا کہ کھڑکی سے نظر آنے والے لوگ اس کی آواز کی رسائی سے بہت دور تھے۔

آج ثوبیہ ابھی تک سو رہی تھی۔ وہ دروازے پر ٹھہر کر ماں کی طرف دیکھنے لگا۔ ماں کا چہرہ بغیر پانی کے گلدان میں پڑے کئی دن پرانے پھول سا لگ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ماں کے کچھ قریب جا کر غور سے دیکھنے لگا۔ ممی کی شکل بدل گئی تھی۔ یہ شکل کسی اور کی تھی۔ میلے سے مٹیالے چہرے والی...... اس کی ممی تو گوری تھی...... تو کیا یہ اس کی ممی نہیں تھی...... تو کیا اس کی ممی کی شکل کو کچھ ہو گیا ہے...... یا...... یا یہ کوئی اور ہے۔ کوئی عجیب سی شے...... انسان جیسی کوئی شے......

ذہن میں اس خیال کے آتے ہی وہ زور سے چیخ پڑا۔ ثوبیہ نے جھٹ سے آنکھیں کھولیں اور رونے لگی۔ وہ چیختا ہوا کمرے سے باہر بھاگا اور ڈرائنگ روم کے لمبے

صوفے کے عقب میں جا چھپا۔ اس کا چھوٹا سا وجود تھر تھر کانپ رہا تھا اور آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہہ رہے تھے۔ ثوبیہ کچھ دیر روتی رہی پھر اٹھ کر بھائی کو ڈھونڈنے لگی۔

"بیا۔ بیا۔" وہ باورچی خانے میں گئی اور روتے روتے بھائی کو پکارنے لگی۔ وہاں بھائی کو نہ پاکر ڈرائنگ روم میں آگئی۔

"بیا۔ آ۔ آ۔" اس نے نحیف سی آواز میں پکارا۔

سونو صوفے کے پیچھے سے نکل آیا۔ اس کے خوف زدہ دل میں احساسِ ذمہ داری نے قوت بھر دی۔ بہن کو دیکھ اس کے قریب چلا گیا اور دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے کر اس کے آنسو پونچھنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ ثوبی کو بہت تیز بخار ہے۔

"بیا۔ پانی۔" وہ ہچکیاں لیتی ہوئی بولیں۔

"تجھے بخار ہے...... آجا۔ ادھر لیٹ جا۔ میں پانی لاتا ہوں۔"

اس نے صوفے پر چڑھنے میں بہن کی مدد کی اور باورچی خانے کی طرف گیا۔ خواب گاہ کے قریب سے گزرتے وقت اس نے ایک ادھوری سی نظر کمرے کی طرف تیزی سے ڈالی اور فرج کے پاس چلا گیا۔ فرج میں سے بوتل نکال کر اسے گلاس میں انڈیلنے لگا۔ ساری بوتل خالی کر کے ہی کہیں گلاس بھر سکا۔

گلاس اور چمچہ لیے وہ بہن کے پاس آگیا اور اسے دھیرے دھیرے پانی پلانے لگا۔ بیچ بیچ میں ایک آدھ چمچ وہ خود بھی پیتا رہا۔

"بھوک لگی ہے؟" اس نے نہایت محبت سے ثوبیہ سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

صبح جب دروازے کی گھنٹی سن کر سونو بے بسی میں پلٹ آیا تھا اس وقت مسٹر بھسین کے یہاں پھر امان نے ٹیلی فون کیا تھا۔ اور پھر مسز بھسین نے اپنی جز وقتی ملازمہ کو اوپر روانہ کیا تھا جو لگا تار تین چار گھنٹیاں بجا کر لوٹ آئی تھی۔

ثوبیہ ڈرائنگ روم کے صوفے پر نڈھال پڑی تھی۔

سونو ذمہ دار بھائی کی طرح اس کے قریب بیٹھا تھا۔ بیچ بیچ میں دونوں

اونگھ لیتے۔۔ شاید مسلسل نقاہت یا رات بھر کی گھٹی ہوئی آلودہ فضا میں رہنے کے باعث۔

کبھی کبھی سونو سر گھما کر چور نظروں سے بیڈ روم کی طرف دیکھتا اور جلدی سے چہرہ دوسری طرف پھیر لیتا۔ وقفے وقفے سے اس کے آنسو بہہ نکلتے تھے۔

اس بار ثوبیہ جاگی تو پھر رونے لگی۔

"دودودھ پئے گی ثوبی؟" اس نے آواز میں پیار بھر کر کہا۔

"مگر دودھ تو ہے ہی نہیں۔ اچھا ٹھہر جا میں کچھ اور دیکھتا ہوں۔" ثوبیہ نے کچھ نہ کہا۔ اسے خود بھی بہت بھوک لگ رہی تھی۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باورچی خانے کی طرف گیا اور پلاسٹک کی میز کھینچ کر نعمت خانے کی الماری کے ٹھیک نیچے کی طرف لے گیا۔

بسکٹ کا ڈبہ لے کر جب وہ خواب گاہ کے باہر سے گزرا تو اس نے بے اختیار سا ہو کر اندر نگاہ دوڑائی حالانکہ وہ وہاں سے سیدھا ڈرائنگ روم میں بھاگ آنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ اسے پتہ تھا اندر اس کی ممی نہیں پتہ نہیں کون ہے اور کیا ہے۔ اس نے دیکھا کہ بیڈ روم میں پڑی ہوئی ممی جیسی کوئی چیز جیسے دب کر پھیل گئی ہے۔ بند آنکھیں جیسے بڑے بڑے ابھرے ہوئے دائروں میں دھنسی پڑی تھیں۔ اس چیز کے ہاتھ پاؤں اور چہرہ جانے کس رنگ کے تھے...... دوسرے ہی پل اس نے منہ دوسری طرف موڑا اور پوری طاقت لگا کر ڈرائنگ روم کی طرف بھاگا۔ اس کا چہرہ خوف سے سفید ہو گیا تھا۔ بدن پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔

شاید وہ ایک زوردار چیخ مار کر بے ہوش ہو جاتا مگر بخار میں چپ چاپ لیٹی ہوئی بہن نے اس کے حواس کو قابو میں رکھا۔ چیخ اس کے ننھے سے سینے میں گھٹ کر رہ گئی۔

وہ بہن کے قریب چلا گیا اور باچھیں کھول کر مسکرانے لگا تو اس کے سوکھے سوکھے لب پیلے نظر آرہے تھے۔

"بسکٹ لایا ہوں۔" وہ تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولا۔

"کھائے گی۔" وہ پیار سے پوچھنے لگا۔ اور ثوبیہ ٹکر ٹکر بھائی کو دیکھنے لگی۔
سونو نے پیکٹ کھولا اور ایک بسکٹ کا کونہ بہن کے منہ میں ڈال کر اسے کھلانے کی کوشش کرنے لگا۔
اُس وقت دروازے کی گھنٹی پھر بجی۔

بیسویں صدی کی شاعرات

ادا جعفری

ادا جعفری (اصلی نام ادا بیگم) ۲۲ اگست ۱۹۲۴ء کو بدایوں (اتر پردیش) میں پیدا ہوئیں۔ تعلیمی قابلیت ایم۔اے ہے۔

ادا جعفری نے ۱۹۳۶ء کے آس پاس اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام 'میں ساز ڈھونڈتی رہی' ۱۹۵۰ء میں شایع ہوا۔ اس کے بعد ان کے تین اور مجموعے 'شہر درد'، 'غزالاں تم تو واقف ہو' اور 'سازِ سخن بہانہ ہے' شایع ہوئے۔

ادا جعفری کے موضوعات غیر روایتی ہیں۔ ان کے کلام میں غمِ جہاں اور غمِ جاناں کے پرتو ابھر کر احساسات و جذبات کو چھو جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں رنگینیٔ جذبات بھی ہے اور گرانباریٔ حیات کا بوجھ بھی۔ ان کا تعلق غالباً اردو ادب کے اس کارواں سے ہے جو ترقی پسند تحریک سے بے حد متاثر تھا، اسی لیے ان کے کلام میں کہیں کہیں فیض احمد فیض کی شاعری کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

وہ اب کراچی (پاکستان) میں مقیم ہیں۔

ادا جعفری

بیزاری

زیست اک خوابِ طربناک و فسوں ساز سہی
رس بھرے نغموں کی اک دلنشیں آواز سہی
فرشِ مخمل بھی، زَر و سیم کی جھنکار بھی ہے
جنّتِ دید بھی ہے، عشرتِ گفتار بھی ہے
چشمِ سرشار کا اعجاز سہی
زیست اک خواب طربناک و فسوں ساز سہی!

قہر ہے، اُف یہ تسلسل، یہ تواتر، یہ جمود
یہ خموشی، یہ تسلّی، یہ گرانبار سکوت
شوق کو رخصتِ پرواز نہیں
رفعتِ روح کا دربار نہیں
جسم آسودہ سہی روح مگر ہے بے تاب
ایک بے نام تغیر کے لیے

بیزاری

درد کی ٹیس سہی لذّتِ جاوید نہیں
نغمۂ امید نہیں
قہر ہے اُف یہ تسلسل، یہ تواتر، یہ جمود!

سوچتی ہوں کہ کوئی حجلۂ تاریک ہے کیا
یہ گرانبار تسلسل
یہ حیاتِ جاوید
جس کی دیواروں کی سنگینی سے لرزاں ہے خیال!
کوئی روزن بھی نہیں، کوئی دریچہ بھی نہیں
ایک دنیا ہے کہ ہے تیرہ و محدود و اُداس
نور و نکہت سے گریزاں، مہ و انجم سے نفور
جس کی دیواروں کی سنگینی سے لرزاں ہے خیال!
کاش پڑ جائے کہیں ایک خراش ـــــ ایک شگاف
غم کے ہاتھوں ہی سہی
اور بھولے سے کبھی
کوئی آوارہ سی، چنچل سی کرن آ نکلے
ایک لمحہ کے لیے
میرے تاریک گھروندے میں اجالا ہو جائے!

ادا جعفری

غزل

گھر کا رستہ بھی ملا تھا شاید
راہ میں سنگِ وفا تھا شاید

اس قدر تیز ہوا کے جھونکے
شاخ پر پھول کھلا تھا شاید

جس کی باتوں کے فسانے لکھے
اس نے تو کچھ نہ کہا تھا شاید

لوگ بے مہر نہ ہوتے ہوں گے
وہم سا دل کو ہوا تھا شاید

تجھ کو بھولے تو دعا تک بھولے
اور وہی وقتِ دعا تھا شاید

خونِ دل میں تو ڈبویا تھا قلم
اور پھر کچھ نہ لکھا تھا شاید

دل کا جو رنگ ہے، یہ رنگ ادا
پہلے آنکھوں میں رچا تھا شاید

ادا جعفری

شفیق فاطمہ شعریٰ

شفیق فاطمہ شعریٰ ۱۷ مئی ۱۹۳۰ء ناگپور میں پیدا ہوئیں۔ تعلیمی قابلیت ایم،اے اردو کے علاوہ فارسی اور عربی زبانوں پر بھی دسترس حاصل ہے۔ان کی پہلی نظم 'فصیلِ اورنگ آباد' ۱۹۵۳ء میں 'شاہراہ' (دہلی) میں شایع ہوئی۔ ان کا کلام مختلف رسائل جن میں 'آئینہ'، 'صبا'، 'سوغات'، 'شاعر'، 'شعر و حکمت'، 'شب خون' وغیرہ شامل ہیں، چھپتا رہا۔ان کا پہلا مجموعۂ کلام 'آفاقِ نوا' ۱۹۸۸ء میں اور 'گلۂ صفورہ' ۱۹۹۰ء میں شایع ہوا۔ 'گلۂ صفورہ' گو کہ دیر سے شایع ہوا لیکن اس میں ان کے ابتدائی دور کے نظموں کا انتخاب ہے۔

شفیق فاطمہ شعریٰ کی شاعری اردو ادب میں ایک انوکھا اور بالکل نیا تجربہ ہے۔اردو شاعری میں اس طرح کے تجربے کا متبادل تجربہ ملنا ناممکن ہے۔ وہ رسمی مذاہب کے وضع کردہ رسوم و قیود سے بالاتر ہو کر انسان کے روحانی ارتقائی سفر اور تاریخ کی دھاراؤں کو اپنے ذہن و دل میں جذب کر کے انھیں اپنے مخصوص اسلوب اور اچھوتے اندازِ بیان میں اپنی نظموں کے وسیلے سے پیش کرتی ہیں۔ان کی شاعری ان کے صوفیانہ ذہن، فلسفیانہ دماغ اور ایک شاعرہ کے نازک احساسات کی آئینہ دار ہے۔

شفیق فاطمہ شعریٰ درس و تدریس سے وابستہ ہیں اور حیدر آباد میں مقیم ہیں۔

شفیق فاطمہ شعریٰ

افتاد گاہیں نجوم کی

گرتا ہے اندھیرا
دھواں اگلتی رفتاروں کے بعد
وہیں تاروں کے قریں
منظر بھی کرچ کرچ بکھرے
نظریں بھی کرچ کرچ بکھریں
یوں اپنے آنگن میں اتری
وہ ماہ مئی کی جھل
اپنی کھیتی میں اپجی
دہر کی من مانی

ہم ایسے بے روپ
کہ پھر جو روپ ملا اوڑھ لیا
شام امروز شب رفتہ

صبح فردا
پہناوا بنفشوں کا
اترن بن کر اترا ہے

پارہ پارہ مٹ میلا
کس چاؤ سے خود کو پہنایا
اک فصل کے بعد کی فصل
پرانا، کھاد کا ڈھیر
ہم کھپ گئے جس میں تھا یہ وہی جینا

دن الحمراء ایسے ترشے ترشائے محکم
سایوں میں پھیلے آہوں میں پگھلے
اب پچھلے قالب کی چاہت میں جان کھپانا
ہو جتنی تعمیم اتنا شرمانا کہا
پی لیتے ہیں تعمیم کو گہرے گہرے خلا
پھر ان کو پاٹ نہیں سکتا کوئی بھی کبھی
تعمیم کو جس چھلنی سے چھانو
موہومی چھنتی ہے سدا
بھٹکے بے چہرہ بے کف پا
جیسے سرگرداں معتزلہ
پُر جوش فطانت سایہ و سبزہ و آب سے عاری پگڈنڈی
کھائی میں مڑی اور ڈوب گئی
پھر جان نہ پایا کوئی اس پر کیا بیتی

لو سانس بھی آہستہ
یہ شیشہ گری کی کار گہہ نازک افتاد
ہو جائے نہ درہم برہم
ہم ڈرتے تھے
اپنے قدموں کی جنبش سے سہل انگار
اک ذرّہ بھی پامال جو ہو
تو نہ جانے کس کا لہوا بلے
گردش فانوس خیال کی تیز ذرا
معمول سے بڑھ کر ہوتی
اور بھگدڑ میلہ میں وہیں مچ جاتی تھی
سب رنگ دھنک کے گڈمڈ
ڈھنکے ہوئے اڑتے پھرتے
ایسے میں اکثر چھوٹ گیا
دامن اپنے ہاتھوں سے اپنے اپنے سراپا کا
تب ان کا تختہ الٹ دیا
اس دہر نے جو بن کر جام ایام
گردش کرتا آیا ہے انسانوں میں

سب تیتر ہریل شجر حجر ذرّے اجرام
سب جزو کُل ہیں مگن
اور اک ہم
ایک انیک کا گُمستارہ
اس گردونواح میں کون آئے گا دوبارہ

سب اڑتی اڑاتی اوپری باتیں
اپنی اینٹوں پر اینٹیں
گارے پر گارا رکھتی جائیں
سیمرغ تھکے ہارے
کرتے ہیں کوچ

قمقموں بھرا پھیلاؤ گھنا
اک شہر فصیل کے پار ملا
اک ٹھوس اکائی اپنی اٹوٹ
تانبے کے تاروں سے جڑی
یہ ایک مشین ہے وحدت پُرزوں کی
جب تک چاق و چوبند ہیں چلتے ہیں
ورنہ چھٹی
ہم سر بہ فلک تعمیروں کے معمار
پستے ہوئے بے میعاد انھیں کے بوجھ تلے

تب ایک
انھیں کمزوروں میں سے
جو برداشت کی حد سے آگے بڑھ کر
بوجھ اٹھاتے نہیں
اک چیخ بنا
جا ٹکرایا
اس ہاتھ سے جو ہتھے پر تھا

خود کار کسی جنبش کا وہ ہاتھ
مامور تھا تیزی سے، حرکت میں آ جانے کے لیے
ایسے قدموں کے خلاف
جو چلتے چاک کے ساتھ نہ چل پائیں
تب آناً فاناً وہی قدم لغزش کا شکار
زمیں سے اٹھ کھڑا
اور دامن پہیے کی لپیٹ میں آیا
چکرایا چکراتا رہا
چرخی چرخی خونِ ناحق کی نمی دَوڑی
اک لوتھ زمیں پہ گری اور سر دھوئی
پھر لوتھ پہ لوتھ گری
گرنا جاری ہے
دھرتی لعل کی کان
چھنتی ہے رُندھی رُندھی لالی، مدہوش جنونی ہنسی
اسی کہنہ بے درد سیاہ خلا کے شگافوں سے

گنتی کا یہ گیان نرالا ہے
جب اسرائیل کے بیٹے
اپنے تلخ نواؤں کو
مقتل کی جانب لے جاتے
جب کوئی جھٹلائے اپنی یکتاؤں کو
تب نیزوں کے نرغے میں گھری

بے سپر دلیر صداؤں کو
سنتے ٹیلے پربت
اور ان کی گونج کے ساتھ سفر
قرنوں کا
زمانہ طے کرتا
تب جا کے کہیں
پہچان کے جھرنے کی شورش
سنگستاں جاں کی تہہ میں
انسان بھی سن سکتے
بے گنتی آنکھوں میں
تب پیڑھی پیڑھی
برکھا رت کی بستی بس جاتی

چاہے دیر سویر ہو
اور کڑے کوسوں کی دھوپ
ہم نفسِ واحد
آخر کار
آہنگ اک موج کا
سب موجوں کی دھڑکن میں بس جاتا ہے
پھر اُن ہونی کی خمار آلود آنکھوں نے کیسے خواب بُنے
اک طالع روشن
آفاقِ اعلیٰ پر چمک اٹھا
کیا یہ بھی سفر مبداء ہوگا مطلع ہوگا

اُن آنے والے سویروں کا
جو زیرِ نمو ہیں ابھی
آواز قلم کے چلنے کی
دیتی ہے دہائی 'ادب! ادب!'

یہ راہِ سفر
ہو پائی نہیں طے
چال سے کی چلتے ہوئے
گزری یہ شعب ابی طالب سے
طائف کے
سنگ افشاں باغیچوں کی طرف

جب لہو لہان تھا وقت ایسے عالم میں بھی
آنکھوں میں بسا تھا وہی روشن چہرہ
جگمگار ہے جس کے پرتو سے ہیں غرب و شرق

کتنے دن بعد
ہبوط آدم سے
کتنے دن بعد
آئی تھی وہ رات
بے ریب بدیہی سچ کی نشانیاں
روشن جس میں

اک ذات سراپا چاہت آدم قد سرگرم سفر
منزل بھی اس کی ذات بے ہمتا
وہ تاب نظر معصوم نیاز آگئیں
ہنگام قرب
سرمستِ قیام، قدم انسانی لا فانی
جب سے اک فصل ادب کے ساتھ وہاں
تب سے ہی یہ در داتا کی
بے میعاد کھن
اک فصل شہادت کی میعاد بنی
اقصیٰ تا سدرہ شارع عام،
رواں روشن آباد بنی
تب سے ہر باز اشہب نے
پایا اپنے شہپر کا جواز

شفیق فاطمہ شعریٰ

ساجدہ زیدی

ساجدہ زیدی ۱۸ مئی ۱۹۲۷ء کو میرٹھ (اتر پردیش) میں پیدا ہوئیں۔ تعلیمی قابلیت ایم۔فل (لندن)، بی۔اے۔ایم۔ایڈ۔

ساجدہ زیدی نے اپنی شاعری کا آغاز ترقی پسند تحریک کے ڈھلتے ہوئے دور میں کیا تھا، تاہم اس ڈھلتے ہوئے دور میں بھی اردو کے ادبی منظر نامے پر ترقی پسند اقدار کا اچھا خاصا اثر تھا۔ اس تناظر میں ساجدہ زیدی کی شاعری میں غمِ حیات اور غمِ دوراں، دونوں رنگ نظر آتے ہیں۔ ان کے اندازِ بیان اور تشبیہات کے ایک جداگانہ استعمال نے ان کی شاعری میں جو رنگ بھر دیے ہیں، اس نے ان کی شاعری کو ایک منفرد صورت عطا کی ہے۔ یہ انفرادیت ان کی پہچان ہے۔

ان کے شعری مجموعے 'جوئے نغمہ'، 'آتشِ سیال'، 'سیلِ وجود' اور 'آتشِ زیرپا' شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے دو ناول 'موجِ ہوا پیچاں'، 'مٹی کے حرم' "چاروں موسم' (ڈرامے) 'سرحد کوئی نہیں' (شعری ڈرامہ) اور 'تلاشِ بصیرت' (تنقید) تصنیف کی ہیں۔ اردو زبان میں نفسیات کے موضوع پر ان کی دو تصانیف 'شخصیت کے نظریات' اور انسانی شخصیت کے اسرار و رموز' گراں قدر اضافہ ہیں۔ ساجدہ زیدی کو میر اکادمی، یو۔پی اردو اکادمی، بہار اردو اکادمی اور غالب انسٹی ٹیوٹ نے ان کی کئی تصنیفات پر انعامات سے نوازا ہے۔ ان کی شاعری کا ترجمہ انگریزی، روسی، ہندی، اُڑیا

اور مراٹھی زبانوں میں ہوا ہے۔

ساجدہ زیدی متعدد قومی تعلیمی اداروں کے ساتھ اعزازی طور پر وابستہ رہی ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ تعلیم سے بہ حیثیت پروفیسر ریٹائر ہو کر، تخلیق و تصنیف کے کاموں میں مصروف ہیں۔ وہ علی گڑھ میں مقیم ہیں۔

شبنم عشائی ضلع بارہمولہ کے ایک گاؤں میں مقیم ہیں۔

ساجدہ زیدی

یہ زماں یہ زماں

اک زمانے سے یہ جلتی ریگِ رواں
انگلیوں سے پھسلتی جا رہی ہے
جیسے-----
اس کو پکڑنے کی سعیِ مسلسل
شغلِ دیوانگی ہے

سات سُر
رنگ و نکہت
نواؤں کا جادو
صداؤں کی خوشبو
لفظ و معنی کے ناوَک
زمانے کا صد چاک سینہ
فکر کی رستخیز آگہی کا دفینہ،

آگ کے آبشاروں میں بہتے ہوئے
صبح و شام،
سرخ سورج کی جلتی شعاعیں
سفر بے قیام
فارغِ فکرِ فرداؤدی
ننگ و نام

ہم نے کیا کیا نہ اس جلتی ریتی کو
ہاتھوں میں بھرنے کے حیلے کیے
ریت میں گل کھلانے کے سرکش وسیلے کیے
رک کے دیکھا ـــــ تو جانا کہ
الفاظ خاموش ہیں
معنیِ بے بدل، آسمانوں زمینوں میں روپوش ہیں
نغمۂ جانفزا گنگ ہے
رقصِ جاں پا شکستہ ہے...... اندازِ جلوہ نمائی
دیواروں میں محبوس ہے
اور ہم......
بے خطر ـــــ جلتی آنکھوں کی جیوتی لٹاتے رہے
ہر قدم ـــــ عافیت کا اثاثہ گنواتے رہے

روح کا نور، آنکھوں کی جیوتی ـــــ مگر
گھور اندھیروں سے ٹکرا گئی

انگلیاں جم گئیں
جان پتھرا گئی
ہر حدیثِ دگر
ہر غمِ معتبر،
درد کی ہر گواہی ـــــ ہر اقرارِ جاں
حرفِ باطل ہوئے
اور
ریگِ رواں
انگلیوں سے پھسلتی رہی

بال و پر کی حکایت عبث...... دور ہر آسماں
یہ پراسرار منظر، یہ پھیلا دھواں......
یہ زماں ـــــ یہ زماں!

غزل

ہم نے اک عمر میں کیا کیا نہ جہاں دیکھے ہیں
آسماں دیکھے ہیں اور قعرِ نہاں دیکھے ہیں

جن کی باتوں میں تجلی تھی خموشی میں طِلسم
وہی اربابِ ہنر سوختہ جاں دیکھے ہیں

نغمہ و شعر و زباں اہلِ سیاست کے قتیل
پوری تہذیب کے مٹنے کے نشاں دیکھے ہیں

اقتدار و ہوس و شور و منافق نظری
جن کا شیوہ رہا وہ پیرِ مغاں دیکھے ہیں

جنسِ ارزاں کی طرح بکتے ہوئے اہلِ قلم
اشتہاروں میں سجے گل بدناں دیکھے ہیں

جن سے تاریخ کے صفحات بھی جاگ اُٹھتے تھے
وہ زمانے، وہ فسانے گزراں دیکھے ہیں

وہ حکایات رقم کیں کہ قلم خوں رویا
ہر رگ تاک پہ زخموں کے دہاں دیکھے ہیں

ایک اک حرف سے روشن ہوئے جاتے تھے افق
آئینے سحر دبستاں میں نہاں دیکھے ہیں

جن کی جادو اثری طعنۂ احباب بنی
وہ طلسمات لکھے، حرف و بیاں دیکھے ہیں

جن کی تعبیر میں اک عمر گنوادی ہم نے
راز وہ سینۂ گیتی میں نہاں دیکھے ہیں

جلتے بام و در و دیوار، سلگتے ہوئے شہر
جن سے پتھرا گئیں آنکھیں وہ سماں دیکھے ہیں

آسماں گیر تھے شعلے، خس و خاشاک تھے جسم
قیدِ بے جرم میں سب پیر و جواں دیکھے ہیں

دل نے ہر ذرّہ کے ہمراہ دھڑکنا سیکھا
تب نواؤں میں یہ معنی کے جہاں دیکھے ہیں

ساجدہ زیدی

زاہدہ زیدی

زاہدہ زیدہ ۴ جنوری ۱۹۳۰ء کو میرٹھ اتر پردیش میں پیدا ہوئیں۔ تعلیمی قابلیت ایم،اے انگریزی (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) اور ایم،اے (کیمبرج یونیورسٹی، لندن)۔

زاہدہ زیدی کے موضوعات، ان کے اندازِ بیان، تلمیحات و تشبیہات کے استعمال کے لحاظ سے ان کی شاعری میں فلسفیانہ اور کہیں کہیں پر عارفانہ رنگ جھلکتے ہیں۔ ان کی شاعری کے مجموعے 'زہر حیات'، 'دھرتی کا لمس'، 'سنگِ جاں' اور 'شعلۂ جاں' شایع ہوئے ہیں۔ انھوں نے ایک ناول 'انقلاب کا ایک دن' بھی تصنیف کیا ہے۔ انھوں نے تنقید، فلسفہ اور نفسیات پر بھی کئی کتابیں لکھی ہیں جن میں مسدود راہیں، پانچ جدید مغربی ڈرامے (ترجمہ اور تنقیدی جائزہ)، انسان اپنی تلاش میں' فلسفہ اور نفسیات (ترجمہ)، رموز فکر و فن (اردو ادب پر تنقیدی مضامین)، جدید مغربی ڈرامے کے اہم رجحانات (تنقیدی جائزہ) شامل ہیں۔

زاہدہ زیدی یورپی، امریکی اور روسی ادب سے بہت قریب سے وابستہ ہیں۔ ڈرامہ ان کا خصوصی میدان ہے۔ ڈرامے تخلیق کرنے سے لے کر انھیں اسٹیج کرانے تک وہ برابر شامل رہتی ہیں۔ ان کے ڈرامے 'دوسرا کمرہ، پانچ طبع زاد ڈرامے، صحرائے

اعظم، عالم تمام حلقہ دام خیال، کیونکر اس بت سے رکھوں جاں عزیز اور چیخوف کے شاہکار ڈرامے شایع ہوئے ہیں۔

زاہدہ زیدی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ انگریزی سے بحیثیت پروفیسر ریٹائر ہو کر تخلیقی کاموں میں مصروف ہیں۔ وہ علی گڑھ میں مقیم ہیں۔

زاھدہ زیدی

تخریب کے بعد

یہیں مِٹا تھا
وہ شہرِ رعنا
یہیں بجھے تھے
وہ سب جگمگاتے ہوئے دریچے
یہیں وہ نغمے
بکھر کے
خاموشیوں میں تحلیل ہو گئے تھے
یہیں وہ اصنامِ مرمریں
ریزہ ریزہ ہو کے
ریت کا ڈھیر ہو گئے تھے
یہیں وہ شفاف، سیدھے کشادہ رستے
سیاہ شعلوں کے ایک جنگل میں
کھو گئے تھے

یہیں گری تھیں
وہ سب عمارات جلوہ ساماں
یہیں ——
ٹوٹ کر سر نگوں ہوئے تھے
بلند و بالا کئی منارے
یہیں سلگتی رہی تھی مٹی
یہیں پہ جلتا رہا تھا لاوا
یہیں اُگے تھے مہیب شعلے

یہیں وہ سنگین جسم
لاوے سے
راکھ سے
اور تُند شعلوں سے
تشکیل ہو کے
ابھرا تھا رفتہ رفتہ
ہزار مشکل سے آسمانوں کی سمت
دستِ دعا اٹھائے
کھلی ہوئی، گہری، سنسان آنکھوں میں
زخمِ ہستی کی
اَن کہی داستاں چھپائے
ہزار صدیوں کے کرب کی کروٹیں
چھپی ہوئی

اس کے اعضا کے پیچ و خم میں

ـــــ پر سکون ساحل کی
نرم لہرو
اب اس بلند پیکر کا عکس
اپنے شفاف سینے میں
جذب کر لو
ـــــ سنہری کرنو
بس ایک بار اور چوم لو
اس جراحت نصیب
کرب آشنا بدن کو
کہ کوئی زلزلہ
پھر زمین کی تہہ میں
پروان چڑھ رہا ہے

زاہدہ زیدی

رفیعہ شبنم عابدی

رفیعہ شبنم عابدی (اصلی نام سیدہ رفیعہ بیگم) ۷ دسمبر ۱۹۴۴ء کو امروہہ، ضلع مراد آباد (اتر پردیش) میں پیدا ہوئیں۔ تعلیمی قابلیت پی، ایچ، ڈی۔ ڈی لٹ۔

رفیعہ شبنم عابدی پچھلی تقریباً تین دہائیوں سے اردو ادب کے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کر رہی ہیں۔ ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ 'موسم بھیگی آنکھوں کا' ۱۹۸۵ء میں شایع ہوا۔ اس مجموعے کے لیے انھیں مہاراشٹر، اتر پردیش اور بہار کی اردو اکادمیوں نے انعامات سے نوازا۔ ان کے دوسرے شعری مجموعے 'اگلی رُت کے آنے تک' (۱۹۹۴ء) کے لیے مہاراشٹر اور اتر پردیش کی اردو اکادمیوں کی طرف سے انھیں انعامات حاصل ہوئے ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے پیش نظر انھیں ۱۹۹۷ء میں میر اکادمی لکھنؤ کی طرف سے 'نوائے میر' ایوارڈ عطا کیا گیا۔

رفیعہ شبنم عابدی کا ادبی سفر جوش و خروش کے ساتھ جاری ہے۔ وہ آج کل ممبئی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی صدر اور کرشن چندر پروفیسر ہیں۔

رفیعہ شبنم عابدی

معمول

یہ سنتے ہیں
تمھارے دل کے خوش منظر جزیرے میں
نیا موسم پھر آیا ہے!

یہی ہو گا
کہ پھر ہر شام
تھوڑی بارشیں ہوں گی
ہواؤں میں لطافت
بادلوں میں دل کشی
تازہ شگوفوں میں نمی ہو گی
نیا سبزہ، نئی بالیدگی ہو گی
عجب اک بے خودی ہو گی

پھر اس کے بعد
پو پھٹنے سے پہلے
نئے موسم کے بنجارہ پرندے
کسی اَن چھوئے، ان دیکھے جزیرے کی
کی طرف پرواز کرلیں گے
ہمیشہ کی طرح تم پھر
شکستہ دل
شکستہ جاں
پلٹ آؤ گے گھبرا کر
اسی ویران، بوسیدہ حویلی میں
جو صدیوں سے
تمھارے اس تھکے ہارے بدن کو
اپنی بانہوں میں سمیٹے
جی رہی ہے
تمھاری بے وفائی
جُرعہ جُرعہ پی رہی ہے!

غزل

عمر بھر ذہن کے گمنام جزیروں میں رہی
بے گناہوں کی طرح میں بھی اسیروں میں رہی
میرے قدموں تلے جنت ہوئی تعمیر مگر
میری قسمت ترے ہاتھوں کی لکیروں میں رہی
اگلے وقتوں نے مجھے اس لیے معتوب کیا
کیوں کہ میں بھی نئی دنیا کے سفیروں میں رہی
میرے کردار کو کیا قتل کرے گی دنیا
میں جہاں بھی رہی، بیدار ضمیروں میں رہی
وہ صداقت ہوں جو دریاؤں پہ تحریر ہوئی
نوکِ نیزہ پہ بھی، ظلم کے تیروں میں رہی
کربلا! تجھ سے مرا خون کا رشتہ تو نہیں؟
کیوں یہ اک پیاس سی دونوں کے خمیروں میں رہی
میری تخئیل کو تشہیر کے تاجر نہ ملے
وہ کہاں فن کے خریدار امیروں میں رہی
مابدولت کا تعلق ہی وفا سے کیا ہے
یہ وہ دولت ہے جو ہم جیسے فقیروں میں رہی
سرفروشی مجھے ورثے میں ملی ہے شبنم
وہ بہن ہوں کہ جو بچپن ہی سے ویروں میں رہی

رفیعہ شبنم عابدی

بلقیس ظفیرالحسن

بلقیس ظفیر الحسن (اصلی نام بلقیس پروین) یکم ستمبر ۱۹۳۸ء کو موتی ہاری (بہار) میں پیدا ہوئیں، انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے 'بلقیس رحمانی' کے نام سے کیا۔ اس کے بعد انھوں نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا۔

ان کا ایک شعری مجموعہ 'گیلا ایندھن' شایع ہو چکا ہے۔ ان کی شاعری کا ابہام ذہن کو متاثر کرتا ہے۔ ان کی غزلیں اور نظمیں اردو کے اہم رسائل میں برابر شایع ہو رہی ہیں۔ ان کی نظموں کے ترجمے انگریزی اور ہندی میں بھی شایع ہوئے ہیں۔

وہ آج کل دہلی میں مقیم ہیں۔

بلقیس ظفیر الحسن

"یَسِّر لی اَمری"

سحر پرداختہ کارخانوں کا اک جال پھیلا ہوا
صف بہ صف سامری
رسیاں، اژدہے بن گئیں
کفچہ ہائے دہن نیلگوں ـــــ لپلپاتے ہوئے
زہر شعلے اگلتے ہوئے لہریئے!
تیز پا اسپ اپنے سُموں میں ـــــ لپیٹے ہوئے بجلیاں
گرم نتھنوں کی پگھلی ہوئی سانسوں کی آندھیاں
کب سے میرا تعاقب ہے جاری ـــــ کہاں جاؤں میں!
مجھ کو معلوم ہے
وادیِ طور سے کوئی شعلہ صدا
مجھ کو آواز دے میری قسمت نہیں
میری سونی ہتھیلی پہ وہ داغ جس سے
ضیا پھوٹ کر تیرگی چیر ڈالے

اجا گر نہ ہو گا کبھی

معجزوں والا کوئی عصا، مجھ کو بخشا نہیں جائے گا
اور یہ سُم بہ سُم بجلیاں۔ صف بہ صف سامری
زہر شعلے اگلتے ہوئے لہریے
راستہ دے نہ دے نیل، لیکن بتادے مجھے
میں کہ موسیٰ نہیں پھر بھی فرماں روائی فرعون
تسلیم کیسے کروں ـــــ کیا کروں

بلقیس ظفیر الحسن

رخسانہ جبیں

رخسانہ جبیں یکم مئی ۱۹۵۵ء کو سری نگر کشمیر میں پیدا ہوئیں۔ تعلیمی قابلیت ایم،اے،ایم فل۔

رخسانہ جبیں پچھلی دو دہائیوں سے زائد عرصے سے اردو ادب کو اپنی شاعری سے مالا مال کر رہی ہیں۔ ان کا لب و لہجہ سنجیدہ اور آہنگ جدا ہے۔ ان کے شعروں میں جدّت ہے۔ ان کی شاعری اردو زبان کے اہم رسائل و جرائد میں برابر شایع ہو رہی ہے۔ ان کی شاعری کے ایک باقاعدہ مجموعے کی کمی شدّت سے محسوس کی جا رہی ہے۔

وہ ریڈیو کشمیر سری نگر سے وابستہ ہیں۔

غزل

ایک معمّہ ہے وہ، ویسے کتنا بھولا بھالا ہے
ایک اک رنگ انوکھا اس کا ہر انداز نرالا ہے
شکوہ ہے، میں چپ ہوں، لیکن اتنا ہے معلوم مجھے
میرے پھول سے لفظوں سے وہ کانٹے چننے والا ہے
استفہام کے جنگل میں کب کون، کہاں، کیوں، کیسا، کیا
سوچ میں خود کو گم پایا ہے، جب سے ہوش سنبھالا ہے
دنیا میں دیکھا ہے ہر سو جھوٹ، کپٹ، چھل، مکر و فریب
اور یہ سننے میں آیا ہے جھوٹے کا منہ کالا ہے
کوئی سمجھادے ساحل پر ماتم کرنے والوں کو
اپنی مرضی سے کشتی کو اس گرداب میں ڈالا ہے
اپنے اپنے طور پہ اہلِ فکر نے اس کو سوچا ہے
میں بس اتنا کہتی ہوں یہ موت کا ایک نوالا ہے

رخسانہ جبیں

غزل

آنکھوں میں مری ابر رواں اور طرح کے
دل میں بھی کئی دشتِ تپاں اور طرح کے

ہیں پاس ترے تیر و کماں اور طرح کے
لفظوں کے سپر میرے یہاں اور طرح کے

احباب سناتے ہیں کوئی اور کہانی
ہیں میرے حریفوں کے بیاں اور طرح کے

اجداد وراثت میں گھٹن چھوڑ گئے ہیں
تعمیر کریں اب کے مکاں اور طرح کے

یہ بات بہاروں پہ ہی موقوف نہیں ہے
موسم ہیں مرے ساتھ جواں اور طرح کے

تم اپنے کو کہتے ہو جدا سب سے، الگ سا
آثار نمایاں ہیں کہاں اور طرح کے

اب شعلۂ خس کی بھی کوئی تاب نہیں ہے
اللہ مرے باندھ سماں اور طرح کے

اندیشے مجھے گھیر نہ لیں، کیسے بھلا ہو
گزرے ہیں انھیں بھی تو گماں اور طرح کے

رخسانہ جبیں

شہناز نبی

شہناز نبی ۲۰ مارچ ۱۹۵۸ء کو کولکتہ میں پیدا ہوئیں۔ تعلیمی قابلیت پی، ایچ، ڈی۔

شہناز نبی نئی نسل کی شاعرات کی اولین صف میں شامل ہیں۔ ان کی شاعری کے نسوانی لہجے کو برملا دیکھا تو نہیں جا سکتا البتہ محسوس ضرور کیا جا سکتا ہے۔ ان کے موضوعات نئے اور وسیع ہیں۔ ان کی شاعری ذہن و دل پر ایک خوشگوار تاثر چھوڑ جاتی ہے۔

ان کا پہلا مجموعۂ کلام 'اگلے پڑاؤ سے پہلے' ۲۰۰۱ء میں شایع ہوا۔ وہ آج کل کولکتہ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو میں ریڈر ہیں۔

شہناز نبی

شعرِ شورانگیز

بیاضِ دل میں تجھ کو نقش کرنے سے ذرا پہلے
نہ سوچا تھا کہ تو کس بحر میں ہے
کیا زمیں تیری
عروضی موشگافی کی ضرورت ہی نہیں سمجھی
نہ یہ دیکھا ہے کہ آہنگ کتنا
اور بیاں کیسا
توارُد ہے نہ سرقہ ہے
تو جیسا ہے
تو جس کا ہے
اتارا ہو بہو میں نے
اگر کچھ جرم ہے میرا تو بس اتنا
کہ تجھ میں اپنے معنی رکھ کے پڑھتی رہتی ہوں اکثر
اے میرے شش جہت

اے شعر شورانگیز
ممکن ہو
تو میرے ذوق شعری پر
کچھ تو ناز کر لینا!

شهناز نبی

معصوم بھیڑیں

اک چراگاہ
سو چراگا ہیں
کون ان ریوڑوں سے گھبرائے
پڑ گئیں کم زمینیں اپنی تو
کچھ سفر کچھ حضر کا شغل رہے
کچھ نئی بستیوں سے ربط بڑھے
ان کو آزاد کون کرتا ہے
یہ بہت مطمئن ہیں تھوڑے میں
اک ذرا سا گھما پھرا لاؤ
کچھ اِدھر کچھ اُدھر چرا لاؤ
بھیڑیں معصوم
بے ضرر سی ہیں
جس طرف ہانک دو، چلی جائیں

عذرا پروین

عذرا پروین ۶ جنوری ۱۹۶۱ء کو اناؤ (اتر پردیش) میں پیدا ہوئیں۔ تعلیمی قابلیت ایم۔اے (اردو)۔

عذرا پروین پچھلی تقریباً دو دہائیوں سے غزلیں اور نظمیں تخلیق کر رہی ہیں۔ وہ زبان اور موضوعات کے لحاظ سے نئے تجربے کرتی ہیں۔ عذرا پروین کی شاعری بلاشبہ اردو شاعری میں تانیثیت کی ایک بے باک اور نئی آواز ہے۔

وہ آج کل لکھنؤ میں مقیم ہیں۔

عذرا پروین

خسارہ

تم تو صرف ...... اور صرف کُتے ہی نکلے
میں تو اس میں مرد ڈھونڈتی تھی
میں اس مرد میں باپ بھی چاہتی تھی
میں تو اب باپ میں ایک بچہ بھی ......
میں تو اس بچے میں خدا بھی ......
مگر تم ...... تو صرف کُتے نکلے
اور میں ماں نکلی
اب کئی دن سے
کوشش میں لگی ہوں کہ ماں سے
کُتا پکڑنے والی گاڑی میں بدل جاؤں مگر
خسارہ ہے
ماں کا کُتا پکڑنے والی میں بدل جانا
خسارہ ہے

محبت کا زنا میں بدل جانا
خسارہ ہے پھر زنا کا پاور گیم، ایگو گیم میں بدل جانا
بدلنے کے لیے process کی چکّی چل رہی ہے تیز اور تیز...... اور تیز
بدل رہا ہے پل پل، چھن چھن ..... بدل رہے ہیں ہم، بدل رہے ہو تم
کون کب کیا بن جائے کچھ نہیں کہا جا سکتا
کب تم چوپایا میں بلّی
یا تم بھیڑیا میں خرگوش
کہہ نہیں سکتی، کچھ بھی اک عورت
اک عورت......اک عورت میں اس کا جسم
اتنا بھی اہم نہیں ہوتا کہ اس کے جسم کو اسی کی قبر بنا دیا جائے
مجھے اس قبر سے نکلنے دو!
جلتی ہوں تو جلنے دو!

عذرا پروین

شرعی سرکس

کل تک
ضرور مجھے یقین تھا کہ
بہر حال قاضی کی مدد سے
ایک شرعی
اور انتہائی محفوظ ترین لو اسٹوری
شروع کی جا سکتی ہے
اور میرے اس یقین نے آخر مجھے
میری زندگی کے سب سے بڑے ایڈونچر سے دوچار کر دیا
اور آج
اک خطرناک رسّی پر نٹنی کی طرح چلتے چلتے
میں گا رہی ہوں
یارب! یہ شرعی عشق تو سچ مچ
اک سرکس کی طرح ہے

جس میں دو جسم چاہے اُن چاہے
نام نہاد "وفا" کی رسّی پر
سرکسانہ مشاقی سے چلتے آرہے ہیں
صدیوں سے
اور اب خوابوں میں بھی ہنسنے کے سب رستے
اک قاضی بند کر کے چلا گیا ہے!

عذرا پروین

شبنم عشائی

شبنم عشائی ۱۲ اپریل ۱۹۶۲ء کو کشمیر میں پیدا ہوئیں۔ تعلیمی قابلیت ایم،اے،پی،ایچ،ڈی ہے۔

ان کے دو شعری مجموعے 'اکیلی' اور 'میں سوچتی ہوں' شایع ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری ان کے روشن مستقبل کی نشاندہی کرتی ہے۔

وہ بڑی لگن سے اپنا شعری سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔

شبنم عشائی ضلع بارہمولہ (کشمیر) کے ایک گاؤں تاپر میں مقیم ہیں۔

شبنم عشائی

نظمیں

تمھیں یہ رنج ہے کہ
مہکتی جھومتی رُت میں
میری آنکھیں
ناچ کیوں نہیں اٹھتیں
تمھیں یہ رنج ہے کہ
فضا میں تیرتی خنکی
میری خواہشات کو
گدگداتی کیوں نہیں
موسم کی عنایت کا
مجھے احساس ہے لیکن
یہ بھی کیا بات ہوئی
جس سے تم

وابستہ ہو، اس سے واقف نہیں
تمھارے ہوتے ہی میں
غموں کے ہاتھوں نیلام ہوئی تھی
اور ناامیدی کے لشکروں نے
اپنی پونجی جوڑ کے
مجھے تم سے خرید لیا تھا!

ہرے پیڑوں کی بانہیں
رفتہ رفتہ
بے لباس ہو رہی تھیں
تُند ہوائیں
زمین پہ پھیلے پتوں سے
لپٹ کر
خاموش ہو گئیں
اور
دھوپ کا ایک عریاں ٹکڑا
اداسی میں لت پت
میری کھڑکی سے ٹپکا
تو سنسان کمرے میں
اک تازہ

کونپل کھلی

یوں کچھ ہو جانا
کتنا مختصر ہوتا ہے
اور ہو جانے کا بھلا دینا
کتنا طویل!

ترنّم ریاض

یا سمیعُ الدّعا

(۱)

خالقِ دو جہاں
میں ہوں واحد، وہ تخلیق تیری
جہاں کے بہشت بریں پر
جو مخلوق اشرف کے پھلنے کا موجب بنی

یا علیم السمیع!
جس کی پسلی سے کی تھی مری ساخت
اُس کی رفاقت کی خاطر
کہ تنہا نہ ہو
زیست کی راہِ نو پر کہ میں نے بھی تو
دیکھ بن کر زمیں
بخش ڈالا اسے آسمانوں کا رتبہ

اور اپنی مطیع قوت صبر پر

یا عظیم القوی
اس کے ہی زورِ بازو کو ترجیح دی
کر کے ہر نرم جذبے میں اپنے اسے حصہ دار
اس کی چاہت کو اپنے پہ حاوی کیا

یا حفیظ الغنی
اس کو اپنا محافظ سمجھنے لگی
رنگ اس کے رنگی
زندگی اس کی جی
قادر المقتدر، مالکِ بحر و بر
آج تک اس کا گھر
گھر اسی کا رہا
درد میں نے سہے
نام اس کا ہوا

(۲)
یا نصیر الولی!
بن کے دختر کبھی
گود میں کھیل کر
شفقتِ پدرانہ کی تشنگی کی

اس کی خدمت، اطاعت
صبح و شام کر کے
سنبھالا سنوارا جو گھر میں نے تھا
وہ میرا گھر بھی، میرا نہیں اور میں
دوسروں کی امانت پکاری گئی

یا متین البدیع!
خواہرانہ محبت سے مغلوب ہو کر
میں اس پر ہر اک شے لٹاتی گئی
گر تھا چھوٹا تو ماں کی طرح خواہشیں
اس پہ قربان کر کے مناتی خوشی
پھر بھی دل میں جگہ مجھ کو اس نے نہ دی

یا مُمیت المُحیی!
جنم جس کو دیا اتنے ارمان سے
خود کو ٹکڑے کیا، بوجھ کر جان کے
مجھ کو ان رت جگوں کا ملے کچھ صلہ
ٹوٹ جائے نہ الفت کا یہ سلسلہ
ہے یہی ایک جذبہ کسی طرح قائم
اسی ایک رشتے پہ ہے کچھ یقیں

یا توّاب الولی!

تیرا تبدیل ہو تا ہوا یہ جہاں
یوں نہ ہو جائے اس کو بدل دے کہیں
خوں نہ ہو جائے جذبات کا دیکھنا
آس تیرے کرم کی میں کھودوں ؟ نہیں

یا سمیع الدعا یا رب العالمین

ترنم ریاض

بیسویں صدی کے اوائل سے ہی
خواتین افسانہ نگار اور شاعرات اردو زبان کے ادبی
افق پر جلوہ افروز ہوئیں اور صدی کے وسط تک
انھوں نے اپنی متاثر کن تخلیقات سے اردو ادب میں
نسائی شناخت مستحکم کر لی۔

یہ انتخاب تانیثیت کے اس سفر کی
کامیابیوں کو اجاگر کرنے کی ایک کاوش ہے۔

**"Biswin Sadi mein
Khawateen ka Urdu Adab"** (Urdu)
ISBN 81-260-1620-5
Rs. 250.00